ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر کشمیر

شمارہ ۵، ۶ تا ۹	جموں - کشمیر - لداخ قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں	جلد ۴۲

نگراں:

رمیش مہتہ

مدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکرٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ: سرینگر کمپیوٹرس، مہاراج بازار۔ سرینگر

مطبع: میکاف پرنٹرس۔ دہلی

تصاویر: غلام محی الدین وانی۔ پرویز اختر

قیمت:۔ ۴۰/روپے (پیپر کوَر)
۵۰/روپے (مجلّد)

سرِورق: این۔ ایس۔ بیندرے
(اکادمی آرکائیوز سے)
بیک ٹائٹل:۔ اونتی پور کے کھنڈرات
کمپیوٹر ڈیزائننگ: جاوید اقبال

★......خط و کتابت کا پتہ:
محمد اشرف ٹاک
ایڈیٹر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر/جموں



• ''...... کشمیر ''بدسپس'' (وِتستا) اور سندابل (چندر بھاگا) کے ماخذوں کے درمیان میں واقع ہے......''

☆......بطلیموس (۱۵۰ ق.م)

• ''...... یہاں (کشمیر میں) سَو سے اُوپر بودھ اُستھاپن ہیں اور پانچ ہزار بودھ عابد، چار اَشوک ستوپوں (جو مہاراجہ اَشوک نے بنوائے) میں مہاتما بدُھ کے جسم کے آثار ہیں۔

☆......ہیون سانگ (۶۳۱ء)

• ''...... یہ قدرتی طور چاروں طرف سے فلک بوس پہاڑوں کی گود میں ہے جِن کے درمیان میں سے صرف تین پہاڑی راستے ہیں۔ یہاں تین سو بودھ وہار ہیں......''

☆......اُوکانگ (۸۵۹ء)

• ''...... کشمیر کا شہر (ادشتان) چار فرسخ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اَندر مکانات جہلم کے دونوں کناروں پر اِسطرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کئی پلوں اور آر پار لے جانے والی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے پوری طرح جُڑے ہوئے ہیں۔ وہاں دَریائے سِندھ، ایسے یخ بستہ اور ناقابلِ گذر خطوں سے قوت حاصل کرتا ہے جہاں بُرف گھل کر کبھی ختم نہیں ہوتی......''

☆......البیرونی (۱۰۳۳ء)

• ''...... کیشمُر (کشمیر) ایک صوبہ ہے جہاں لوگ بُت پرست ہیں اور اُن کی اپنی ایک مخصوص زبان ہے۔ جادوگری سے وہ موسم کو بدل سکتے ہیں اور گہرا اَندھیرا پیدا کرسکتے ہیں۔ اپنے جادو اور قابلیت سے وہ ایسے چمتکار دکھاتے ہیں جن پر تب تک یقین نہیں آتا جب تک نہ ایک آدمی بچشمِ خود دیکھ لے......''

☆......مارکوپولو (۱۲۸۴ء)

• ''...... خوبصورت جگہ ہے۔ پھولوں کے انواع اور آب و ہوا میں چند ہی جگہیں اِس کا جواب ہیں۔ پہاڑوں پر بے شمار پھولوں اور آبشاروں کے نغمے حیرت میں ڈالتے گئے اور راستے کی تکلیف بھلاتے گئے لیکن جب میدانوں میں آئے تو

ایک نئی دنیا سامنے تھی۔ نئی جنت نے چہرے سے نقاب اُٹھائی......"

☆......آئینِ اکبری (۱۵۹۸ء)

• "......کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے جو شاہی محل کا ایک آہنی قلعہ اور دَرویشوں کے لئے پھولوں سے لدا ہوا دِلفریب ورثہ ہے۔ اِس کے خوبصورت مرغزار دِلکش چشمے، بے شمار فوارے تعریف سے بالاتر ہیں۔ یہاں بے شمار بہتے ہوئے دریا اور آبشار ہیں۔ جہاں پر نظر جاتی ہے سبزہ زار اور پھول ہیں، سُرخ گلاب، بنفشہ اور نَرگس اَز خود اُگتے ہیں۔ میدان میں طرح طرح کے پھول اور خُوشبودار گھاس ہے۔ رُوح پَرور موسمِ بہار میں پہاڑ اور میدان پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور دَروازے، دیواریں اور صحن لالہ زار ہو جاتے ہیں۔

ان وسیع مرغزاروں اور خوشبودار پھولوں کا ہم کیا بیان کریں......"

☆......توزکِ جہانگیری (۱۶۲۵ء)

• "......میں کاشمر (کشمیر) سے مسحور ہو چکا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت حُسن و جمال کی اُن تمام جلوہ سامانیوں سے بہت بُلند اور بالاتر ہے جس کا میں نے تصوّر بھی کیا ہو......"

☆......فرانسس برنیئر (۱۶۶۵ء)

• "......میں نے پیر پنچال کے دشوار گذار درّے کو پار کرتے ہوئے ۴۵ مزدوروں کی لاشیں خود دیکھی ہیں جن کا کوئی پرسان نہیں تھا۔ اِن وارداتوں کے پیچھے دو اہم وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ کھانے کو بہت کم ملتا تھا۔ دوم یہ کہ تن ڈھانپنے اور ٹھٹھرتی سردیوں سے بچنے کے لئے اُن کے پاس کچھ پہناوا نہیں ہوتا تھا۔ روزگار کیلئے جبری ہجرت کی اجازت تب ہی دی جاتی تھی جب اس جان لیوا سفر پر جانے والا کشمیری مزدور اربابِ اقتدار سے یہ سند ساتھ رکھتا کہ اس نے سبھی جبری ٹیکس اَدا کئے ہیں......"

☆......ولیم مورکرافٹ (۱۸۱۷ء)

• "......کیا میں خدا کا کافی شکر گزار ہوں جس کے فضل سے میں اس جگہ آ پہنچا ہوں؟ کتنا اچھا موقعہ ملا ہے مجھے شکر گزاری اور سنجیدہ غور و فکر کا۔ لو میں یہاں

ہوں اُس خطۂ ارض پر جو رُوئے زمین کا حسین ترین مقام مانا جاتا ہے بلکہ اکثر لوگ اِسے جنّتِ ارضی سمجھتے ہیں......"

☆......بیرن ہیوگل (۱۸۳۵ء)

• "......شنکر آچاریہ کی بلندی سے میں کشمیر کے مناظر دیکھتا ہوں۔ ایک ایسا سماں سامنے نظر آتا ہے جو نہایت عمدہ ہے اور میں نے کبھی اپنے وطن میں نہیں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دُنیا کا خوبصورت ترین سماں ہے۔ یہ نظارہ ساری وادی پر پھیلا ہوا ہے جو چہار اَطراف برفانی سِلسلہ ہائے کوہ سے گھِرا ہوا ہے......"

☆......سر رچرڈ ٹمپل (۱۸۵۹ء)

• "......پرانی راجدھانی پُرانہ ادھشٹان (پاندریٹھن) کے قریب ایک مشہور ستوپا تھا جس میں ۶۳۱ء میں مہاتما بدھ کا ایک مقدس دانت تبرک کے طور پر موجود تھا......"

☆......سر الیگزینڈر کننگھم

• "......پہناوے کی طرح کشمیریوں کی زبان بھی عجیب ہے۔ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں سے بالکل مختلف اس زبان کے تلفّظ میں الھڑ پن ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی زبان میں کوئی اَدبی کام ہوا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کچھ مسوّدات ایک خاص درخت کی چھال پر لکھے گئے ہیں جن کو قدیم آثار کے طور پر بہت اہمیت حاصل ہے......"

☆......ولیم ویکفیلڈ (۱۸۷۵ء)

• "......گلمرگ وادی میں کبھی بھی دو دِن کے منظر ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر روز ایک نیا ماحول، ایک نئی خوبصورتی اور وسعت آنکھوں کو دعوت دیتی ہے۔ اگرچہ جنگل میں یہاں کئی راستے بنے ہوئے ہیں لیکن نظر جا کر دامنِ کوہ تک پہنچ ہی جاتی ہے اور پہاڑوں کے دامن، دریا، جنگل کے چھوٹے خطوں دیہات کے جُھنڈوں، جن میں توت، اَخروٹ اور ناشپاتی کے پیڑوں کے ساتھ مکئی اور دھان کے کھیت اُبھرتے ہیں اور دُور بارہمولہ سے وُلر جھیل کے نیلے پانیوں سے بھرے ماحول کو ناگا پربت کی اُونچائیوں تک لے جاتی ہیں۔ اس میں دریائے جہلم کا رو پیلا پانی ولر میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ ایک وسیع نیلا سمندر آسمان کی نیلاہٹوں سے مل کر مجھے اپنی

گرفت میں لے لیتا ہے......"

☆...... ینگ ہسبنڈ (۱۸۸۲ء)

• "...... میں وادیٔ کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں۔ میرا مقصد قدیم مقامات (Sites) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا ہے۔ یہ سیاحت میرے لئے اِنتہائی دِلچسپی کا باعث ہے۔ اس موقعہ پر قدیم آثار کی چھان بین کرنا بھی ایک لازمی اَمر تھا۔ مجھے امید ہے کہ میری محنت کشمیر کے تیئں میری محبت کی آبیاری کرے گی......"

☆...... سر مارک اَرل سٹائن (۱۸۸۶ء)

• "...... کشمیر کی ایک خاص اور امتیازی قومیت ہے۔ کشمیریوں کا کردار، اُن کی زبان، اُن کا لباس، اُن کے رسوم و رواج بہت ہی منفرد اور دلچسپ ہیں۔ اس کی تاریخ ممتاز ہے اور اس کا انتظامیہ بھی انوکھا......"

☆...... والٹر لارنس (۱۸۸۹ء)

• "...... اس عجیب و غریب ملک سے متعلق تاثرات بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِنسانی تصوّرات اور خیالات سے ماوراء ایک دُنیا میں آیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دیکھوں آیا جاگا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں......"

☆...... ٹینڈل بسکو (۱۸۹۰ء)

• "...... ہم ایک ایسے ملک (لداخ) میں پہنچے ہیں جو کسی اور سیارے کا حصہ لگتا ہے۔ جس دُنیا کو ہم جانتے ہیں اس سے یہ بالکل مختلف ہے......"

☆...... ایولے اورے (۱۹۲۶ء)

• "...... لداخ کی یہ بستیاں کسی اور ملک کی لگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قینچی سے تراش کر ایک ریگستان میں چپکا دیا گیا ہے......"

☆...... رابرٹ شا



فہرست



حرفِ آغاز

کاروانِ زندگی رَواں دَواں ہے اور دُنیا اپنی کھال میں مَست۔ اِس بار ہم نے ایک ایسے موضوع کو لے کر شیرازہ کا یہ خصوصی شمارہ ترتیب دیا ہے جس کا تعلّق ہمارے ماضی کے اُن نہاں خانوں سے ہے جس میں ہمارے تمدّن اور ثقافت کے کتنے ہی خزینے موجود ہیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تہذیب ایک احساس ہے...... ایک طرزِ فکر ہے...... یہ محسوس کرنے کا سُکھ اور کھو جانے کا غم ہے...... تہذیب، تواریخ کے مستقل عمل کی بُنیاد ہے...... تہذیب کا بیج تواریخ کی سطح پر پھلتا پھُولتا ہے جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ کشمیر اپنی تہذیب، تاریخ اور ثقافت کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ برِصغیر میں کشمیر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کم و بیش اڑھائی ہزار سال کی تحریری تواریخی روایت موجود ہے۔ یہاں تب تواریخیں لکھی جاتی تھیں جب کہ دُنیا کی بہت سی مہذب قوموں میں اِس کا تصوّر بھی نہ تھا۔ یہ روایات اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ پنپتی گئیں لیکن یہ بھی مُسلّمہ حقیقت ہے کہ ابھی تک کشمیر کی ایک ایسی جامع تاریخ کا لکھا جانا باقی ہے جس میں تمام تر ماخذوں

تک رَسائی حاصل کر کے ہمارے تہذیبی سفر کی نشاندہی کی جاسکے۔ دورِ جدید میں تواریخ سے متعلق نظریات میں انقلاب آیا ہے۔ اَب تواریخ محض پادشاہوں کی داستاں جان کر اس کی تشریح نہیں ہوتی بلکہ تواریخ کو تہذیبی رفتار کا آئینہ خانہ بنا کر پہچانا جاتا ہے...... محققین اس بات پر متفق ہیں کہ جامع تواریخ سے مُراد ایسی تواریخ ہے جو اِنسانی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہو۔ وہ صرف شہنشاہوں کے حالات، حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال، جنگ و جدال اور خانہ جنگیوں کی داستاں اور مشاہیر کے کارناموں تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ہمیں عوامی زندگی کی صورتِ حال سے بھی آشنا کرے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہو کہ کسی مخصوص دَور میں عوام کے رہن سہن کا کیا معیار تھا، عام اقتصادی اور معاشی حالت کیسی تھی۔ رسم ورواج اور تفریحی مشاغل کیا تھے۔ علوم وفنون اور صنعت وحرفت کی کیا حالت تھی۔ اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیا جدو جہد کی گئی اور اہم سماجی مسائل سے متعلق افکار وخیالات کیا تھے۔ ظاہر ہے کہ ماضی کا یہ علم، قدیم حالات اور واقعات سے اور کبھی انسان کی دُور اَندیشی سے محفوظ رہ سکا اور زمانے کی دَست بُرد سے بچ گیا...... ہماری تواریخ کے سفر کے سرخیلِ کارواں کلہن، جونراج، شری ور، سیّد علی ماگرے، محمد اعظم دیدمری، حسن کھویہامی وغیرہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن بات یہیں پہ آ کے ختم نہیں ہو جاتی کیوں کہ اکثر تواریخیں ایک خاص نکتۂ نظر کو اُپنے اُندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ آج جب ہم تحقیق کے جدید تقاضوں کے تناظر میں اِن کو پرکھتے ہیں تو کئی خلأ نظر آتے ہیں کیوں کہ فاضل تواریخ نویسوں نے مختلف ماخذوں سے بھرپور اِستفادہ نہیں کیا ہے یا شاید وہ ان کی دسترس سے باہر رہے ہوں گے

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

کشمیر کے تہذیبی سفر کے اہم پڑاؤ وہ سفرنامے ہیں جو کشمیر آنے والے سیلانیوں نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ کشمیر ہزاروں سال سے بیرونی سیلانیوں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ صدیوں پر محیط کشمیر کے قدیم سیاسی، عمرانی، انتظامی، معاشی، مذہبی اور تمدنی حالات بکثرت مختلف ماخذوں میں ملتے ہیں۔ یونانی، چینی، فرانسیسی، عربی، انگریزی اور دیگر بڑی زبانوں کے قدیم تذکروں، تواریخوں اور اَدب میں کشمیر کا ذکر موجود ہے۔ قدیم یونان کی تواریخ کے ماخذوں میں جگہ جگہ کشمیر اور اس کے ملحق علاقوں کی تعریف و توضیح ہے۔ علمِ تواریخ کے باوا آدم ہیروڈاٹس نے بھی کئی حیثیتوں میں کشمیر کا ذکر کیا ہے اور سر والٹر لارنس کے مطابق اس بات کے نشان ملتے ہیں کہ سکندرِ اعظم اور اُس کے ہمراہ تاریخ نویسوں کو کشمیر کے سیاسی اور تمدنی وجود کا گہرا اِدراک و احساس تھا۔ بودھ ماخذ صاف حوالہ دیتے ہیں کہ مہاتما بُدھ کشمیر بھی آئے تھے۔ کشمیر ہزاروں سال سے وسطِ ایشیا اور برِصغیر کے درمیان ایک اہم پڑاو کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی پشت پناہی وہ سفرنامے اور یادداشتیں کرتی ہیں جو مختلف سیلانیوں نے مختلف اَدوار میں تحریر کیے۔ ان کے اِجمالی جائزے سے یہ اَمر پایۂ ثبوت تک پہنچتا ہے کہ عام سوچ کے برعکس اَپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کے باوجود کشمیر کبھی بھی بیرونی دُنیا سے کٹ کر یا الگ نہیں رہا۔ منفرد تہذیبی، فلسفی اور علمی مزاج کی وجہ سے ہر دَور میں جانکاروں کو کشمیر سے دلچسپی رہی۔ کشمیر بات کے حوالے سے آنجہانی موتی لال ساقی کے ان الفاظ میں کتنا کھرا

پن محسوس ہوتا ہے کہ شاردا پیٹھ سے مہایان پریاگ اور ایرانِ صغیر تینوں نام ایک ہی حقیقت کے تین روپ ہیں۔

کشمیر کے خوبصورت اور نظر نواز خطے کو دنیا کے دوسرے خوبصورت علاقوں کے مقابل اور مشابہ قرار دینے کا مشغلہ یورپی محققّوں اور شرق شناسوں نے بھی وقتاً فوقتاً اپنایا ہے اور ایشیائی عالموں اور سیاحوں کی توجّہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر مرکوز رہی ہے۔ ان ہی پہلوؤں کے آئینے میں اُنہوں نے کبھی کشمیر کو ایشیا کا سوئزرلینڈ قرار دیا اور کبھی اس کے یونانِ ثانی ہونے کے امکانات پر بحث کی ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، نیلگوں افلاک

کشمیر آنے والے جن سیلانیوں نے وقتاً فوقتاً سفرنامے اور یادداشتیں تحریر کیں اُن میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً کشمیر کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے بعض سفرناموں کی اہلِ قلم اور دانشور حضرات نے اپنی اپنی طرزِ فکر، انفرادی زاویہ نظر اور مختلف مقاصد کے تحت ان کی تعریف و توجیہہ کی ہے جن میں محمد یوسف ٹینگ، آنجہانی موتی لال سؔاقی اور پرُوفیسر ربانی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں لیکن مجموعی طور ان تحریروں کی شیرازہ بندی نہیں کی جاسکی ہے۔

اَب وقت نے یہ اہم فریضہ ہمارے ہاتھوں میں سونپا ہے کہ قدیم سفرناموں پر تعارفی مقالات لکھ کر اور ان میں درج مواد کی چھان بین کرکے اِسے تاریخی تسلسل میں ترتیب دیں۔ ساتھ ہی اِن کی کسی قدر تشریح اور توجیہہ کے ساتھ خود تاریخی متن کو اپنے اظہار کا موقعہ فراہم کریں۔ تاریخی ماخذوں میں مدفون

صداقتیں اس بات کی منتظر رہتی ہیں کہ انہیں کھود کر روشنی میں لایا جائے۔ اِس کے پیچھے ہمارے کئی مقاصد کارفرما ہیں۔ اوّل یہ کہ اس موضوع کی طرف عام قارئین کی توجہ مبذول کرائیں تاکہ ان میں یہ اشتہاء پیدا کی جاسکے کہ وہ ان سفرناموں اور یادداشتوں کی روشنی میں اپنی تمدّنی تواریخ کا جائزہ لیں اور اُنہیں خود اِس حقیقت کو پرکھنے کے مواقع حاصل ہوں کہ ان میں معلومات کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اس سے کتنا اِستفادہ کیا جاسکا ہے۔ اِن ذخائر میں کتنا سونا ہے اور کتنا پیتل، کتنی سچائی اور کتنا جھوٹ ہے، کتنی خوبیاں ہیں اور کتنی کوتاہیاں...... دوم یہ کہ اس سلسلے میں تمام مواد کی شیرازہ بندی کی کوشش کر کے یہ باور کرایا جاسکے کہ زمانے کی تیز و تند ہواؤں کے باوجود یہاں کے غیور عوام نے مختلف علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں فکر و نظر کی جولانیاں دکھائیں اور عالمی تہذیب کے سرمائے میں کِس قدر گرانقدر اضافے کئے۔

اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیغامِ رحیل۔

معاملے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان سفرناموں اور یادداشتوں سے بہت سی ایسی معلومات ہم تک پہنچتی ہیں جن کے بارے میں مقامی تواریخیں بالکل خاموش ہیں اور کشمیر کی تواریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ اِشارے کافی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ یہ سفرنامے فراموش کر کے یا انہیں نظرانداز کر کے کشمیر کے ماضی کو صحیح تناظر میں سمجھنے اور پرکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا...... چینی سیاح ہیون سانگ (۶۳۱ء) ہمیں مہاراجہ کنشک کے عہد میں سری نگر میں پہلی صدی عیسوی میں عالمی بودھ کانفرنس کے انعقاد کی اطلاع

دیتے ہیں جس میں لئے گئے فیصلوں کو تانبے کی تختیوں پر کنندہ کروا کے کنڈل ون وہار میں محفوظ کرایا۔ اگر ہیون سانگ ہمیں اس بارے میں اطلاعات فراہم نہیں کرتے تو عالمی تاریخ کا اہم سنگِ میل گمنامی کی نذر ہو جاتا۔ اِسی طرح مارکو پولو بعض ایسے چشم دید اُمور کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتا ہے جو آج قابلِ یقین نہیں سمجھے جاتے۔ البیرونی کی ''کتاب الہند'' کشمیریوں کی زندگی اور تمدّن کے متعلق تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں مذہب، فلسفہ، اَدب، موسم، توہمات، جغرافیہ، ریاضی، جیوتش اور فلکیات وغیرہ شامل ہیں...... مرزا حیدر ''تاریخِ رشیدی'' میں سلطان زین العابدین کی ''راز دان'' (راجدھانی) سے متعلق اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں جو بقول اُس کے ایک عجوبہ تھی...... شہنشاہ اکبر کے درباری مؤرخ ابوالفضل ''آئینِ اکبری'' میں اپنے سفرِ کشمیر کی انتہائی دلچسپ روداد بیان کر کے کشمیر کے قدیم مندروں کی طرزِ تعمیر کا مشاہدہ کر کے تحسین وآفرین کی صدائیں بلند کرتا ہے...... جہانگیر یہاں کے مناظرِ قدرت، دریاؤں، دیہاتوں، وادیوں، پہاڑوں، پودوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں پر فریفتہ ہے...... فرانکوئس برنیئر یہاں کے پہاڑوں پر دُودھ اور شہد کی ندیوں کا ذکر کرتا ہے...... ولیم مُورکرافٹ پیر پنچال کے دَرّے کو پار کرتے ہوئے بھوک اور ٹھٹھرتی سردی سے مرنے والے ۴۵ کشمیری مزدوروں کی لاشیں گنتا ہے...... بیرن ہیوگل خدا کا شکر اَدا کرتا ہے جس نے اُسے کشمیر کی صورت میں رُوئے زمین کا حسین ترین مقام دیکھنے کے موقعے سے سرفراز کیا...... ینگ ہسبنڈ کشمیر کے دستکاروں کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا...... سر الیگزینڈر کننگھم پوری ریاست کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں انتہائی مفید

معلومات فراہم کرتے ہیں۔ سر مارک اَرل سٹین نے راج ترنگنی کو بنیاد بنا کر پہلی بار کشمیر کا جغرافیہ لکھا جس میں انہوں نے کشمیر سے متعلق بہت سی پیچیدہ گتھیوں کی گرہ کشائی کی...... سر والٹر لارنس کی ''ویلی آف کشمیر'' کا ایک ایک لفظ اپنے اندر بصیرتوں اور معلومات کا خزانہ لئے ہوئے ہے...... ولیم ویکفیلڈ کشمیر میں قحط کی تباہ کاریوں اور عوام کی کسمپرسی کے واقعات بیان کرتا ہے جب کہ ٹینڈل بسکو کشمیر میں تعلیم کے نُور کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کی زبوں حالی پر خامہ فرسائی کرتا ہے۔

لداخ صدیوں سے سیلانیوں محققوں اور مہم جوؤں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ لداخ کے راستے سے مسافر، حملہ آور، علماء، مبلغین اور محققین وسطِ ایشیا اور دیگر ممالک کا سفر کرتے رہے ہیں اور یہ علاقہ ہزاروں برسوں سے وسطِ ایشیا کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ سفر ناموں اور یادداشتوں کی صورت میں بہت سی دستاویزات ہمیں اہم ثقافتی مخزنوں کا سراغ دیتی ہیں جن میں سے بعض زیرِ نظر شمارے کی زینت ہیں۔ ہم نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ غیر ملکی سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں صوبہ جموں اور اس کے گردونواح کے بارے میں جو بھی لکھا ہے اُن پر ایک مبسوط مضمون لکھوایا جائے لیکن تاایں دم ہماری یہ سعی بارآور ثابت نہیں ہوسکی ہے۔

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب

ہمارے بہت سے دوستوں کا یہ استدلال ہے کہ مقامی تواریخوں کے قابل اعتناء ماخذ دستیاب ہونے کے باوجود ہم پرائیوں پر کیوں واری جاتے

ہیں لیکن شاید اُن کی توجہ اِس اَمر کی طرف نہیں جاتی کہ جب ہم اس علاقے کی تمدنی میراث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ سفرنامے فراموش کر کے یا انہیں نظر انداز کر کے تمدنی تواریخ کے مختلف پہلوؤں کا مؤثر جائزہ قابلِ بھروسہ نہیں ہوسکتا۔ تاریخیں مرتّب کرتے وقت اکثر مؤرخین کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ تاریخ کے اُن سبق آموز، عبرت ناک، حیرت انگیز واقعات اور معرکوں کا احاطہ کرنے میں اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جو تاریخی شاہراہوں پر دندناتے گزرتے ہیں۔ سفرناموں میں اس روایتی طریقے سے اجتناب کر کے پیچ در پیچ اور تنگ و تاریک گلیاروں اور پگڈنڈیوں پر رُونما ہونے والے اُن روزمرّہ واقعات کا عینی مشاہدہ کر کے انہیں اگلی نسلوں کے لئے محفوظ کرلیا جاتا ہے جو ہمارے تہذیبی میراث کا انمول سرمایہ ثابت ہورہا ہے ؎

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اِس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

یہ اشاعتِ خصوصی کشمیر کی تواریخ اور تہذیبی وراثت کی جانکاری، وسیع اور عام کرنے میں کس حد تک ممد و مددگار ہوگی یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ہمیں فخر ہے کہ اپنی مقدور کے مطابق ہم ریاست کی ثقافت کے اِس اہم پہلو کا تفصیلی اور گہرا جائزہ ''شیرازہ'' کی وساطت سے اُردو میں پیش کر رہے ہیں حالانکہ اِن سفرناموں اور یادداشتوں میں ایک بھی اُردو میں نہیں۔ فاضل مضمون نگاروں نے حسبِ توقع بڑی محنت کر کے پہلی مرتبہ بعض نئے اور اہم نکتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ہی یہ قدرتی اَمر ہے کہ زاویۂ نگاہ انفرادی ہوسکتا ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کا اِتفاق ضروری نہیں۔

ہمارا خواب اس سپیشل نمبر کو اور زیادہ جاذب اور بھرپور بنانے کا تھا جس صورت میں یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سر رچرڈ ٹمپل، فریڈرک ڈِرو، جیک ماؤنٹ اور دیگر کئی سیلانیوں کے سفرناموں کے جائزے کے بغیر اِس مجموعے میں تشنگی کا احساس قدرتی امر ہے لیکن ممکنہ تگ و دَو اور بسیار انتظار کے باوجود ہمارے بعض اکابر مؤرخین اور مصنفین نے ہمیں اپنی نوازشات سے محض اس لئے محروم رکھا کہ اکادمی کی طرف سے حق المحنت کی صورت میں پیش کی جانے والی رقم اُن کی اُمید سے بہت کم ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے مجبوراً ہمیں بعض فاضل مضمون نگاروں سے کئی کئی موضوعات پر مضامین پر قلم اُٹھانے کی استدعا کرنا پڑی۔ بہرحال یہ سلسلہ جاری ہے اور اگر ہماری کوششیں ثمر بار ہوں گی تو شیرازہ کی کسی آئندہ اشاعت میں یہ مضامین یکجا کر کے نذرِ قارئین کئے جائیں گے۔

زیرِ نظر خصوصی اشاعت میں مضامین Chronological Order میں ترتیب دیئے گئے ہیں تاکہ اسے حتی الوسع مربوط بنایا جاسکے اور واقعات کے بیان میں تسلسل پیدا ہو۔

اِدارہ اُن تمام فاضل مضمون نگاروں کا انتہائی مشکور و ممنون ہے جنہوں نے اس اشاعت کے لئے ہمیں التفات سے نوازا، خصوصاً جناب عبدالغنی شیخ (لداخی) صاحب کی نوازشوں کو الفاظ میں سمیٹنا بہت ہی مشکل ہے۔ انہوں نے جس دستِ تعاون سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے وہ کچھ انہیں کا حصّہ ہے۔ سیکرٹری اکیڈیمی جناب رمیش مہتہ کے احسانات کا اعتراف کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں جو تمدن اور ثقافت کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ نمبر مرتب کرنے کے دوران کٹھن مرحلوں میں وقتاً فوقتاً

راہنمائی کی اور کارآمد مشورے دیئے۔ جناب عبدالروٴف قاری حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہے اور کئی دفتری طوالتوں کو آسان کر دیا۔ کشمیر کے مایہ ناز خطاط، اُستاد محمد عباس صاحب کی عنایات کی بدولت طباعت سے کے جدّید تقاضوں سے ہم آہنگ کمپوٹر کمپوزنگ ممکن ہو سکی۔ جناب ناظم الدّین اور غلام نبی میر لائبریرین اکادمی نے بعض نادر کتابیں دستیاب کرا کے بہت سی مشکلات کا ازالہ کیا، میں ان تمام تمدّن شِناس حضرات کا مشکور و ممنون ہوں۔ اکادمی آرکائیوز اور مختلف ذرائع سے حاصل شدہ بعض نادر تصاویر، خاکے اور نقشے بھی زیرِ نظر اِشاعت کی زینت ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ انہیں مضامین کے سیاق و سباق سے جوڑا جائے۔

ہماری کوششیں کہاں تک کامیاب ہوئی ہیں اس کا فیصلہ بہر حال قارئین محترم کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر ہماری کوششوں کی بَدولت ہماری ریاست کے تمدّن اور ثقافت کے بعض گوشے منوّر ہو جاتے ہیں اور ہماری تاریخ کے اس اہم پہلو کی طرف اُذہان متوجّہ ہو جاتے ہیں تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی۔ ہمیں بہر حال اِس سلسلے میں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

.... محمد اشرف ٹاک

سرینگر۔ یکم اگست ۲۰۰۴ء



محمد یوسف ٹینگ

ہیون سانگ اور کشمیر

ہیون سانگ[1] کا نام سُنتے ہی یادوں کے دَریچے سے دو بڑے واقعات جھلملانے لگتے ہیں۔ یہ واقعات الگ الگ قبیل کے ہیں مگر کشمیر کی تواریخ میں اِن کا رُتبہ اعلیٰ وافضل ہے۔

تلاشِ حق کا یہ عظیم مسافر، طالبِ علم اور مذہب کے نُور کا تعاقب کرنے والا مئی ۶۳۱ء سے اپریل ۶۳۳ء تک یعنی پورے دو سال کشمیر میں رہا۔ یہی وہ مبارک وقت ہے جب کئی سمندروں اور صحراؤں پار حجاز میں اِسلام اپنی ضیاء پاشیوں سے آفاق کو منوّر کر رہا تھا اور یہی وہ وقت ہے جب وہ مقدس جبین، جس کے نُور سے ضیاء کے پھوارے اُمڈ رہے تھے، اُپنے پرُوردگار کا حکم بجالا کر واپس اُس کی آغوشِ رحمت میں تشریف لے جا رہے تھے۔ یعنی اِس مدت کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی۔ (تاریخ وِصال ۸؍جون ۶۳۲ء)

ہیون سانگ کے کشمیر آنے سے کچھ عرصہ قبل ہی پرورسین نے نیا شہر بسایا تھا اور اِسے پرورسین پور یا پرورپورہ نام دیا۔ سرینگر پُرانا شہر سلیمان ٹینگ کے شمال میں تھا جِسے اپنے وقت ادھشٹان (بڑا شہر- راجدھانی) کہتے تھے لیکن جو ہیون سانگ کے

---

[1] ہیون سانگ نام کو الگ الگ ترجمہ کاروں نے جُدا جُدا انداز سے دہرایا ہے۔ جولین اُسے اُمے پھوراہ نام سے بُلاتا ہے۔ میئرن ہیون چانگ، ویلی یووں چانگ، ہیمویل بیل ہیون سانگ اور واٹرس یوان پوانگ لکھتا ہے۔

یہاں تک آنے کے وقت ذرنیٹھن (پران ادھشٹان) یعنی پُرانا شہر بن گیا تھا۔[1] نیا شہر سلیمان ٹینگ کے بائیں یعنی شمال اور ہاری پربت کے دائیں یعنی جنوب کی سمت میں اُبھرتا ہے۔ یعنی بعد میں کشمیر کا ''نگر'' اور آگے چل کر ''سرینگر'' بن گیا جس کی انگریزی شکل The City اور عربی صورت المدینہ بن سکتی ہے۔ سرینگر کو جو سریہ (سورج) دیوتا کا شہر کہتے ہیں وہ اُس زعم میں ہیں جس کی کوئی دلیل پشت پناہی نہیں کرتی ــــ پرورسین پورہ حالیہ ایام تک پنڈتوں کے زائچوں اور جنتریوں میں لکھا جاتا تھا۔ عیسوی سنہ کے مطابق ۱۹۷۰ء میں پرورسین پورہ یا سرینگر اپنے قائم ہونے کے ڈیڑھ ہزار سال پورے کر رہا تھا۔ لیکن کشمیریوں کے قومی شعور کی لو پوری طرح منور نہیں ہوئی ہے۔ اِس لئے یہ قومی تہوار پہچان اور شادیانے کے گیتوں کی حسرت لئے گذر گیا۔

ہیون سانگ پرورسین پور کا سراغ دینے والا اور نام لینے والا پہلا شخص ہے جس کی تحریر زمانے نے سنبھال کے ہمارے حوالے کی۔ وہ اس کا چینی نام ''پولووولو'' (Po-Lo-Wu-Lo) کہتا ہے جو پرور پور کی چینی صورت ہے۔[2] اِس وقت سرینگر میں دُنیا کے قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے اور ہندوستان کے زندہ اور آباد پُرانے شہروں میں اِسکی گنتی دِلی اور وارانسی (کاشی) کے بعد کی جاتی ہے۔ سرینگر برِصغیر کی تقسیم کے وقت کابل لاہور تک کے علاقے میں سب سے بڑا اور اہم شہر تھا۔

-☆-

ہیون سانگ کا سفرنامہ بُدھ مت کے عروج اور اقبال کا ایک انتہائی اہم، عظیم اور معتبر دستاویز ہے۔ بحیثیتِ سیاح بھی اُسکا شمار دُنیا کے برگزیدہ سفیروں میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان (برِصغیر) کی قدیم تاریخ اور تمدّن کے ساتھ ساتھ کشمیر کی

---

[1] ''پاں'' کشمیری میں پراچین یا پُرانے کو ہی کہتے ہیں۔ مثلاً دُراس کے ساتھ پُرانا گاؤں آج بھی 'پاں دراس' کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی طرح سرینگر کا مشہور محلہ ''پاندان'' دراصل 'پاں دان' یعنی پُرانی راجدھانی۔ 'پاں' نظر آنا بھی پُرانے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

[2] یہ نام اسکے سوانح نِگار On Yuan Diawang'sTravels in India-By, Thomas Watters نے دیا ہے لیکن حیرانی ہے کہ ٹامس واٹرس کہتا ہے کہ یہ بارہ مولہ (ورمُل) ہے۔ یہ کشمیر کا پورا علم نہ ہونے کا نتیجہ ہے (صف ۲۶۲)

تہذیب اور تمدّن کے متعلق اُسکے مشاہدات ایک اصل معتبر اور زبردست دستاویز تسلیم کی جاتی ہے۔ اُس نے کشمیر کے متعلق صرف پندرہ صفحوں (مطبوعہ) میں لکھا ہے لیکن یہ بہت حد تک دیومالایی اور خرافاتی قصّوں سے الگ ہے۔ جس نے اوروں کو تو کُجا کلہن جیسے زیرک تواریخ نویس کو بھی گمراہ کیا ہے لیکن اُسکی اہمیت اور عظمت صرف زمانۂ قدیم سے تعلق نہیں رکھتی۔ وہ ایک عظیم، عجیب اور عظیم راز کا کلید بردار ہے۔ وہ ہمیں پہلی مرتبہ اُس بودھ کونسل کی اطلاع دیتے ہیں جسے بعض اِس شمار کی تیسری اور چوتھی کونسل کہتے ہیں۔ اِسی کونسل میں بُدھ مت کے بڑے فرقے (مہایان) کا دھرم شاستر یا مقدس کتاب کو بڑی بحث و تمحیص کے بعد اکٹھا کیا گیا۔ اِس میں راستی اور پاکیزگی لائی گئی۔ اِس کونسل کی تمام کاروائی تانبے کی تختیوں پر کندہ کرائی گئی۔ تین شاستروں، جس کا جھرمٹ بدھ مت کا مقدس صحیفہ تری پٹیکا[1] بنتا ہے، اِن کا متن الگ الگ پتھر کے صندوقوں (پٹاروں) میں محفوظ کرائی گئی، ہر شاستر جو تانبے کی تختیوں پر لکھا جاتا ہے، ایک ایک لاکھ الفاظ رکھتا تھا۔ اِس طرح ان شاستروں کے تین لاکھ الفاظ تھے۔ یہ تین سنگین پٹارے[2] ایک زمین دوز گپھا جیسی جگہ میں سنبھال کے محفوظ کئے

---

[1] کنشک کے سِکوں (مہروں وغیرہ) پر کھروشٹی میں لکھا ہے۔ یہ خط دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے جیسے عربی اور فارسی لکھی جاتی ہے۔ اُسکی مہروں پر اُسکا نام "شہنشاہ ہوکشان شہرو" لکھا گیا ہے۔ شہر بمعنی سلطنت۔

[2] اِن تین شاستروں کے نام ہیں: ۱/ اُپدیش شاستر۔ ۲/ وِنے وبھاشا شاستر۔ ۳/ ابھیدھرما وِبھاشا شاستر۔ یہ شاستر الگ الگ پٹاروں میں رکھتے جاتے تھے تاکہ انہیں سنبھال کے رکھا جاسکے، تعظیم کے ساتھ رکھا جاسکے، پڑھنے یا پوجا کے وقت اِدھر اُدھر لے جایا جاسکے۔ یہی پٹیکا بعد میں پٹارہ بن گیا۔ پٹارہ نرم ٹہنیوں یا رسیوں سے بُنا، جالی دار ٹوکری سا ہوتا تھا۔ یہ گول ہوتا تھا اور اس کا ڈھکن گول گنبد جیسا۔ دراصل یہ بدھ ستوپا کی چھوٹی موٹی نقل ہوتی تھی۔ پٹارہ جسے بُدھوں کیلئے ہی معرضِ وجود میں لایا گیا تھا، تین الگ الگ پٹاروں میں تین الگ الگ شاستر ہوتے تھے۔ یہ تکون بُدھ مت کی خاص بات تھی۔ جیسے اُنکے معبد بھی ایک ہی جگہ تین ہوتے تھے (۱) وہار (۲) ستوپا (۳) چیتیہ...... آج بھی لداخ کے بعض ستوپوں میں یہ پٹارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں بھوج پتر یا دبیز دیسی کاغذ پر تحریر بودھ دھرم شاستر رکھے جاتے تھے۔ تین پٹاروں کا یہی شاستر بعد میں "ترِی پٹکا" نام سے مشہور ہوا۔
کشمیری، پٹاروں میں ہمیشہ کوئی مقدس یا نیک شگون والی شئے رکھتے تھے۔ بعد میں وہ عزیز اور قیمتی زیورات، پارچے وغیرہ اس میں رکھتے تھے۔ آج بھی کشمیر کے بعض گھرانوں میں یہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

گئے۔ اسکو سر بمہر کیا گیا اور اس جگہ شہنشاہ کنشک نے ایک ٹوپ (ستوپا) بنوایا جہاں یکھش حفاظت کے لئے مامور کئے گئے تا کہ وہاں کوئی اپنا ہاتھ نہ ڈال سکے یا خیانت نہ کر سکے۔ تب سے ۱۹۲۵ رسال گذر گئے (کنشک کا زمانہ عام طور ۷۸ء کے پاس مقرر کیا جاتا ہے)۔ مگر آج تک یہ شاندار تہذیبی تودہ، مذہبی گنج، پُرنور صحیفہ اور پُراسرار امانت کسی جنگل کی گہرائی میں خاموشی سے محوِ آرام ہے جیسے کسی محرمِ راز کا انتظار کر رہا ہو جس کی آنکھوں میں بصیرت کا سُرمہ اور سینے میں معرفت کے دیئے جگمگا رہے ہوں، جس کے سامنے یہ اپنا ساکت وجود کھولے اور اُسی طرح سیلابِ نور بن کے اُبھرے، جس طرح ویری ناگ سے وِتستا (جہلم) نمودار ہوتا ہے[1]

ہیون سانگ اپنے ملک سے چُپ چاپ نکل آیا تھا اور سولہ سال بعد وہ پورے کروفر سے واپس چلا گیا۔ وہ ۶۰۳ء میں ہُنان صوبے کے چھن لیو شہر میں پیدا ہوا اُس کا بھائی ایک بودھ پرچارک تھا۔ تیرہ سالہ ہیون سانگ بدھ مت میں بہت محو ہو گیا لیکن بہت سی باتوں اور پہیلیوں کا اُسے جواب نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ اُس سرزمین کی زیارت کیلئے مچل گیا جہاں سے بُدھ مت مشرق سے مغرب، نور کی کرنیں بکھیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ (چین کو اُن دنوں مشرقی سلطنت اور ہندوستان کو مغربی ملک کہا جاتا تھا۔ اِسی لئے اُسکے سفرنامے کا نام بھی "Budhist Records of Western World" رکھا گیا ہے) چین سے وہ چوری چھُپے نکل آیا تھا کیونکہ اُس وقت چین سے باہر جانے کیلئے سرکاری اجازت لینی پڑتی تھی (چین کو اِسی وجہ سے ملک ممنوع Forbidden Country بھی کہتے تھے) ترکستان کے من مند قصبے سے ہوتے ہوئے تاشقند پہنچ کر وہ زرافشاں دریا کی طرف چلا گیا۔ سمرقند میں سیر دریا (سیحوں) عبور کر کے شہر سبز پہنچ گیا۔ وہاں وہ تورآمو جیحوں دریا پار کر کے کابل کے

---

[1] ویری ناگ، جسے مغلوں نے تعمیر کیا، اُسے دیکھ کے لگتا ہے جیسے روشنی اپنے منبع سے پھوٹ پڑ رہی ہے۔ مہاتما گاندھی کی سادھی راج گھاٹ کی تعمیر اِسی سے متاثر ہو کے کی گئی ہے۔ راج گھاٹ کی تعمیر کا بنیادی خیال یہی بیان کیا گیا ہے کہ جیسے اِس پر نُور کی بارش ہو رہی ہو اور چاروں طرف پھیل رہا ہو۔ راج گھاٹ اور ویری ناگ کی یہ مماثلت کشمیر کیلئے بڑا اخراج ہے۔

نواح میں پہنچ گیا[1]۔ آگے چل کر اُس نے آج تک کے ہندوکش پہاڑ کو عبور کیا۔ گندھار (ضلع پشاور) اور ہزارہ پہنچ کر اُس نے کشمیر کا رُخ کیا۔ یہ سفر اُس نے ایک سال سے زائد عرصے میں طے کیا۔ کشمیر میں وہ بارہمولہ کے راستے سے داخل ہوا۔ اُسکے سوانح نگار کا کہنا ہے کہ کشمیر پہنچتے پہنچتے اُس کا نام اور شہرت اُس سے پہلے ہی یہاں پہنچی تھی۔ چنانچہ وہ مغرب کے سنگی دروازے سے داخل ہوا یعنی وہ درّہ جو بارہمولہ سے ذرا اُدھر پہاڑوں کو علیحدہ کرتا ہے اور جس کے بیچ سے جہلم نیچے لڑھک جاتا ہے[2]۔ سنگی دروازے پر کشمیر کے بادشاہ (جس کا اُس نے نام نہیں لیا ہے۔ افسوس) کا ماموں اُس کے استقبال کے لئے آیا تھا، اُسکے ساتھ سواری اور سامان کے لئے گھوڑے تھے تاکہ مہمان آرام اور آرائش کے ساتھ راجدھانی پہنچ سکے۔ راستے میں وہ بہت سی بودھ خانقاہوں میں داخل ہوا اور وشکر میں پوری ایک رات گذاری۔ رات میں اِس خانقاہ کے راہبوں نے خواب دیکھا جس میں اُن سے کہا گیا کہ یہ زائر کتنا عالی مرتبت ہے اور اسکی کس قدر تعظیم کی جائے۔ اُن سے کہا گیا کہ وہ مہاچین (کشمیری شاعری کا ماچین) سے آیا مہمان ہے۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد وہ راجدھانی کے قریب پہنچا۔ اس جگہ خود بادشاہ ایک ہزار امیر، وزیر اور راہبوں کے ساتھ اُس کی مہمان داری کے لئے حاضر تھا۔ جب شہر کی طرف روانہ ہوا تو ہیون سانگ کو ہاتھی پر سوار کرایا گیا جس کی شاہانہ انداز سے آرائش کی گئی تھی۔ پہلی رات معزز مہمان نے جیندر[3] وہار میں

۱۔ جیحون کو عرب نہر بھی کہتے تھے۔ اسکے مشرق کا تمام علاقہ ماوراء النہر تھا جہاں بعد میں فارابی، ابن سینا، البرونی اور جامی جیسے مشاہیر پیدا ہوئے۔

۲۔ تاشقند سے جب سمرقند جاتے ہیں، لگ بھگ بیچ راستے ایسا ہی مقام آتا ہے جب پہاڑ کچھ علیحدہ سے ہو گئے ہیں۔ وہاں اُسے آج بھی ''سنگِ در'' کہتے ہیں۔ جب راقم کئی برس قبل بس میں اِس دروازے سے گزرا تو لگا کہ جیسے وہ بارہمولہ کے پار جا رہا تھا۔

۳۔ جیندر وہار۔ میرے خیال میں یہ اُس جگہ تھا جہاں آج کاریہ ٹینگ محلہ آباد ہے۔ اُس وقت جہلم کا پانی وہاں تک موجیں مارتا ہوگا۔ یہاں پرانے زمانے کے بودھ آثار بھی ملے ہیں۔ اِس کا تقدس اِتنا تھا کہ اِسے مسلمان بھی ریاضت ٹینگ یعنی دھیان اور وچار کی جگہ مانتے تھے۔ کشمیر کا مشہور شاعر اور مؤرخ عبدالوہاب شایق اِسی جگہ ایک مسجد کی امامت کرتا تھا اور وہ بھی ریاضت ٹینگ کی عظمت کا خلاصہ کرتا ہے۔

قیام کیا مگر دوسرے روز مہاراج اُسے اپنے محل میں لے گئے۔ اُسے بیس نقل نویس اور پانچ خدمتگار دیئے گئے تاکہ وہ مقدس کتابوں اور نسخوں کو نقل کرواسکے۔ وہ اپنے کام میں مگن ہوگیا اور کشمیر کے مقدس بودھ تیرتھوں میں عبادت کیلئے جاتا رہا۔ آخر کار وہ جنوبی درّے سے کشمیر سے باہر چلا گیا جو نہایت ہی دشوار گذار تھا اور پونچھ[۱] پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے پیر پنچال کے بہرام گلہ کو عبور کیا تھا اور اُس رستے پر چلا تھا جو شوپیان کو پونچھ سے ملاتا ہے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد اس کا نام مغل روڈ پڑا جو اب پھر سے تعمیر کیا جارہا ہے۔ پونچھ کے آگے وہ راجوری پہنچ جاتا ہے اور اپنا سفر بودھ گیا' نالندہ وغیرہ کی طرف جاری رکھتا ہے۔

-☆-

ہیون سانگ کشمیر کا نام ''کیا-شی-می-لو' لکھتا ہے جو آج کے چینی نام کا انداز ہے۔ اِس جگہ چینی عبارت میں ترتیب کار حاشیئے میں لکھتا ہے کہ اِسے کپین (Kapin) بھی کہتے ہیں۔ کپین عام طور پر اُس بڑے علاقے کو کہتے ہیں جس میں کاشغر میں رہنے والے ساکا (Saka) خانہ بدوش قبیلوں کے لوگ منتشر ہوگئے اور جو کاشغر (چینی ترکستان) کے شمال مغرب میں واقع ہے مگر عام طور کشمیر کی دِلربا وادی کا چینی نام ترجموں میں فقط کپین لکھا جاتا ہے۔

ٹامس واٹرس (Thomas Watters) لفظ ''کسمیر'' یا ''کشمیر'' کا ایک بالکل بدل معنی دیتا ہے جو کشمیر کی Etymology کا ایک الگ پہلو پیش کرتا ہے۔ کہتے ہیں چینی زبان میں اِسکے معنی ''کون اندر داخل ہو؟'' ہے۔ اس کے پسِ منظر میں ایک داستاں ہے جو کشمیر کے وجود میں آنے کا بودھ نظریہ پیش کرتی ہے۔ یہ نظریہ کشمیر کے متعلق مروّجہ برہمن نظریات سے الگ ہے اور اس کا پہلا سراغ ہیون سانگ ہی ہے۔ ''کون اندر داخل ہو؟'' کے مفہوم کا جائزہ لینے کے لئے پہلے اِس نظریئے کی صراحت ضروری ہے۔

---

۱ ہیون سانگ اِسے Pan-Na-Su لکھتا ہے۔ صاف ہے کہ یہ پونچھ کی ہی شکل ہے۔



مہاراجہ کنشک



ہارون سرینگر میں بودھ وہار کی باقیات

''کہتے ہیں پہلے یہ جگہ ایک جھیل تھی۔ جس میں ناگ (Dragon) رہتے تھے۔ پرانے زمانے میں جب بدھ، ادھیان[1] سے، جہاں اُس نے ایک راکھشس کو زیر کیا، واپس آ رہے تھے اور جب وہ اُڑتے اُڑتے اِس جھیل کے اوپر جا رہا تھا، اس نے اپنے مرید آنند کو کہا کہ میرے نِروان کے بعد یہاں ارھت مدھیانتک آئے گا۔ یہاں ایک سلطنت بسائے گا۔ لوگوں میں تہذیب پیدا کرے گا اور اپنی کوششوں سے یہاں بُدھ مت کا قانون جاری کرے گا۔''

گوتم بدھ کے نِروان کے پچاس سال بعد آنند کا شاگرد مدھیانتک ارہت یہاں آیا۔ اُس نے مہاتما بُدھ کی بشارت سُنی تھی۔ وہ ایک درخت کی پُھنگی پر بیٹھ گیا جو پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ وہاں وہ بہت سے رُوحانی کمالات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جھیل کے ناگوں کا بادشاہ تندہی سے یہ سب کچھ دیکھ کر متاثر ہو رہا تھا۔ وہ بڑی عقیدت سے آیا اور اَرہت کی طرف کہنے لگا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں''؟

ارہت نے کہا۔ ''مجھے جھیل کے بیچ میں تھوڑی سے جگہ چاہیئے۔ اُتنی سی جہاں آلتی پالتی مار کے بیٹھ سکوں''۔ جوں ہی ناگ راج نے یہ سُنا وہ پانی کو پیچھے لے گیا اور اِس جگہ ارہت بُراجماں ہو گیا۔ اَرہت اپنی روحانی عظمت سے اپنے آپ کو وسعت دینے لگا۔ اس کا جسم بڑھنے لگا اور بڑھتا گیا۔ ناگ راج پورے زور سے پانی کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔ اِس طرح پوری جھیل خشک ہو گئی اور پانی ختم ہو گیا۔ ناگ راج کانپ اُٹھا اور بھاگنے لگا۔ لوگ کنارے پر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب جھیل سوکھ گئی تو وہ اِس میں جانے سے کترانے لگے اور اِس موقع پر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ''کون اندر داخل ہو؟''

-☆-

[1] اُدیان زمانۂ قدیم میں اُس ملک اور نواحی علاقوں کو کہتے تھے جسے آج افغانستان کہتے ہیں۔ کہتے ہیں افغانستان ''آوا گوان'' سے نکلا ہے۔ اِس علاقے میں یاتریوں، مسافروں اور لشکروں کا اتنا آنا جانا تھا کہ اِسے 'آوا گوان' کہتے تھے۔ یعنی آنے جانے، عبور و مرور کی جگہ۔

ہیون سانگ کشمیر کا ذکر ایسے کرتا ہے جس سے اس کی عظمت کا احساس اُبھرتا ہے۔ وہ ہزارہ سے کشمیر آتے وقت بھی کہتا ہے کہ اِن علاقوں کا کوئی راجہ نہیں اور یہ ملک کشمیر کے ماتحت ہیں۔ پونچھ اور کشمیر پہنچنے پر بھی وہ یہی بات دہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہت سی سلطنتوں اور راجاؤں نے کشمیر پر حملے کئے لیکن کشمیریوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ وہ کہتا ہے کہ راجدھانی ایک دریا کے کنارے پر ہے اور دریا اِس کے مغرب میں بہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پرُور پور ہے (سرینگر کا ذکر) یہ شہر شمالاً جنوباً زیادہ لمبا ہے اور شرقاً غرباً یعنی چوڑائی میں کچھ کم۔ اسکے اِرد گرد بہت سی فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔ پھول اور میوے بسیار ہیں۔ لوگ اُون کے پیراہن (پھرن) پوشاک کے طور پہنتے ہیں۔ یہاں اچھے گھوڑے ہیں۔ بلوریں شیشہ، زعفران اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ موسم سردیوں میں بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ بہت برف، لیکن ہَوا بہت کم۔ لوگ خوبصورت اور جمیل ہیں لیکن کمزور دل اور کمینہ خصلت کے۔ البتہ پڑھنے کا شوق ہے اور پڑھے لکھے ہیں۔ اُن پر ناگوں (چینی Dragan جس کو وہ برکت والا اور پوِتر مانتے ہیں) کا سایہ ہے اِسی وجہ سے وہ اپنے ملک کے پڑوسیوں پر غالب ہیں۔ ان میں اعتقاد والے (بودھ) اور بد اعتقاد (کافر) بھی ہیں۔ سو سے اُوپر بودھ استھاپن ہیں اور پانچ ہزار بودھ عابد، چار اشوک ستوپوں (جو مہاراجہ اشوک نے بنوائے) میں مہاتما بدھ کے جسم کے آثار ہیں۔

جب ہیون سانگ کشمیر پہنچا اُس وقت بدھ مت کی مقبولیت کچھ کم سی ہو گئی تھی اور اس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وہ خود بہت سی بودھ خانقاہوں کا ذکر کرتا ہے اور ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے کہ یہ اب خستہ اور ویراں ہو چکی ہیں۔

کشمیر کے متعلق ہیون سانگ کے ایک ایک لفظ کی اِتنی صراحت اور وضاحت کی جا چکی ہے کہ اگر اِس کو سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ لہٰذا لگتا ہے کہ ہم اُس کے سب سے بڑی اطلاع جو ہمارے اِرادوں کو پکار رہی ہے اور دعوت دے رہی ہے، کا جائزہ لیں۔ یہ ہے کشمیر میں بدھ کونسل کا انعقاد۔ وہ کہتا ہے

کہ مہاتما بُدھ کے نجات پانے (اِنتقال کے بعد) چار سو سال، کنشک[1] جو گاندھار کا راجہ تھا، اپنے ملک کی سرحدوں کو وسعت دینے کی غرض سے نکلا۔ جب بھی اُسے کبھی موقعہ ملتا وہ بُدھ شاستروں کا مطالعہ کرتا۔ ہر روز ایک ایک بُدھ پیشوا اُس کے محل میں داخل ہوتا اور اُسے دھرم کی تعلیم دیتا۔ لیکن الگ الگ دھرم کی الگ الگ وضاحت کر کے۔ بادشاہ وُسوسوں میں مبتلا ہو گیا اور اُسے اپنا شک دور کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ اس موقعے پر مقدس پرُسو آیا اور اُسے کہا۔ ''شاکھیہ منی (گوتم بدھ) برسوں پہلے انتقال کر گیا۔ اُس کی تعلیمات کے لوگوں نے جدا جدا معنیٰ اخذ کئے ہیں۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اور اس طرح گنجل پیدا ہو گیا ہے اور اُفراتفری پیدا ہو گئی ہے۔

یہ سُن کر پہلے بادشاہ پریشان ہو گیا، لیکن بعد میں کچھ سوچ کر کہنے لگا کہ میں ایک ادنیٰ انسان ہوں لیکن بودھ کا آشیرواد حاصل ہے۔ میں پہلے بودھ کے تین پٹاروں کا ایک مستقل متن تیار کروں گا' تبُ مروں گا۔ مقدس پرُسو خوش ہو گیا اور کہا کہ بادشاہ کی نیکیاں اس کے کام آئیں اور بُدھ کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے''

بادشاہ نے اِسکے بعد ہزاروں راہبوں اور بودھ عالموں کو بُلایا جب بہت سے مندوب اکٹھے ہو گئے تو بادشاہ نے سات روز تک اُن کی مہمان نوازی کی لیکن اِسکے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اتنا بڑا جلسہ آرام اور احتیاط سے تری پٹیکا ترتیب نہیں دے سکتا۔ اسکے بعد اسے تین الگ الگ حصوں میں بانٹا گیا اور تعداد فقط ۱۹۹ ے عالموں اور عابدوں تک ہی رہ گئی جو عمل، علم اور روحانی خوبیوں سے ہر لحاظ سے کھرے نکلے۔

---

[1] ہیون سانگ' اشوک کا زمانہ گوتم بُدھ کے گزرنے کے بعد ایک سو سال مقرر کرتا ہے جو صحیح نہیں۔ اِس وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشوک اعظم ہی ہے یا کوئی مقامی راجہ اُشوک کا زمانہ 263-224 قبل مسیح ہے اور اُسکے اپنے کتبوں کے مطابق گوتم بُدھ، مہاراجہ اشوک کے 221 سال پہلے گزرا ہے لیکن کنشک کا زمانہ ہیون سانگ نے لگ بھگ صحیح مقرر کیا ہے۔

اس مرحلے پر کشمیر کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔ اسے کیوں بدھ مت کا سب سے عظیم صحیفے کی تصحیح کرنے اور اسے سنبھال کے رکھنے کا فخر عطا کیا گیا۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس کی بعض معتبر وجوہات تھیں۔

اُس نے کہا کہ میں اپنے وطن (گندھارا) واپس جاؤں گا اور آسکا مطلب تھا کہ آپ کو بھی وہیں لے جاؤں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا وہاں بڑی گرمی ہوگئی اور برسات کی رطوبت عیاں ہے کہ کونسل گرمیوں میں ہوئی ہوتی لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا۔ اسکے بعد کہا کہ ہم راج گاہا جائیں لیکن مقدس پرسُو نے کہا کہ وہاں بہت سے مشرک اور منکر ہیں جو شاستروں پر تنازعہ اُٹھائیں گے لہٰذا وہاں آزادی اور ٹھنڈے دماغ سے بات چیت یا بحث مباحثہ نہیں ہوسکتا۔ اِس وجہ سے کشمیر بہترین جگہ تسلیم کی گئی اور کونسل شروع ہوگئی۔ واشومترا اور اَشوگھوش کی رہنمائی میں تری پٹکا کا مستند اور صحیح مواد (Text) مرتّب کیا گیا۔ اس کی ترتیب کے وقت قدیم نسخوں اور زبانی روایات کا ازسرِ نو جائزہ لیا گیا اور بحث و تمحیص کے بعد ممکنہ غلطیوں سے پاک کیا گیا۔ اِس مواد کی بہت سی نقلیں کی گئیں اور اسے علم و عرفان کے متلاشیوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ وہ اس سے فیض حاصل کرسکیں۔ شہنشاہ نے صحیفے کا متن تانبے کی تختیوں پر کندہ کرایا۔ اسکے بعد انہیں پتھروں کے پٹاروں (صندوقوں) میں بھرا گیا اور اُس ٹوپ میں دفن کیا گیا جو کنشک نے اس کے لئے خاص طور سے بنوایا تھا۔ اسکے بعد بادشاہ نے یکھشوں کو اسکے پہرے پر مامور کیا۔ اُن کو حکم دیا گیا کہ اس کو کوئی کافر (بدٰاعتقاد) اس ملک سے باہر نہ لے جائے۔ اگر کسی کو اسکے پڑھنے کا شوق ہو وہ اِس ملک میں ہی ایسا کرسکتا ہے۔

یہ ترجمہ ٹامس واٹر کا ہے لیکن اُس سے پُرانا ترجمہ کار سیموئیل بیل اِسے اس انداز سے ادا کرتے ہیں:

''کنشک راجہ نے یہ حکم دیا کہ ان صحیفوں کو سُرخ تانبے کی تختیوں پر کندہ کرایا جائے۔ اُس نے ان کو پتھروں کے گنجینے میں محفوظ کرایا۔ گنجینے کو سربمہر کرایا۔ ایک ستوپا

تعمیر کرا کے اِسی میں یہ صحیفے رکھے گئے۔ اُس نے یکھشوں کو حکم دیا کہ ملک کے دروازوں کی حفاظت کی جائے تا کہ کسی فرقے کا کوئی شر پسند اِن کو ہاتھ نہ لگا سکے یا چوری کر سکے۔ اُس کا مقصد تھا کہ اس پاک خزانے کا فیض اِسی ملک کے لوگ اُٹھا سکیں“

کنشک کا یہ حکم بڑا فکر انگیز ہے۔ ایسا عظیم ورثہ کشمیر میں چھوڑنا اور اس اُمر کا اظہار کرنا کہ اس خزانے کا فائدہ اسی ملک کے لوگوں کو ہی پہنچنا چاہیئے، بہت سے عالموں کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کنشک کشمیری ہی تھا اور اُس کا فرمان حب الوطنی کا حصہ تھا۔ بہر حال یہ ایک بڑی بحث ہے اور اِس پر پھر کبھی بات کریں گے۔

بعد میں کنشک واپس چلا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ گرمیاں گذار کے جب اس کونسل کی کاروائی کامیاب ہو کے اپنے اختتام کو پہنچی وہ بہت سے مندوب ساتھ لے کر گرم علاقوں کی طرف مراجعت کر گیا جو آج تک کشمیر کے حاکموں اور اُمیروں کی رِیت ہے۔ وہ مغربی دروازے سے چلا گیا یعنی وہی پیر پنچال راستہ جو شوپیاں سے جاتا اور پونچھ جا پہنچتا ہے۔ جانے سے پہلے کنشک مشرق کی طرف مُڑا اور جُھک کر اُپنی تعظیم کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کشمیر کو ریشیوں اور عابدوں کو بخشتا ہے۔

ہیون سانگ کے اس بیان کی تصدیق تقریباً چھ سو سال تک کوئی بھی نہیں کرتا مگر بعد میں Blue Amals اور تبتی عالم تارانا تھ چودھویں صدی عیسوی میں کہتا ہے کہ یہ کونسل کارنکلون یا کنڈل وَن میں منعقد ہوئی۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ ہیون سانگ جہاں بدھ کے آثار کا سراغ اور دیگر ستوپوں کا پورا اتہ پتہ دیتا ہے وہ اُس ستوپا کے متعلق کوئی خبر نہیں دیتا جہاں یہ صحیفہ آسودہ کیا گیا۔ اُس جیسے باہوش اور باذوق زائر سے یہ ستوپا چھپ کے نہیں رہ سکتا

---

[1] اُس وقت بدھوں میں ہُن یان اور مہایان فرقے پہلے ہی موجود تھے علاوہ ازیں خود کشمیر میں بڑے عالم اور عابد ہُن یان کی پُشت پناہی کرتے تھے اور بدھ مت کے دُشمن کنشک کی طاقت اور جبروت دیکھ کر اپنا سر پَروں میں چھپائے بیٹھے تھے، لیکن جوں ہی کنشک گذر گیا اِن میں از سرِ نو جان پڑ گئی اور بقول ہیون سانگ وہ بُدھ مت کی جڑوں کو کاٹنے لگے۔

تھا۔ لیکن اُس نے خاموش میں بھلائی سمجھی ۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یہ بات کیا تھی اُس کی زیادہ کھوج بین کی ضرورت نہیں، وہ خود کہتا ہے کہ اِس وقت بدھوں کی حالت زوال پذیر ہے اور بدُاعتقادی زوروں پر ہے۔ بہت سی بودھ خانقاہیں پہلے ہی منہدم کی گئیں ہیں۔ لگتا ہے کہ بدھ برادری نے قبل ازیں نوُر کے اِس گنجینے کا سراغ اپنے سینے میں دفن کرلیا تھا تا کہ غیروں اور پرُایوں کو اسکا پتہ نہ لگ سکے اور وہ اِسے چھین کے نہ لے جاسکیں۔ اگر چہ اس کے بعد لگ بھگ ایک ہزار سال اہلِ تشعیہ میر شمس الدین عراقی[ا] کے آثار سنبھال کر سینکڑوں برس بعد ظاہر کرسکیں، اُن پرانے ایام کے دوران ایسا اعتقاد رکھنے والے یہ گرُ کیوں نہیں آزما سکتے تھے؟ ہیون سانگ کی خاموشی بامعنی ہے لیکن اس کے باوجود اُسکے مختصر الفاظ میں نوُر کے اِس گنجینے کا سراغ موجود ہے اور آج کے محاورے کے مطابق کہا جاتا ہے کہ اُس نے یہ رمزیہ انداز (In Codes) میں ظاہر کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آمیزی تحریر پرکھا کے اور پہچان کے کون اِس بابرکت رُخ سے نقاب اُلٹ دے۔

-☆-

ہیون سانگ کہتا ہے کہ مہاراجہ کنشک سے قبل مہاراجہ اشوک نے کشمیر کا ملک ریشیوں اور عبادت گزاروں کو سونپا تھا۔ جب اُسکی ارہتوں سے اَن بن ہوگئی۔ اُس نے انہیں دریائے گنگا کے کنڈ پر جمع کرنے کا حکم دیا۔ خیال تھا کہ اُن کو ڈبو کر پانی کی نذر کرے لیکن اُرہتوں نے بھانپ لیا کہ اُن کی جانوں کو خطرہ ہے۔ انہوں نے اپنی روحانی طاقتوں سے کام لیا اور چھپنے کی غرض سے کشمیر اُڑتے اُڑتے پہنچ گئے۔ بادشاہ

ا میر شمس الدین عراقی کا جسد جڈی بل میں آسودہ کیا گیا تھا لیکن میرزا حیدر گورگان (۱۵۴۱-۵۱ء) کے زمانے میں اُن کا جسدِ خاکی سرنگ لگا کے اُٹھایا گیا اور سینکڑوں برس بعد جب حالات سازگار ہوئے تو چاڈورہ میں اُن کو دوسری مرتبہ آسودہ کرنے کے راز سے پردہ ہٹایا گیا۔ اب وہاں ایک زیارت موجود ہے جہاں اُن کے عقیدت مند آتے ہیں۔

نے جب اِس کرامت کا جائزہ لیا تو اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ وہ اُن کو منانے کے لئے کشمیر پہنچا۔ اُن سے معافی کا خواستگار ہوا اور کہا کہ وہ واپس آ جائیں لیکن ارہتوں نے نہیں مانا۔

جب وہ اپنے ارادے پر قائم رہے انہوں نے کشمیر کو بودھ آستانوں کیلئے وقف کیا اور اُن کے لئے پانچ سو خانقاہیں بنوائیں جو ہیون سانگ کے کشمیر آنے تک صرف سو کے قریب رہ گئیں تھیں۔ ایک چینی کتاب کے مطابق مہاتما بدھ خود کہتا ہے کہ کشمیر مہاراج اِندر کا باغِ عیش جیسا بن جائے گا یا بدھ مت کا ایک روشن مرکز[1]۔ صاف ظاہر ہے کہ کشمیر کو ریشیوں اور پیروں کی آماجگاہ یا شارداپیٹھ کہنے کی روایت کتنی قدیم، عظیم اور برمحل ہے۔

کنشک کی بدھ کونسل کا ترتیب دیا ہوا تری پٹکا کشمیر میں ہے اور اس کی بہت پرانی شہادت اور نئے ثبوت موجود ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دُنیا کا سب سے محفوظ راز (Worlds Best Kept Secret) ہے۔ اِس راز کا پردہ کب اُٹھے گا اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں کنشک کی نیک نیتی آڑے آتی ہے لیکن جب بھی وہ وقت آئے گا کشمیر سے تہذیب کا نیا سورج طلوع ہوگا اور پورے عالم کو منور کرے گا۔ جو نُور کے اس سمندر کو نکاسی دے گا اور اِس کے نُور کے میناروں کی زنجیریں کھولے گا اُسے کشمیر میں ایک نئے کشپ ریشی کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ اگر ہم کشمیر کے اس تہذیبی ورثے کی طرف توجہ دیں تو شاید غالبؔ کا یہ شعر ہمارے کانوں میں گونجے گا۔

آتشکدہ ہے سینہ میرا راز نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

اُمیدؔ ہے کہ ہم ایک نہ ایک روز اس سوال کا علامہؔ اقبال کی زبان میں یہ جوابی

---

[1] Lieu-Hua-Miem-Cling

خط بھیج سکیں۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

انشاءاللہ کبھی حقیر بندہ بھی بڑے بڑے شیریں بار بھی برداشت کر لیتا ہے ؎

کب بندوں پر خدا ناز کرے گا

-☆-

ہیون سانگ سال گھوم پھر کر ۶۴۵ء میں واپس چین چلا گیا اُس کا ایک شہنشاہ کا سا استقبال کیا گیا۔ سرکاری تعطیل ہوئی اور جشن منایا گیا۔ بازار سجائے گئے تھے۔ لوگ سڑکوں پر ایستادہ رقص کرتے، گاتے اور ساز بجا رہے تھے۔ اُس کے ساتھ بُدھ مت کی ۶۵۷ کتابیں تھیں۔ گوتم بدھ کی سونے اور چاندی کی، چندن کی اور کرسٹل کی بہت سی مورتیاں اور گوتم کے جسم کے ڈیڑھ سو مستند آثار اور باقیات ساتھ تھیں۔ یہ تمام مقدس توشہ بیس گھوڑوں پر تھا اور اُسے جاہ وحشمت کے ساتھ شہر میں داخل کرایا گیا۔ شہنشاہ تائی ژونگن نے اُسے چُوری چھُپے بھاگنے کا جُرم معاف کیا اور اُسے اپنا رفیق بنا لیا۔ وہ بدھ مت کی کتابیں ترتیب دینے اور بعد میں ان کو ہندوستانی زبانوں سے چینی زبان میں ترجمہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی وہ کتاب جو ہمارے زیرِ نظر ہے ۶۴۸ء میں مکمل ہو گئی۔ اگرچہ نسبی طور کینفوشس کے دین کا ماننے والا تھا مگر وہ ایک عظیم بدھ بزرگ، پرچارک اور علمبردار کی حیثیت سے نِروان کو پہنچا۔ وہ اُس وقت ۶۵ رسال کا تھا۔ اُس کی بڑائی کا اس سے اور کیا ثبوت ہوگا کہ اُس نے جو کتابیں چینی زبان میں منتقل کیں اُن میں سے اکثر کے نام نابود ہو گئے ہیں اور اسی لئے ان کے ترجمہ ہی ان کتابوں کے باقیات ہیں۔ اُسکے سفرنامے اور مشاہدات اُس وقت کے دنیا کے سب سے زیادہ اور مہذب حصے کا احاطہ کرتے ہیں اور اسکے متعلق بہت سی اصل صورتوں میں سچی اور صحیح معلومات فراہم کرتی ہیں۔ بہت سی بدھ عبادت گاہوں میں ہیون سانگ کی مورتیاں نظر آتی ہیں۔ وہ دائیں ہاتھ اوپر کر کے اور بائیں ہاتھ





یون سانگ کے آبائی صوبے میں دنیا کا سب سے [illegible] Sitting Budha
[illegible] ۔



سید رسول پونپر ☆

کشمیر......اوٗ کانگ کی نظر میں

اسے ہماری خوش بختی ہی سمجھئے کہ کشمیر کی قدیم تاریخ کے مطالعہ کے لئے ہمیں مختلف صورتوں میں وافر مواد دستیاب ہے۔ یہاں کے اُساطیری کردار قدیم تاریخی واقعات سے اس طرح جُڑے ہوئے ہیں کہ جیسے اُن کا الگ سے کوئی وجود ہی نہیں۔ وادیٔ کشمیر فطرت کی آغوش میں فلک بوس و برف پوش پہاڑوں سے گِھری ہوئی ہے جو اِس کی منفرد حیثیت کی ناقابلِ تسخیر دیوار بھی ہے۔ ممتاز یورپی تاریخ شناس ایم اے سٹائن بھی اس بات کا معترف ہے کہ قدیم تاریخی تحریریں بیشتر سنسکرت میں دستیاب تھیں اس لئے جو بھی محققین باہر سے آئے اُنہوں نے مقامی تاریخی مواد کو کھنگالنے کی خاطر یہاں کے علماء اور فضلاء خدمات حاصل کیں تاکہ وہ کشمیر کی قدیم تہذیب کے خدوخال کا اُجاگر کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہوسکیں۔ اس لئے جب ہم کسی بیرونی سیاح جو یہاں کبھی کبھار تہذیبی اور ثقافتی سفیر بن کر آئے، کا تذکرہ کریں تو اُس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمارا یہ قطعۂ اراضی مردم خیز نہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بیرونی ممالک سے آئے ہوئے ثقافتی زائرین کے سفرنامے یہاں کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اگرچہ ان حالات میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتے لیکن ممد ضرور ہو سکتے ہیں اور پھر یہ کہ انسان اپنی تصویر دوسروں کی نظر میں دیکھنا فطرتاً پسند کرتا ہے۔ کشمیر اُگلے وقتوں سے علم وآگہی کا گہوارہ رہا ہے اور اسی ناطے بودھ مت کی نشرواشاعت کا اہم مرکز

بھی، یہی وجہ ہے کہ چینی سیاح اؤ کانگ، ہیون سانگ کے بعد گندھارا سے ۷۵۹ء میں وارد کشمیر ہوا جب یہاں راجہ جیاپیڈا (۷۸۲-۷۵۱ء) کی فرمانروائی تھی۔ ایم اے سٹائن اور دیگر یورپی تاریخ شناسوں اور سیاحوں کی تحقیق کے مطابق کشمیر سے متعلق اوّلین حوالے چینی دستاویزات میں ۵۴۱ء سے ملتے ہیں جو ایک ہندوستانی سفیر کے تذکرہ پر مبنی ہیں۔ جو شنگ خاندان کے دَورِ حکومت میں چین پہنچا۔ ان دستاویزات میں جھیلِ وُلر اور وتستا کا ذکر بھی ملتا ہے۔

اؤ کانگ بارہ مولہ کے راستے ہی وارد کشمیر ہوا اگر چہ وہ علمی تبحّر، قوّتِ مشاہدہ اور فکر ونظر میں ہیون سانگ سے مقابلہ نہیں کرسکتا پھر بھی اُس نے اس خطۂ ارضی کے بارے میں قابلِ قدر اطلاعات فراہم کی ہیں۔ اوکانگ نے اپنی تہذیبی سفارت چالیس سال تک جاری رکھی اور پھر مختصراً اپنے مشاہدات کو واپسی پر ضبطِ تحریر میں لایا۔ وہ ۷۵۹ء سے ۷۶۳ء تک کشمیر میں رہا، کشمیر سے متعلق اُس کی اطلاعات و مشاہدات دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت حد تک تفصیلی ہیں۔ اُس کے دَورے کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بودھ بھکشو کے رُوپ میں بودھ وہاروں کی زیارت کے ساتھ ساتھ سنسکرت مخطوطات کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صبح سویرے سے رات گئے تک محوِ مطالعہ رہتا تھا لیکن محنتِ شاقہ کے باوصف اُسے اتنی زیادہ اَدبی بالیدگی نصیب نہیں ہوئی۔ اس بات کا علم ہمیں اُس کے اَپہ بھرنش میں لکھے ہوئے اُس کی نظر میں اہم بودھ وہاروں کے ناموں سے ہوتا ہے اُن میں سے چار کا ذکر تو راج ترنگنی میں ملتا ہے اور باقی دو دیہات کے ناموں کے صورت اجتماعی یاداشت میں آج بھی محفوظ ہیں۔

کِرتی آشرم جس کے لغوی معنی جادو گرنی یا ساحرہ کی قرارگارہ ہے آج بھی کثر ہوم گاؤں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اؤ کانگ اور کلہن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں مہاراجہ اشوک کے بیٹے جلوک کی تعمیر کردہ عبادت گاہ موجود تھی۔ ایم اے سٹائن کے عینی مشاہدے کے مطابق ۱۸۹۶ء میں کثر ہوم کی دو مساجد کے گرد و نواح

میں تراشے ہوئے پتھروں کے آثار موجود تھے۔ کڑ ہوم بارہ مولہ سے ڈور دریائے جہلم (وتستا) کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔

مونگتی وہار کا ذکر اؤ کانگ نے سب سے پہلے کیا ہے۔ یہ وشکر بارہ مولہ کا وہی وہار ہے جو للتا دتیہ مکتا پیڈ (۶۹۹-۷۳۵ء) نے مکتا وہار کے نام سے تعمیر کرایا اور جو مکتا سوامن وہار کے نام سے کلہن کی راج ترنگنی میں جگہ پا چکا ہے۔ یہ چینی سیاح بارہمولہ کے راستے سے کشمیر آیا، اس لئے یہی وہار اُس کی اوّلین زیارت گاہ بھی ہے اور قیام گاہ بھی جس کی بناء پر اس (وہار) کا سرِ فہرست ہونا فطری ہے۔ للتا دتیہ مکتا پیڈ کے نام سے پرہاسپورہ کے راجہ وہار کی تعمیر بھی منسوب کی جاتی ہے۔

راجہ میگھواہن کی چہیتی رانی امرتا پربھا نے بودھ بھکشوئں کے لئے اُمرتا بھون وہار تعمیر کرایا۔ استھاپن آج "وونتہ بھون" کی صورت اختیار کر چکا ہے جو اُمرتا بھون کا کشمیری رؤپ ہے۔ وونتہ بھون سرینگر کے شمال میں پانچ کلو میٹر ڈور وچار ناگ کے قریب واقع ہے۔ یہاں آج بھی اس بودھ وہار کے آثار موجود ہیں۔ اؤ کانگ نے اس کا چینی زبان میں نگو-می-تو-پو-ون- (Ngo.Ni.To.Po.Wan) لکھا ہے۔

للتا دتیہ مکتا پیڈا (۶۹۹-۷۳۵ء) کے ترک نژاد وزیر اعلیٰ نے سرینگر میں دو عالیشان بودھ بھکشو چیانگن وہار تعمیر کرائے۔ اوکانگ نے چینی میں چیانگ کئین (Tsiang Kiun) کے نام سے یاد کیا ہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اوکانگ کی نظر میں دو میں سے کونسا ایک جاذبِ نظر رہا ہوگا۔ البتہ آٹھویں صدی عیسوی میں تُرک کشمیر تعلقات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق کلہن کی راج ترنگنی سے بھی ہوتی ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ گندھار پر حکمرانی کرنے والے یہ راجے تبت نژاد تھے۔ ممتاز عرب سیاح البیرونی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

ہیون سانگ کے بیان کے مطابق ساتویں صدی کی چوتھی دہائی میں اُس کی وادی کشمیر کی سیاحت کے وقت یہاں صرف ایک سو کے قریب بودھ بھکشو وہار موجود تھے، جبکہ اوکانگ (Ou.Kong) نے اُن کی تعداد تین سو سے زائد بتائی ہے۔ اس

کے علاوہ وہ ستوپوں اور مقدس مؤرتیوں کے مقامات کی بھاری تعداد میں موجودگی کا بھی معترف ہے۔اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان دو ثقافتی زائروں کی الگ الگ سیاحت کی درمیانی مدت میں یہاں بُدھ مت کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ راجہ میگھواہن اور للتادتیہ مکتاپیڈا نے بدُھ مت کی نشرواشاعت کے لئے بہت کام کیا۔جیسا کہ اس مضمون کے آغاز ہی میں بتایا جاچکا ہے کہ اوکانگ بڑی صراحت اور سچائی کے ساتھ وادی کشمیر کے جغرافیائی حالات کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ قدرتی طور چاروں اور سے فلک بوس پہاڑوں کی گود میں ہے جن کے درمیان میں سے صرف تین پہاڑی راستے ہیں۔

مشرق میں ایک راستہ تو ٔفان (To.Fan) یا تبت کو جاتا ہے، شمال کی جانب سے ایک راستہ پولیو (Po.Liu) یا بلتستان کا ہے اور مغرب کی طرف سے ایک درہ کپن ٹولو (Kien.to.lo) یا گندھارا کو کھلتا ہے۔صاف ظاہر ہے کہ پہلا درّہ زوجی لا کا ہے۔اس بات کا اعادہ کرنا یہاں بے محل نہیں ہوگا کہ لداخی زبان میں درّہ کے لئے ''لا'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔یعنی زوجی دَرہ، دوسرا راستہ گلگت روڈ کا ہے، جو بالائی کشن گنگا سے ہوتے ہوئے وادی سندھ کو جاتا ہے، تیسرا درہ جو دگد گاٹھ کے نام سے موسوم تھا، بارہ مولہ کا ہے جو وتستا کے کنارے سے ہوتے ہوئے مغرب کی طرف مڑتا ہے۔ ہیون سانگ اسی درّے یعنی باب البحر سے کشمیر میں داخل ہوا۔ وہ اس کا ذکر سنگی (سنگین) دروازہ کے نام سے کرتا ہے۔

یہی درنگ یا پہاڑی چوکیاں اگلے وقتوں سے اس قطۂ ارضی کی پاسبانی کا کام دیتے آئے ہیں۔اوکانگ کو چوتھے درے کا بھی علم تھا، جو عیاں ہے وادی کے جنوب کی طرف درۂ بانہال یا پیر پنچال ہی ہوسکتا تھا، جو اُس وقت صرف شاہی لشکر کی خاطر کھُلا رہتا تھا اور جو آج ہمارے لئے قومی شاہراہ کے ناطے شہ رگ کا درجہ رکھتا ہے۔

اوکانگ کی وادی کی سفارت کے دوران شاید سیاسی وجوہات کی بناء پر ان دَروں سے آمدورفت کو محدود رکھا گیا ہو۔

چین اور ہندوستان کی شمالی ریاستوں کے درمیان سیاسی رشتے اوکانگ کی سیاحت کے فوراً بعد ٹوٹ جاتے ہیں، شاید اس لئے کہ تنگ خاندان کے قدم وسطِ ایشیا میں تبتیوں اور اوگروں کے مقابلہ میں لڑکھڑا رہے تھے۔ اگلی دو صدیوں کے دوران بھی بھی ثقافتی زیارت کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی منزل کا تعین کرنے میں کشمیر کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اُمید ہے کہ انسانی تہذیب کے لین دین اور ارتقاء کا یہ مقدس ثقافتی رشتہ آئندہ بھی مثبت بنیادوں پر قائم رہے گا۔ بالخصوص جب کہ ہمارے ذہنی اور ارضی فاصلے سمٹ چکے ہوں۔

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی!

(اقبالؒ)



قارئین سے گزارش

☞ شیرازہ کے بارے میں اپنی رائے بطورِ خاص مرحمت فرمایئے اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیئے۔

☞ شیرازہ کو اپنے حلقے میں متعارف کرایئے اور خریداری کیلئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجئے۔



ارجن دیو مجبورؔ

مارکو پولو......وسطِ ایشیاء اور کشمیر

وسط ایشیاء دُنیا کا وہ خطہ ہے، جہاں کئی تہذیبیں پنپیں، جہاں کے تمدّنی اُثرات کشمیر کے تمدّن میں آج تک موجود ہیں۔ کشمیر کی تمدّنی روشنی میں عالمی تمدّن کی لہریں سموئی ہیں ۔ اسی لئے اِس تمدن میں رنگارنگی، گُونا گونیت اور تنوع کے ساتھ ساتھ کشمیری تمدّن کی صدیوں پُرانی خصوصیات، روایات اور اِرتقاء کی منزلیں واضح ہیں۔ کِسی شاعر نے خوب کہا ہے:-

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را

اسی بات کو مد نظر رکھ کر اس مضمون میں مارکو پولو اور اُن کے بھائی مٹو (Matto) کے وسطِ ایشیاء کی سیّاحت کے نہایت دلچسپ واقعات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مارکو پولو ولد نکولو پولو وینس میں 1254 عیسوی میں پیدا ہوئے وہ اور اُنکے بھائی مشرقی ممالک میں تجارتی سفر پر روانہ ہوئے۔ اتفاقاً وہ بخار کے راستے کیتھے (Cathay) کے کُبلائی خان کے دربار میں پہنچے ۔ وہ اُن سے خوش ہوا اور اُنہیں پوپ کے پاس بھیج دیا۔ لیکن پوپ وفات پا چکے تھے۔

پولو برادران کی پہلی منزل ہرمز تھی، جہاں سے وہ سمندری سفر پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن خلیج فارس پہنچنے پر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ چین کیلئے خشکی کے راستے سے کرمان، خُراسان، بلخ، بدخشان، کاشغر یارقند، خُتن اور لوپ نار ہوتے

ہوئے چلدیئے۔

قریب سات سو سال قبل کا مارکو پولو اور اُس کے بھائی کا یہ دلچسپ اور پُر از معلومات سفر سرای ڈینسن راس اور الین پاور (Sir E. Denison Ross & Eileen Power) نے ترتیب دیا۔ اس کا ترجمہ پروفیسر رِسی نے سرری۔ ڈینین کے پیش لفظ کے ساتھ انگریزی زبان میں ایل ایف بینی ڈٹو (L. F. Benedetto) کے متن (Text) سے ترجمہ کیا۔ یہ انگریزی ترجمہ ''روٹلیج کیگن پال لمیٹڈ'' (Routledged Keganpal LTD) نے براڈوے ہاوس، کارٹر لین لندن سے شائع کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء، دوسرا ۱۹۳۹ء اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ زیرِ نظر مضمون ۱۹۵۰ء عیسوی کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

اس کتاب میں ''کیشی مُر'' (Keshimur) مطلب کشمیر کا تذکرہ صفحہ ۴۲ اور صفحہ ۶۰۔۵۹ پر آیا ہے جس کا ترجمہ من وعن درج کر رہا ہوں۔

ا۔ صفحہ ۴۲

''نوگودر (Nogodar) اپنے چاچا چغتائی کو جو اُس وقت وسیع آرمنیا میں تھا، چھوڑ کر اپنے دس ہزار بے حد ظالم اور نیچ ساتھیوں کے ساتھ بلشان پو پہنچا۔ ازاں بعد پاشی (Pashi) صوبے سے ہوتے ہوئے کیشُمر (کشمیر) پہنچا جہاں خراب اور تنگ راستوں کی وجہ سے وُہ اپنے آدمیوں اور گھوڑوں کو کھو بیٹھا۔ اس کے بعد وہ صوبہ دَلی وار (Dilivar) پہنچے جہاں اُنہوں نے دِلی وار کے راجا اسی ڈِن سولڈن (Asidin Soldan) کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ تاتاری، ہندوستانی کالی عورتوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کرونا (یعنی کھوئے گئے) کہلائے۔''

''کیشُمر (کشمیر) بھی صُوبہ (Province) ہے جہاں لوگ بُت پرست ہیں اور اُن کی اپنی ایک مخصوص زبان ہے۔ جادوگری سے وہ موسم کو بدل سکتے ہیں اور گھرا اندھیرا پیدا کر سکتے ہیں۔ اپنے جادو اور قابلیت سے وہ ایسے چمتکار (عجوبے) دکھاتے ہیں جن پر تب تک یقین نہیں آتا ہے جب تک نہ ایک آدمی بچشمِ خود دیکھ

لے۔ یہاں سے بحرِ ہند کو جایا جا سکتا ہے۔

مرد گہری چمڑی کے ہیں اور عورتیں اِتنی خوبصورت ہیں جتنی ایک سُرمئی رنگ کی عورت ہوتی ہے۔ اُن کی غذا گوشت، دودھ اور چاول ہے۔ موسم خوشگوار ہے۔ اس خطے میں کئی شہر اور قصبے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں جنگلی اور ریگزاروں کے ساتھ ایسے دشوار گذار درّے ہیں، کہ وہ (لوگ) کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ آزاد ہیں اور اُن کا اپنا راجہ اُن پر انصاف سے حکومت کرتا ہے۔''

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ مارکو پولو نے یہ تاثرات ذاتی مشاہدے پر نہیں بلکہ سُنی ہوئی باتوں پر مرتّب کئے ہونگے۔ اسی لئے کشمیر کے تمدّن اور خوبصورتی پر وہ تفصیل سے بات نہیں کرتا لیکن وسطِ ایشا کے جن شہروں سے اور جنوبی ہند میں جو کچھ اس نے آج سے تریب سات سو برس پہلے دیکھا، اُسی کی تصویر کشی کی ہے۔ ظاہر کہ ان سات سو سال میں ان شہروں کے ناموں اور ترقی و خوشحالی میں زبردست تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی ہونگی، لیکن اسکے باوجود مارکو پولو کا بہت پُرانے زمانے کا سفر دلچسپیوں اور مشاہدے کی گہرائی کا غماز ہے۔

پُرانا فارس (Persia) آٹھ خطوں پر مبنی تھا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱ر کیسوں (Casven)، ۲ر گُردِستان، ۳ر لور، ۴ر سُلِتّان (Sulistan)، ۵ر اصفہاں، ۶ر سیرازی، ۷ر سونگرا (Soncara)، ۸ر ٹونیشیئن (Tonician)۔ فارس کے گھوڑے، عمدہ گدھے اور اُونٹ اُس زمانے میں خاصے مانے جاتے تھے۔ فارس کے مشہور شہر لیسدّی (Yasdi)، کرمان اور کمادیٓ تھے۔ صفحہ ۶۰ پر کشمیر کے لوگوں کی تعریف۔:

صفحہ ۶۰ پر کشمیریوں کے بارے میں کتاب میں مزید کہا گیا ہے کہ:۔

''اُن کے (کشمیریوں کے) رواج کے مطابق ایسے رِشی (سادھو) ہیں جو آشرموں (عبادت گاہوں) میں بھرپور عبادت میں مصروف رہتے ہیں، کھانے پینے میں وہ پرہیز برتتے ہیں اور قانوناً جس کام کو گناہ سمجھا گیا ہو اُس سے وہ انتہائی طور الگ

رہتے ہیں۔ اپنے لوگ اُنہیں بہت پاک سمجھتے ہیں اور آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کافی لمبی عمر پاتے ہیں ۔ یہ مورتیوں کی عقیدت ہی ہے جس سے وہ اتنی پابند اور عابدانہ زندگی گذرتے ہیں۔ان کے اپنے طرح طرح کے مٹھ اور دیوستھان (زیارت گاہ) ہیں جو مختلف عقیدوں سے متعلق ہیں جہاں وہ پابند زندگی گذارتے ہیں، اِن کے سر اُسی طرح مُنڈے ہوتے ہیں جیسے ہمارے ڈومنکنسن (Domnicams) اور اقلیتیں مونڈھتی ہیں۔ اس خطے کے لوگ بھیڑوں اور چوپایوں کو نہیں مارتے اور نہ خُون چھڑکتے ہیں۔ ہاں بِلاشک اُن میں جو عرب رہتے ہیں، وہ گوشت خوروں کیلئے بھیڑ ذبح کرتے ہیں تاکہ انہیں خوراک مہیا ہو۔ ہمارے ملک سے جو موتی برآمد ہوتے ہیں اُنکے لئے وہاں دیگر جگہوں کے مقابلے میں اچھی کھپت ہوتی ہے۔ (یہاں مطلب یورپی ممالک سے ہے)

تاتاری اور کُبلائی خان

۱۱۸۷عیسوی میں جنگس خان تاتاریوں کا بادشاہ بنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے کم سے کم ۸۰ صوبوں پر قبضہ کرلیا۔ تندوس (Tenduce) میں پرسٹر جان (Prester John) سے اُس کی لڑائی ہوئی۔ جان مارا گیا۔ جنگس خان کے بعد کُلی خان بادشاہ بنا۔ تیسرا راجہ نبئوئی خان تھا، چوتھا اَلطّون خان (Alton Khan) پانچواں منگو خان اور چھٹا کُبلائی خان جو اَب حکمران ہے اور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہے۔

۲۰ ہزار سے زائد آدمی منگو خان کے جنازے میں گئے' مارڈالے گئے۔ تاتاری دُودھ، گوشت اور شکار پر زندہ رہتے ہیں۔ وہ دھراہو (Dharaho's rats) کے چُوہے بھی کھاتے ہیں۔ وہ گھوڑی کا دودھ پیتے ہیں۔ کسی بھی قیمت پر وہ دوسرے شخص کی بیوی کو نہیں چھُوتے کیونکہ وہ اس کام کو بے حد کمینہ اور بدنامی کا عمل سمجھتے ہیں۔ ایک تاتاری کئی بیویاں رکھ سکتا ہے، یہاں تک کہ کسی تاتاری کی بیویوں کی تعداد ایک سو تک جاتی ہے۔ پہلی بیوی کو وہ نہایت جائز اور بہترین سمجھتے ہیں۔ دُولہا بیوی کی ماں کو جہیز

دیتا ہے اور عورت ٗمرد کو کوئی جہیز وغیرہ نہیں دیتی۔

تاتاریوں کے دیوتا کا نام ''ناتی گئی'' (Natigai) ہوتا ہے اور اُسے ہر تاتاری گھر میں رکھتا ہے۔ وہ دیوتا کے بچے اور بیوی بھی بناتے ہیں دیوتٗ کے بائیں ہاتھ میں اُسکی بیوی اور اُس کے سامنے دیوتا کے بچے رکھے جاتے ہیں۔ وہ اُنکی بے حد عزت کرتے ہیں جب وہ کھانے بیٹھتے ہیں تو وہ اپنے کھانے کا کچھ حصہّ دیوتا، اُس کی بیوی اور بچوں کے مُنہ میں لگاتے ہیں۔ گھوڑی کے دودھ سے وہ ایک مشروب کیمس (Kemis) بناتے ہیں۔

امیر تاتاری سونے اور چاندی جڑے کپڑے پہنتے ہیں۔ اُن کے ہتھیار تیر کمان، تلوار اور گرز ہیں لیکن وہ بہترین تیز انداز ہیں۔ وہ بھینس کے چمڑے کا بنا زِرہ بکتر پہنتے ہیں۔ لڑائی میں وہ بہادری سے لڑتے ہیں اور اُپنے سرداروں کے بے حد وفادار ہوتے ہیں۔

فوج اور گھوڑے

تاتاریوں کی فوج میں گھوڑوں کے دَس، ایک سو، ایک ہزار، دس ہزار اور ایک لاکھ کے دُستے ہوتے ہیں۔ دس ہزار کو تومان (Toman) اور ایک لاکھ کو ٹک (Tuc) کہتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ بِنا کھائے یا آگ جلائے دس دِن تک لگاتار سفر کر سکتے ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر خشک دُودھ یا گھوڑے کے خون کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ لڑائی میں بھاگنے سے نہیں جھجکتے اور دُشمن پر مختلف اطراف سے حملہ کرتے ہیں۔ اُن کے پاس تربیت یافتہ گھوڑے ہوتے ہیں اور بھاگتے وقت وہ تیر چلاتے رہتے ہیں۔ چیزیں چُرانے والے عادی شخص پر وہ ۱۷، ۲۷، ۳۷، ۴۷ یا ۱۰۷ کوڑے مارتے ہیں۔ کئی لوگ اس طرح کی سزا سے مر جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص گھوڑا چُراتا ہے یا کوئی ایسا ناجائز کام کرتا ہے جسکی سزا موت ہے تو تلوار سے اُس کے دو حصّے کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی چور چُرائی گئی چیز کی قیمت کا نو گنا اَدا کرے تو اُسے موت کی سزا نہیں دی جاتی جو کسی کو زخمی کرتا ہے، اُسے بھی سزا کے طور پر اُسی طرح زخمی کیا جاتا ہے۔

گھوڑے اور بھیڑوں کو پہچان کیلئے داغا جاتا ہے (یہ عمل کچھ عرصہ کیلئے کشمیر میں بھی جاری تھی)

ایک عجیب رسم

ایک مری ہوئی لڑکی کی شادی، ایک مرے ہوئے لڑکے کے ساتھ کی جاتی ہے۔شادی کا انعقاد باضابطہ طور کیا جاتا ہے۔ دعوت دی جاتی ہے اس کے بعد گوشت آسمان کو پھینکا جاتا ہے۔ پھر شادی کے اقرارنامے کو جلایا جاتا ہے اور اُس کا دھواں دوسرے عالم کو بھیجا جاتا ہے تا کہ لڑکی اور لڑکے کو اس بارے میں معلوم ہو اور ایک دوسرے کو خاوند اور بیوی سمجھیں۔ اسکے علاوہ وہ ایک کاغذ پر غلاموں، گھوڑوں، کپڑوں، زیورات وغیرہ کی تصادیر بنا کر اُسے جلا دیتے ہیں جس سے یہ چیزیں دوسرے عالم میں لڑکے اور لڑکی تک پہنچ سکیں۔

چندوُ (Chandu) میں کُبلائی خان کا بانس محل

''مصنف کے موجب کُبلائی خان نے ۱۶ میل لمبی پارک بنا کر، دیواروں سے گھری پارک میں جہاں خوبصورت جنگل بھی ہے، بانس کا ایک محل بنایا ہے۔ یہ ایک طرح کا منڈپ (Pavilion) جس میں منقش کھمبے لگے ہوئے ہیں۔ہر کھمبے کے اُوپر حصے پر ایک بڑا اژدھا جسکی دُم مٹھی (Shaft) کی اور مڑی ہوئی ہے۔ سر بھی اُس طرف کو ہے اس کی دو ٹانگیں دائیں اور بائیں طرف نکلی ہیں جو چھت کو سہارا دے رہی ہیں اندر سب کچھ روغن کئے ہوئے ہے، جس میں وحشی جانوروں اور پرندوں کی تصاویر ہیں جو کاری گری کا نمونہ ہیں۔ چھت بانس کی ہے اس پر وارنش چڑھایا گیا ہے تا کہ بارش کا پانی اندر نہ جاسکے۔ یہ محل نما منڈپ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ (آس پاس) لیا جاسکتا تھا۔

اس منڈپ کو دوسو ریشمی رسیوں سے جوڑا گیا تھا۔ کُبلائی خان ماہ جون، جولائی اور اگست میں اس منڈپ نما محل میں رہتا تھا۔ ۲۸/ اگست کے دِن خان اپنی دس ہزار گھوڑیوں کے حاصل کردہ دودھ میں سے کچھ حصّہ یہاں چھڑکتا تھا۔ کشمیری اور

تبت بُت پرست، خان کے محل سے بادل ہٹانے کا عجیب کام سرانجام دیتے تھے۔ یہ لوگ جادو اور دوسرے کو جادوگری سے قابو کرنے ہنر دُنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان میں دانا جادوگر جنہیں ''بکسی'' (Bacsi) کہتے ہیں جادو سے خان کی میز سے شراب کے پیالے اُٹھوا کر دوبارہ اُسکے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ یہ سب جادو دس ہزار لوگوں کے سامنے دکھایا جاتا ہے۔

یہ لوگ اپنی مورتیوں کی عبادت کرتے ہیں۔ کسی کی عورت کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھیڑتے۔ چٹائیوں پر سوتے ہیں یہ سخت سے سخت زندگی گذارتے ہیں اتنی سخت جس کا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے۔ ان کی مورتیں اور زیارتیں مؤنث ذات کی ہیں۔

''۱۲۵۶ء میں کُبلائی خان ۸۵ سال کا تھا اور حکومت کر رہا تھا۔ کُبلائی خان کا مطلب ہوتا ہے ''سرداروں کا سردار'' خان کی چار جائز بیویاں ہیں۔ ہر ملکہ کے دربار میں دس ہزار اشخاص ہیں .... اپنی چار ملکاؤں سے خان کے بائیس لڑکے اور داشتاؤں سے ۲۵ بیٹے ہیں۔

راجدھانی کیتھے (Cathay) میں شاہی محلات

خان کیتھے میں رہتا ہے جسے ''کیمب لک'' (Cambaluc) کہتے ہیں۔ شہر کے اِرد گرد ۸ میل کی چوکور دیواریں ہیں۔ دیواروں کے ساتھ ایک گہری گھائی ہے۔ ہر طرف اندر آنے کیلئے ایک ایک دروازہ لگا ہے جن سے شہر کے بیچ آتے ہیں۔ اندر اندر آتے ہی ایک میل بھر کی جگہ پر خان کو فوج رہتی ہے۔ اسکے بعد آپ کو ۲۴ میل لمبی دیوار سے گذرتے ہیں یہ دیوار چوکور ہے۔ اسکے اندر خان کا محل ہے۔ لیکن محل تک پہنچنے کیلئے دو دیواروں کی قطاروں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ہر کونے میں ایک خوبصورت اور شاندار محل بنا ہے، جہاں خان کے جنگی ہتھیار رکھے گئے ہیں اَندرونی محل کے ہال خوبصورت عورتوں اور درباریوں کی تصاویر سے بھرے پڑے ہیں۔ سب سے بڑا ہال اتنا وسیع اور لمبا ہے کہ اس میں چھ سو آدمی دعوت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ محل میں اتنے کمرے ہیں کہ یقین کی حدیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ محل کی روغن سازی میں سِندوری عام

سبز، نیلا پیلا اور دیگر رنگوں کو کام میں لایا گیا ہے اس کے علاوہ محل کے پیچھے بڑے مکان، ہال اور کمرے ہیں جن میں خان کی ذاتی چیزیں، جیسے اُس کے سبھی خزانے، سونا، چاندی، جواہرات، موتی اور سونے چاندی کی طشتریاں رکھی ہوئی ہیں۔ اسی جگہ اُسکی بیویاں اور داشتائیں رہتی ہیں۔ اِس حرم خانے میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔

بیرونی دو دیواروں کے بیچ عمدہ پیڑوں سے بھری چراگاہیں ہیں۔ یہ مختلف قسم کے چوپایوں سے پُر ہیں۔ محل کی سڑکوں پر کیچڑ کا نام ونشان نہیں۔

محل کے شمال کی جانب تھوڑی دوری پر دو دیواروں کے بیچ خان نے ایک پہاڑی پر ایسے درخت لگوائے ہیں جنکے پتے کبھی گرتے نہیں اور ہمیشہ تروتازہ رہتے ہیں۔ دُنیا کے بہترین پیڑ اِس پہاڑی پر موجود ہیں۔ پہاڑی ہرے گردے سے پُر ہے اور اسے ''ہری پہاڑی'' (The green hill) کا نام دیا گیا ہے۔ پہاڑی کے اُوپر ایک ہرے رنگ کا محل دکھائی دیتا ہے۔ دیواروں کے بیچ ایک گہری اور چوڑی مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ ایک طرف ایک نالے میں کئی طرح کی مچھلیاں ہیں۔ ایک اور جھیل میں تانبے اور لوہے کی جالیوں کے نیچے مچھلیاں ہیں جو باہر نکلنے سے روکی گئی ہیں۔ یہاں پاس میں آبی مُرغ اور بطخیں بھی ہیں۔

خان نے اپنے ایک بیٹے کیلئے ایک اور محل بنایا ہے۔ اُس کے پاس (شاہی) بیل اور مُہر سلطنت بھی ہے۔ لیکن اِس کے استعمال کی اجازت اُسے نہیں دی گئی ہے۔

خان نے ایک نیا شہر (Taidu) بسایا ہے۔ یہ ۲۴ میل کے گھیرے میں ہے اور مُربع ہے۔ یہاں شہر کی محافظ فوج رہتی ہے۔ پُرانے اور نئے شہر میں 25 ہزار رنڈیاں ہیں جو پیسہ دیکر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ٹکسال

تُوت کے درختوں کی چھال کو گوند کے ساتھ ملا کر ایک طرح کا کاغذ بنایا جاتا ہے۔ اس کا رنگ کالا ہوتا ہے اور اس پر خان کی مُہر ڈالی جاتی ہے۔ پھر اِسکا غذ کو کاٹ کر اِسکے سِکے بنائے جاتے ہیں۔ ان ٹکڑوں پر خان کے مختلف حاکم سیندوری

رنگ کی مہریں ڈالتے ہیں۔اس کے بعد یہ ٹکڑے جائز مانے جاتے ہیں۔اگر کوئی اس طرح کے سِکّے چوری سے بنالے تو اُسے سخت ترین سزادی جاتی ہے۔جب یہ ٹکڑے پھٹ جاتے ہیں یاپُرانے ہوجاتے ہیں تو ٹکسال سے ان کے بدلے نئے حاصل کیئے جاسکتے ہیں۔

مصنف یہاں ایک بینک نوٹ کا ذکر کرتا ہے جو چین کا ہے اوراُس وقت چین پر بادشاہ ہُنگ وو (Hung-wu) کی حکومت تھی یہ 1368ء سے 1398ء تک چین کا حکمران رہا۔خان کے پاس اِتنی دولت ہے کہ دُنیا کے سبھی شاہزادوں کے پاس اتنی نہ ہوگی۔

<u>خان کی حکومت کا ڈھانچہ</u>

۱- کونسل نمبر ایک ۔یہ بارہ حاکموں پر مشتمل ہے۔یہی جنگ کا فیصلہ لیتے ہیں اور مراکز اور کمانڈروں کی تبدیلی کا حکم دیتے ہیں۔

۲- کونسل نمبر ۲ ر یہ لوگ کیمبلک شہر میں رہتے ہیں ۔۱۲ تعلقہ دار ۳۴ صوبوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ہر صوبے کے لئے ایک جج مقرر ہے۔وہ اوراُس کے منشی ۱۲ تعلقہ داروں کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔وہی ۳۴ صوبوں کے سبھی گورنروں کو خان کی رضامندی سے مقرر کرتے ہیں ان بارہ تعلقہ داروں کو شینگ (Shieng) اوراُن کے محل کو بھی اسی نام سے پُکارا جاتا ہے۔

گھوڑوں کے پڑاؤ یَنب (Yanb) کہتے ہیں۔گھوڑوں کے پڑاو ۳۵ سے ۴۰ میل کی دوری پر تعمیر کیئے گئے ہیں۔ان پڑاؤں میں دولاکھ گھوڑے تیار رکھے جاتے ہیں ان جگہوں پر دس ہزار شاہی محل تعمیر کیئے گئے ہیں۔لوگ چاول اور جَو کھاتے ہیں۔گندم کی پیداوار زیادہ نہیں ہوتی۔

<u>پیدل دوڑنے والے پیغام رساں</u>

پیدل دوڑنے والے پیغام رساں تین میل تک دوڑتے ہیں۔اس فاصلے کے

بعد دوسرا پیغام رساں تیار رہتا ہے۔ اِس طرح خان کو دس دن والے سفری مقام کی خبر فقط چوبیس گھنٹے میں مل جاتی ہے۔ یہ پیغام رساں کبھی کبھی دس دن کے سفر کے مقام سے ایک دن میں تازہ پھل خان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ ہر تین میل کے فاصلے کے بعد ایک منشی پیغام رساں کا دن اور وقت نوٹ کرتا ہے۔ ہر ماہ بعد اس رجسٹروں کو دیکھا جاتا ہے اور جس پیغام رساں نے دیر کی ہو اُسے سزا دی جاتی ہے۔ ان سبھی پیغام رسانوں اور منشیوں کو خان باضابطہ تنخواہ دیتا ہے۔

گھوڑسوار پیغام رساں:

کسی بھی بغاوت کی خبر خان تک پہنچانے کے لئے گھوڑسوار پیغام رساں موجود ہیں جو 200 سے 250 میل کا فاصلہ ایک دن میں طے کرتے ہیں۔ ہر دوسرے پڑاو پر گھوڑے تیار رہتے ہیں۔ گھوڑسوار کے بگل (Bigule) بجانے پر نیا گھوڑا حاضر کر دیا جاتا ہے۔ گھوڑسوار ایک دم چھلانگ لگا کر گھوڑے کو نہایت تیز دوڑا لیتا ہے۔ گھوڑسواروں کو کافی انعامات دیئے جاتے ہیں۔

اگر موسم کی خرابی، بیماری یا ٹڈیوں کی وجہ فصلیں خراب ہوں تو کسانوں سے خان کے لئے لے جانے والا اخراج معاف کیا جاتا ہے اور اُنہیں کھانے کے لئے اناج دیا جاتا ہے۔ اگر بجلی گرنے سے بھیڑوں کا ریوڑ یا دوسرے چوپائے تباہ ہوں تو خان تین برس کے لئے ''ٹتھ'' (Tithe) یعنی مالیہ وصول نہیں کرتا۔

سڑکوں کے دونوں اور ہر دو قدم کی دُوری پر درخت نصب کیئے گئے ہیں۔ پیش گوئی کرنے والوں نے خان کو کہہ رکھا ہے کہ جو پیڑ لگاتا ہے اُس کی عمر لمبی ہو جاتی ہے۔

''کیتھے'' صوبے میں چاولوں سے شراب کشید کی جاتی ہے۔ لوگوں کی خاص تعداد یہاں شراب پیتی ہے۔ اس صُوبے میں کالا پتھر جلانے کی لکڑی کی جگہ کے کام آتا ہے۔ یہ پتھر سستے ہیں۔ اس لئے وہ جلانے کیلئے ان سے کام لے کر لکڑی بچا لیتے ہیں۔

بہت سا اناج سٹاک کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے دام نہ بڑھیں۔ غریبوں اور حاجتمندوں کو اناج اور کپڑے سال بھر کے لئے مُفت مہیا کیئے جاتے ہیں۔

جوتشیوں اور پیش گوئی کرنے والوں کو کھانا اور کپڑے بِنا دام کے دیئے جاتے ہیں۔جنتری کوٹکونی (Tacuini) کہا جاتا ہے۔یہ ''سال بھر کیا ہونے والا ہے'' اُس کی تفصیل دیتی ہے جن کا کہنا سچ کے قریب ہوتا ہے انہیں عزت افزائی کی جاتی ہے۔کسی بھی اچھے کام یا سفر وغیرہ کیلئے ساعت دیکھنا ضروری ہے۔یہ کام جوتشی کرتے ہیں (کشمیری پنڈتوں میں ٹیکنی زائچے کو کہتے ہیں اور ان کی جنتریوں میں مختلف کاموں یعنی شادی، مکان میں داخل ہونا، سفر پر جانا، مکان خریدنا اور دیگر کئی اہم کاموں کیلئے ساعت مقرر کیئے گئے ہوتے ہیں)۔

پُلسین گن (Pulisangin) نام کا دریا ''کیتھے'' شہر سے دس میل دُور بہتا ہے۔اس پر سنگ مرمر کا ایک پُل بنا ہے جس پر سے دس گھوڑے ایک ساتھ قطار میں جاسکتے ہیں۔

ریشم

کیتھے شہر کے پار مغرب کی جانب ''جونجو'' سے دس دِن کا سفر طے کر کے ''تو انفو'' (Taiuanfu) کا شہر آتا ہے اور اسکے بعد کئی خوبصورت شہر اور قصبے آتے ہیں جن میں تجارت اور صنعت کاری ہوتی ہے۔خوبصورت کھیت اور شاندار وائن یارڈوں (Wineyard) کی کوئی کمی نہیں۔شراب ''کیتھے لے جائی جاتی ہے۔اس خطے میں بہت سے شہتوت کے درخت ہیں جن کے ذریعے ریشم حاصل کیا جاتا ہے۔اس خطے کا دریا ''کارموران'' (Karamoran) ہے۔اس علاقے میں سونٹھ اور ریشم کی خوب پیداوار ہوتی ہے۔

ان شہروں کے نام ''کین جن فو'' (Kangenfu) اور کُن کُن (Cun Cun) ہے۔کُن کُن شہر کے لوگ کھیت اور جنگل کے پھلوں اور شکار پر گذارہ کرتے ہیں۔

مارکوپولو کے مطابق جن علاقوں اور خطوں یا صوبوں میں ریشم کی پیداوار ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:۔

ا۔ تُرکمانیہ ۲۔ جارجیا ۳۔ کوئی چو (Kuci-chou) ۴۔ ''تو نانفو''

(Tanunafu)۵/ کین جن فو (Kenjanfu)۶/ گن گن (Cun Cun)۷/ کچن نو ۸/ چگلی ۹/ پنجو ۱۰/ پو ینگ ہرلین، (Pao- Yung - Hersien) ۱۱/ ابن چنگ ۱۲/ چن چیانگ، ۱۳/ چن چاوو ۱۴/ سُو چو ۱۵/ وُ گہن (Vughin)۱۶/ چیوچ (Chio-ch)۱۷/ پُو جُو اور کن سائی (Kinsai)، جہاں کافی ریشم پیدا ہوتا ہے۔

اُوپر کے ناموں سے ظاہر ہے کہ ان میں کئی چینی علاقے ہیں۔ ویسے بھی ماہرین کا کہنا ہے کہ چین ہی وہ ملک ہے جہاں ابتدا میں ریشم کی دریافت ہوئی اور اس کے بعد وسطِ ایشیا، کشمیر اور دیگر ممالک میں اس کی صنعت پھیل گئی۔

وسط ایشیا کا قدیم شہر کنسائی (Kinsai)

''اس شہر کے ایک طرف نہایت تازہ اور صاف پانی والی جھیل ہے اور دوسری طرف ایک بڑا دریا ہے جو شہر کے ہر حصے میں کئی چھوٹی بڑی نہروں کیساتھ بہتا ہے۔ ان سے شہر کی گندگی باہر کی طرف بہتی ہے۔ شہر میں بے شمار پتھروں کے پُل ہیں جن کی تعداد بارہ ہزار؟ تک جاتی ہے۔ پُلوں کے نیچے سے کشتیاں چلتی ہیں اور گاڑیاں اور گھوڑے ان کے اوپر سے چلتے ہیں۔ شہر سے باہر ایک کونے پر ۴۰ میل لمبی کھائی ہے۔'' بارہ ہزار پُلوں کی بات سُن کر آپ حیران نہ ہوں کیونکہ یہ شہر اگر کہا جائے تو پانی پر ہی بسا ہوا ہے اور شہر کے مختلف حصوں میں جانے کیلئے اتنے پُلوں کی ضرورت ہے۔ ۴۰ میل لمبی کھائی سابقہ بادشاہوں نے اس لئے بنائی تھی کہ دریا میں آیا طغیانی کا پانی کناروں کے اوپر نہ آ کر اِسی کھائی میں جمع ہو، یہ کھائی شہر کو تحفظ (Defence) دینے کا کام کرتی ہے۔ اس لمبی کھائی سے جو مٹی نکالی گئی ہے اُس سے شہر کے اردگرد ایک لمبی پہاڑی بنائی گئی ہے۔ سامنے کی سڑک ۴۰ قدم چوڑی ہے جو شہر کے ایک سرے سے دُوسرے تک جاتی ہے۔ ہر چار میل کے بعد بڑے بڑے چوک دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کے بیچ والی نہر پر پتھروں کے گودام بنائے گئے ہیں جہاں سارے ہندوستان اور دیگر ممالک کے تاجر اپنا مال اور بیچنے کی اشیاء جمع رکھتے ہیں۔ چالیس سے پچاس ہزار لوگ روزانہ کھانے اور دیگر اشیاء بیچنے کیلئے شہر میں آتے

ہیں۔ یہ لوگ حسب ذیل جانور اور پرندے بیچنے کیلئے لاتے ہیں:۔
ہرن، بارہ سنگھا، خرگوش، کھر ہرا، طوطے، مُرغے، بطخ، کُل ہنس، خصی مُرغ، مچھلیاں اور جانوروں کے پَر۔

اس شہر میں ذبح خانے قائم ہیں جہاں بچھڑے، بیل، میمنے وغیرہ ذبح کئے جاتے ہیں۔ یہ امیر لوگ کھاتے ہیں لیکن نچلی ذات کے لوگ ناصاف گوشت پر گذارہ کرلیتے ہیں۔ بازاروں میں کچھ سبزیاں بھی ملتی ہیں۔ نہایت عمدہ کشمش اور شراب باہر سے آتی ہے۔ شاہانہ زندگی بسر کرنے والے جو خاصی تعداد میں ہیں، گوشت اور مچھلی ساتھ ساتھ کھاتے ہیں۔

سبھی چوکوں پر باتھ روم بنے ہوئے ہیں جہاں مرد اور عورت نوکر موجود رہتے ہیں تاکہ وہ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ نہلا سکیں۔ سال بھر سرد پانی ہی نہانے کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن غیر ملکیوں کیلئے گرم پانی بندوبست بھی ہے۔

دوسرے بازاروں میں اتنی رنڈیاں رہتی ہیں کہ میں تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے۔ وہ سارے شہر میں رہتی ہیں۔ اُنکی پوشاک عمدہ ہے اور وہ کئی عطریات کا استعمال کرتی ہیں۔ اُن کے کئی نوکر ہوتے ہیں اور وہ اچھے سجے سجائے مکان میں رہتی ہیں اور اپنی نظروں اور میٹھے بولوں سے لوگوں کی خاطر تواضع کرتی ہیں۔

شہر میں روازنہ ۲۲۳ پونڈ کالی مرچ کا استعمال ہوتا ہے۔

تجارت پیشہ لوگ

شہر میں بارہ بیوپار منڈل قائم ہیں۔ ہر منڈل میں بارہ ہزار ورک شاپ ہیں۔ ہر ورک شاپ میں کم از کم دس کاریگر کام کرتے ہیں۔ کچھ میں تو تیں سے چالیس تک ورک شاپ (چھوٹے کارخانے) قائم ہیں۔ امیر لوگ اپنے ہاتھوں سے کوئی کام نہیں کرتے ہیں جیسے وہ راجے ہیون (Maugi) ہوں۔ بادشاہ کے دور میں کسی شخص کو اپنے باپ کے پیشے سے کوئی دیگر پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔

شہر کے قریب ایک جھیل کے دو جزیروں پر عجیب وغریب محل بنے ہوئے

ہیں۔ اگر کسی کو شادی کی دعوت دینا ہو یا کوئی پارٹی دینی ہو تو وہ ان محلوں میں جہاں ضروری سامان مہیا ہے، جاکر ان کا استعمال کر سکتا ہے۔

عیش اُڑانے کی کشتیاں (ہاوس بوٹ)

عیش اور سیر پر جانے والے لوگوں کیلئے بڑی اور چھوٹی کشتیاں موجود ہیں۔ اگر ایک شخص اپنے دوستوں سے یا عورتوں کے ساتھ لُطف لینا چاہے تو وہ اُن کشتیوں میں سے ایک کرایہ پر لے لیتا ہے۔ ہر بوٹ پر چھت کے نیچے سامنے کی طرف خالی جگہ (Deck) ہوتی ہے جہاں لمبے ڈنڈے (Poles) لیکر آدمی کھڑے رہتے ہیں کشتی کی اندرونی چھت مختلف رنگوں سے مُنقش (Painted) ہوتی ہے اور اس پر مختلف شکلیں بنی ہوتی ہیں اور اسی طرح دیگر حصّوں پر بھی روغنی تصاویر ہیں۔ کشتی کی سیر اور کھڑکیوں سے مناظر دیکھنے میں بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے۔ لوگ جب مہلت پاتے ہیں تو وہ بازاری عورتوں (Public-women) کے ساتھ جھیل کی سیر کا لطف لیتے ہیں۔ لوگ گاڑیوں میں شہر میں گھومتے رہتے ہیں۔

شہر میں لکڑی کے مکانات کی وجہ سے آگ کی وارداتیں عام ہیں۔

شہری اور اُنکی زندگی

شہری بُت پرست ہیں اور یہاں کاغذی کرنسی رائج ہے۔ وہ ہر طرح کا گوشت یہاں تک کہ کُتے اور ناصاف ماس بھی کھاتے ہیں۔ اس طرح کا چلن عیسائیوں میں نہیں ہے۔

اس شہر (کنسائی) کے مرد اور عورتیں گورے رنگ کی اور خوبصورت ہیں۔ ریشم مہیا ہونے کی وجہ سے شہریوں کی اکثریت ریشم کے کپڑے پہنتی ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ بادشاہ کی تربیت کی وجہ سے امن پسند ہیں۔ وہ ہتھیار چلانا نہیں جانتے اور نہ ہی وہ کوئی ہتھیار اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ آپ، لوگوں کسی طرح کے جھگڑے اور تشدد آمیز اختلاف رائے نہ دیکھتے ہیں اور نہ سُنتے ہیں۔ وہ اپنی صنعتیں اور تجارت کافی دیانتداری سے چلاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے محبت سے پیش آتے ہیں۔

نیک خواہشات جو یہاں کے مردوں اور عورتوں میں موجود ہیں اُسکی وجہ سے سارے کا سارا شہر ایک ہی خاندان سا لگتا ہے۔ یہاں کے لوگ عورتوں پر شک نہیں کرتے اور نہ اُن سے کسی قسم کا حسد رکھتے ہیں بلکہ اُنہیں نہایت قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں۔ بِلا شک جو مرد اپنی عورت کیساتھ بے ہودہ باتیں کرتا ہے اُسے غنڈہ تصوّر کیا جاتا ہے۔

غیر ملکیوں اور بیوپاریوں پر شہر کے لوگ مہربان ہیں۔ وہ اُنہیں اپنے گھروں میں کھِلاتے پِلاتے ہیں اور تجارتی معاملات میں اُنہیں نیک مشورہ بھی دیتے ہیں۔

اس کے بعد مصنّف پھر شہر کے بارہ سو پُلوں کی بات کرتا ہے۔ شاید قارئین کو یہ باور کرانے کیلئے کہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں، وہ کہتے ہیں:

''بارہ ہزار پُلوں پر فی پُل دس محافظوں کا دستہ تعینات ہے۔ وہ ایک چھت تلے پانچ دِن کو اور پانچ رات کو پہرہ دیتے ہیں۔ ساٹھ ہزار محافظوں کو ڈیوٹی پر اس لئے لگایا جاتا ہے تاکہ شہر کو بدکاروں اور کسی بھی بغاوت سے بچایا جاسکے۔

ہر سٹیشن پر ایک کلاک اور ایک طرح کی لکڑی کی چھتری ہوتی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جائی جاسکے۔ اس میں ایک گھڑیال ہوتا ہے۔ محافظوں میں سے ایک محافظ ہر ایک گھنٹے کے بعد گھڑیال بجاتا ہے۔ دو بجے کا وقت ہو تو گھڑیال کو دوبارہ بجایا جاتا ہے، اسی طرح چوبیس گھنٹے یہ کام ہوتا ہے اور محافظ کبھی سوتا نہیں بلکہ ہمیشہ خبردار رہتا ہے۔

جونہی محافظ کہیں آگ لگی ہوئی دیکھتے ہیں تو وہ جھیل کی کشتیوں میں بیوپاریوں کا مال بچالیتے ہیں۔ شہر میں ایک میل کی دُوری پر ایک مٹی کے ٹیلے پر بنے لکڑی کے ٹاوروں پر، آگ لگتے ہی، اطلاعاتی بورڈ لگائے جاتے ہیں۔ بازار اور سڑکیں پتھروں اور پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ خاص سڑک (Main Road) عمدہ پتلی بجری سے بنی ہے اور بڑی نالیوں سے جو پتھر اور پختہ اینٹوں سے بنی ہیں بارش کا پانی خارج ہوتا ہے۔''

غسل خانوں کا دوبارہ ذکر کرتے ہوئے سفرنامے میں کہا گیا ہے کہ اس شہر میں تین ہزار غسل خانے ہیں اور یقیناً یہ ساری دنیا میں بہترین اور بڑے غسل خانے ہیں۔

شہر کے لوگ بہت صاف رہتے ہیں۔

صوبہ گینڈو (GAINDU)

اس صوبے کی عجیب روایتیں ہیں۔ اگر کسی شخص کے گھر میں کوئی مہمان، اُس کی بیوی، لڑکی، بہن یا گھر کی کسی عورت کے ساتھ بدمعاشی کرے تو اُسے بُرا نہیں مانا جاتا ہے بلکہ ایسے غیر ملکی کی ستائش کی جاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس سے اُن کے دیوتا اور مورتیں اُنہیں زندگی کی ضرورتیں کافی تعداد میں مہیا کرینگی۔ غیر ملکی مکان کے باہر ایک نشانی لٹکا دیتا ہے اور گھر والا تب تک گھر میں نہیں جاتا جب تک نہ باہر کا آدمی خود ہی اُس نشانی کو ہٹا نہ دے۔ قصبوں اور اُن دیہات میں جو پہاڑوں پر ہیں اور سڑک کے قریب ہیں، خوبصورت عورتیں رکھنے والے مرد اپنی عورتوں کو وہاں سے گزرنیوالے سوداگروں کو پیش کرتے ہیں تا کہ وہ اُن سے لُطف اندوز ہوں۔ اس علاقے میں سِکوں کے بدلے نمک کی ''پاؤ روٹی'' (Loaf) جس پر خاؔن کی مہر لگی ہو لین دین کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ پچاس سے ساٹھ ایسی نمک کی روٹیاں (قلچے) سونے کی ایک چھوٹی چھڑی کے برابر ہوتی ہیں۔ سونا یہاں سستا ہے کیونکہ اس کے خریدار بہت کم ہیں۔ مچھلیاں، شیر، ریچھ، ہرن، ہرنیاں اور طرح طرح کے پرندے یہاں پائے جاتے ہیں۔ چاول اور گندم سے شراب بنائی جاتی ہے۔ یہاں ''لونگ'' (Cloves) کی خاصی پیداوار ہوتی ہے۔ زنجبیل، دار چینی اور دیگر مصالحے یہاں اچھی کوالٹی کے مل جاتے ہیں۔

صوبہ کارجان (KARJAN)

اس صوبے میں سونے کا گردہ ملتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں جو کافی لمبے ہیں اور آپ اُن کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اور اگر وہ جڑواں ہوں جب کہ سُنا گیا ہے، تو وہ زیادہ ہیبتناک دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دس قدم لمبے ہیں۔ اُن کا سر کافی بڑا ہوتا ہے اور اُن کی آنکھیں ایک وڑے (Loaf) سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں۔ وہ اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ کوئی بھی شخص یا حیوان اُن سے

خوفزدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ زمین کے اندر رہتے ہیں اور رات کے وقت باہر آکر کسی بھی جاندار کو دبوچ لیتے ہیں۔ وہ دریاؤں، جھیلوں، اور چشموں پر پانی پینے جاتے ہیں اور رینگنے سے گہری لکیر بناتے ہیں۔ سپیرے دھاردار جال لگا کر پانی والی جگھوں کے قریب اِنہیں پکڑ لیتے ہیں۔

سانپوں کے جگر (Liver) کا زہر عورتوں کو خلاصی (بچہ دینا) کے لئے دیا جاتا ہے۔ باولے کُتے کے کاٹے اور ٹیومر (زہریلا پھوڑا) کے علاج کے لئے بھی یہ زہر استعمال ہوتا ہے۔

سانپوں کا مانس لذیذ ہونے کی وجہ سے کھایا جاتا ہے۔ اس صوبے سے گھوڑوں کو ہندوستان میں بیچنے کے لئے لیا جاتا ہے۔ گھوڑوں کی دُم کاٹ لی جاتی ہے۔ قیدی اور مجرم (مرد اور عورتیں) زہر ساتھ رکھتے ہیں اور حاکم نجاست کھلا کر اُس سے یہ زہر اُگلواتے ہیں، ایسا کئی بار ہوا ہے۔ خان کی حکومت سے پہلے یہ لوگ عمدہ شکل وصورت والے پرائے اشخاص کو مار دیتے تھے۔ ایسا اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُن کا پیسہ یا چیزیں چُرالیں بلکہ اُس کی دانائی اور برکت گھر میں رہ سکے لیکن اس بُرائی کو انہوں نے اَب تَرک دیا ہے۔

صوبہ زردندان

اس صوبے کا خاص شہر ''ووچن'' ہے۔ لوگ اپنے دانتوں پر سُنہری پلیٹیں مڑھتے ہیں۔ ایسا مرد ہی کرتے ہیں عورتیں نہیں۔ مرد اپنے جسم پر تِلوں کا ہونا اچھا شگن سمجھتے ہیں۔ سبھی لوگ کافی شریف ہیں۔ وہ مقابلہ بازی اور شکار کھیلنے کا کام کرتے ہیں۔

جب کوئی عورت کسی بچے کو جنم دیتی ہے تو اُس کا خاوند بستر میں داخل ہو کر بیس یا اس سے زیادہ دنوں کے لئے نوزائدہ بچے کی خبر گیری کرتا ہے۔ دوست اور رشتہ دار آکر بے حد خوش ہو کر جشن مناتے ہیں۔

لوگ کچّا اور پکایا ہوا گوشت کھاتے ہیں۔ چاول کے ساتھ گوشت (پلاو) کھانے کا بھی رواج ہے۔ یہ لوگ دیگر غذائی اشیا اپنے طور طریقوں پر بنا کر کھاتے

ہیں۔ چاول اور مصالحوں سے اچھی قسم کی شراب بنا کر پی جاتی ہے۔ پیسے کے لئے اُن کے پاس سونا ہے لیکن پروسلین شل (پروسلین کی کھوٹی) کا استعمال بھی سکے بدلے چلتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس نہ بُت ہیں اور نہ گرجا گھر۔ لیکن وہ اپنے خاندان کے مکھیا (جس نے خاندان کو شروع کیا ہو) کی عبادت کرتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی رسم الخط ہے اور نہ کسی طرح کی لکھائی کا چلن۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ یہ لوگ دشوار گزار خطوں، بڑے جنگلوں، وسیع پہاڑوں میں پیدا ہوئے ہیں اور اگر موسم گرما میں کوئی غیر ملکی اس خطے میں جائے تو وہ خراب موسم کی وجہ سے بچ کر نہیں آ سکتا۔

کارجان، ووچن اور یاچی میں خون چوسنے والی جونکیں علاج کے لئے دستیاب ہیں۔ بیماروں کو ٹھیک کرنے کے لئے جادوگر بُلائے جاتے ہیں۔

سمرقند

سمرقند ایک عظیم اور شُرفائ کا شہر ہے۔ یہاں باشندے، عرب اور عیسائی ہیں۔ یہ لوگ ''کن'' (Kann) کے بھتیجے کی رعایا ہیں۔ یہ شہر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہاں شاندار باغات اور ایک میدان ہے جو ہر طرح کے پھلوں سے بھرا پڑا ہے۔ (سمرقند کے مختصر ذکر سے لگتا ہے کہ مارکو پولو یہاں زیادہ دیر نہیں رہا اس لئے وہ یہاں کے بے شمار اور قسم وار گلابوں، آبشاروں وغیرہ کا ذکر نہیں کرتا)۔

یارقند

یہاں باشندے حضرت محمدؐ کی شریعت کے پابند ہیں۔ یہاں کچھ نیسٹورین (Nestorian) عیسائی بھی رہتے ہیں۔ ہر چیز بہتات سے دستیاب ہے۔ بہت سے لوگوں کے دو پیروں میں سے ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اچھی طرح چل پھر لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے گلے میں گھینگے (Goitre) بھی ہیں جس کی وجہ یہاں کا پانی ہے۔ یہاں کپاس کی پیداوار ہوتی ہے۔

خُتن

یہاں ہر چیز کی بہتات ہے۔ روئی (کپاس) کی پیداوار کافی ہوتی ہے۔ پٹ

سن، گندم اور لینن کا کپڑا بنانے کا دھاگا بھی پیداوار میں شامل ہے۔ یہاں بہت سے کھیت، انگور کے بغیچے (Wine yards) اور باغات ہیں۔ لوگ صنعت وتجارت پر گزارہ کرتے ہیں۔ وہ جنگجو نہیں ہیں۔

یہاں پر مارکو پولو لُوپ (Lop) ریگستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی لمبائی ایک سال میں اور چوڑائی ایک ماہ میں طے کی جاسکتی ہے۔

ہند، جاوا، مالابار

مارکو پولو ہند کے بڑے جہازوں کا ذِکر یوں کرتے ہیں:-

''یہ لکڑی ......یعنی کایرُو، اور دیوار سے بنتے ہیں۔ جہاز کے اوپر والے چھت کے نیچے کافی کھلی جگہ (Deck) ہوتی ہے۔ ان میں کئی جہازوں میں اُوپر کی چھت تلے ساٹھ کیبن (cabin) ہوتے ہیں جن میں بیوپاری بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ ان جہازوں میں ایک پتوار (Rudder) اور چار مستول ہوتے ہیں۔ بڑے جہازوں میں تیرہ کمپارٹمنٹ ہوتے ہیں۔ جہاز کو ڈوبنے سے بچانے کی خاطر اِن میں ایک سے دوسرے کمپارٹمنٹ میں پانی داخل نہیں ہوتا۔ جہاز مضبوط ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اردگرد دوہرے تختے ہوتے ہیں۔ ان جہازوں کو لوہے کی بڑی کیلوں، چونے، کُٹی، پٹ سَن اور ایک خاص پیڑ کے تیل سے جو بطور روغن استعمال ہوتا ہے، تیار کیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے جہازوں کے لئے ڈیڑھ سو سے تین سو جہاز رانی عملے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جہاز یورپی جہازوں کے مقابلے میں زیادہ سامان اُٹھاتے ہیں۔ ہند کے جہاز اتنے بڑے ہیں کہ یہ کالی مِرچ کے پانچ ہزار سے چھ ہزار تک کے ٹوکرے اُٹھا سکتے ہیں ان کو چلانے کے لئے چپُو استعمال ہوتے ہیں۔

بہت لمبے جہازوں کے ساتھ دو یا تین چھوٹے جہاز ہوتے ہیں۔ ان کے چلانے کیلئے ساٹھ سے ایک سو تک جہاز رانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے جہاز ایک ہزار کالی مرچ کے ٹوکرے اُٹھا سکتے ہیں۔

جاوا کا بڑا جزیرہ

کئی جہاز رانوں کے مطابق یہ دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ ایک بادشاہ کی ملکیت ہے۔ لوگ بُت پرست ہیں اور وہ کسی کو خراج نہیں دیتے۔ یہ جزیرہ کافی مالدار ہے۔ یہاں مرچ سیاہ اور اِلا ئچی سے لیکر ہر طرح کے مصالے دستیاب ہیں۔ جہازوں کی بھاری تعداد بیو پاریوں کو لیکر یہاں آتی ہے جو یہاں کے مصالے وغیرہ خرید کر کافی منافع کماتے ہیں۔ اس جزیرے میں دولت کا اندازہ لگانا مُشکل ہے۔ قُبلائی خان سفر نے خطرات اور دُوری کی وجہ سے اِس جزیرے کے لوگوں کے ساتھ تجارت سے کافی پیسہ کمایا ہے اور آج بھی کمار ہے ہیں۔ دُنیا بھر میں مصالوں کا سب سے بڑا حصہ اِسی جزیرے سے آتا ہے۔

مالابار

مالابار کی عجیب وغریب رسموں کے بارے میں مارکوپولو رقمطراز ہے:۔

۱۔ یہ لوگ بُت پرست ہیں۔

۲ جب کوئی راجا مر جاتا ہے تو اُس کا وارث اُسکے خزانے کو چھُوتا تک نہیں، بلکہ وہ اپنے لئے خود اپنا خزانہ بھرتا ہے۔

۳۔ ایک مُجرم اپنے آپ کو اپنی ایک مخصوص عقیدت والی مورتی کیلئے خنجروں سے ماردیتا ہے۔

۴۔ ستی کی رسم یہاں قائم ہے (اَب یہ ختم کردی گئی ہے)۔

۵۔ وہ بیل کو کبھی نہیں مارتے۔ بلکہ اِسکی اِفادیت کے پیش نظر اسکی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ خود مر جائے تو وہ اس کا گوشت کھالیتے ہیں۔

۶۔ بادشاہ اور درباری سب زمین پر بیٹھتے ہیں اور اسکی عزت کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہم اسی زمین سے پیدا ہوئے ہیں اور مر کر ہمیں اِسی میں جانا ہے۔

۷۔ گوی (Gavi) ذات کا کوئی بھی شخص اُس جگہ داخل نہیں ہوتا، جہاں ایس۔ ٹی تھامس دفن ہیں۔

۸۔ اس سلطنت میں ماسوائے دھان کے کوئی فصل پیدا نہیں ہوتی۔

۹۔ وہ بھیڑ وغیرہ خود نہیں مارتے بلکہ اس کے لئے ایک خاص ذات کے لوگوں کو بُلایا جاتا ہے۔

۱۰۔ وہ صُبح شام نہائے بغیر نہیں رہتے اور بغیر نہائے کھانا نہیں کھاتے۔ جو نہاتا نہیں، اُسے نیچ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۱۔ گندے کاموں جیسے تھنوں اور چوتڑ کی صفائی بائیں ہاتھ سے کی جاتی ہے

۱۲۔ لوگ ایک دوسرے کا پیالہ استعمال نہیں کرتے۔ یہاں کے لوگ مشروبات پیتے وقت پیالے کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ نہیں لگاتے بلکہ اِسکو اونچا رکھ کر اپنے مُنہ میں ڈالتے ہیں۔ اگھر کسی پرائے کو پانی وغیرہ پلانا ہو اور اُسکے پاس پیالہ نہ ہو تو مشروبات یا پانی اُسکے ہاتھو پر ڈالا جاتا ہے۔

۱۳۔ قاتلوں، چوروں اور مُجرموں پر قانون سختی سے لاگو ہے۔

۱۴۔ اگر کوئی قرضدار قرضہ ادا نہیں کرتا اور بار بار تاکید کے بعد اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو قرض خواہ قرضدار کے اِرد گرد ایک دائیرہ کھینچتا ہے۔ اگر قرضدار ایک دِن میں قرضہ ادا کرنے کی ضمانت فراہم نہ کرے تو اُسے قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے جو موت ہوتی ہے۔ ایک ایسا واقعہ خود مارکو پولو کو ایک بیوپاری کے ساتھ پیش آیا۔ مقدمہ راجا تک پہنچا۔ پولو نے قرضہ ادا کیا اور لوگوں نے راجہ کے اس سلوک کی تعریف کی۔

۱۵۔ لوگوں کی اکثر تعداد شراب نہیں پیتی۔ ایک شرابی کی گواہی یا ضمانت تسلیم نہیں کی جاتی۔

۱۶۔ کسی طرح کی شہوت پرستی کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔

۱۷۔ شدت کی گرمی کی وجہ سے لوگ بِنا کپڑوں کے آتے جاتے ہیں۔ جون، جولائی اور اگست کے سوا یہاں بارش نہیں ہوتی۔

۱۸۔ وہ بے حد شخص شناس ہیں۔ جونہی وہ کسی پر اپنی نظریں گاڑھتے ہیں، اُس کے اوصاف کو بھانپ لیتے ہیں۔

۱۹۔ وہ اچھے اور بُرے شگونوں کے بارے میں انکشاف کرنے میں ماہر ہیں۔

۲۰۔ اگر کوئی شخص سفر پر جانے والا ہو. اور وہ کسی کو چھینکتے سُنے تو وہ ایک دم نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ اگر چھینکنے والا دُوسری بار نہ چھینکے تو وہ اپنا سفر مُلتوی کر دیتا ہے۔

۲۱۔ تیرہ برس کی عمر میں بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے کچھ پیسہ دیکر چھوٹے قسم کی تجارت پر لگایا جاتا ہے۔

۲۲۔ اس خطے میں عجیب وغریب پرندے اور مویشی ہیں۔

۲۳۔ گھوڑوں کو پُلاو (چاول وگوشت کا) اور دیگر کھانے کھلائے جاتے ہیں۔

۲۴۔ مورتیوں کے سامنے کھانا رکھا جاتا ہے اور انکے سامنے ناچا جاتا ہے۔

۲۵۔ عورتوں کی چمڑی سخت ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے سِکے کی خاطر وہ ایک مرد کو سخت سے سخت چکوٹی (Pinch) لینے کی اجازت دیتی ہیں۔ ان کی چھاتیاں، شادی کے بعد بھی سخت رہتی ہیں۔

۲۶۔ دن کے مقابلے میں رات کے سفر کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ دِن میں شدّت کی گرمی پڑتی ہے۔ اگر کسی مُسافر کو نیند آئے تو وہ اپنا تھیلا اپنے سر کے نیچے رکھ کر سڑک کے ایک طرف سو جاتا ہے۔ اگر اُس کی کوئی چیز نیند کے دوران چوری ہو جائے تو اِس کی بھرپائی کی جاتی ہے۔ مارکو پولو کے مطابق یہ سب باتیں مالا باریوں کی کتابوں میں لکھی ہیں۔

(Lar) لار۔ برہمنوں کا صوبہ

یہ مالا بار میں ایک صوبہ ہے۔ مارکو پولو یہ یقین دلاتے ہیں کہ یہ براہمن دُنیا کے سب سے زیادہ قابلِ بھروسہ بیو پاریوں میں سے ہیں۔ وہ کسی بھی قیمت پر جھوٹ نہیں بولتے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اُس میں مکمل صداقت ہوتی ہے۔ بیرونی بیو پاری اُنہیں تجارت کا کام سونپتے ہیں۔ وہ اُن کے لئے بیو پار کرتے ہیں اور اسکے لئے اُنہیں جو کچھ دیا جاتا ہے، اُسے قبول کرتے ہیں، ان کے بارے میں مارکو پولو نے حسبِ ذیل تفصیل دی ہے:۔

۱۔وہ گوشت نہیں کھاتے اور نہ شراب پیتے ہیں۔

۲۔اپنی روایات کے مطابق ایک صاف وشفاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

۳۔کسی پرائی عورت سے تعلق (ناجائیز) نہیں رکھتے۔

۴۔کبھی گناہ کے مُرتکب نہیں ہوتے اور نہ جاندار کو مارتے ہیں۔

۵۔سبھی براہمن زُنار پہنے رہتے ہیں اور یہی اُنکی پہچان ہے۔

۶۔وہ سورج کے نیچے اپنا سایہ ماپ کر ہی کوئی سودا کرتے ہیں۔

۷۔انکے دانت ایک جڑی کے کھانے سے بہت اچھے رہتے ہیں۔یہ جڑی ہاضمے اور جسم کو تندرست رکھنے کیلیئے بہت موزون ہے۔

۸۔دُنیا بھر میں یہ براہمن زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں اِسکی وجہ کم خوری ہے۔ان میں ایک 'چگھی' ذات کے لوگ ہیں جو150 سے دوسوسال کی عمر پاتے ہیں۔

۹۔یہ لوگ نہایت تنومند وہ صحت مند ہیں۔اسکی وجہ کم کھانا اور طاقتی غذا کا استعمال ہے۔اور گندھک کا مشروب پیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس سے عمر لمبی ہوتی ہے۔

۱۰۔یہ لوگ بیل کا گوبر جلاتے ہیں۔اگر راستے میں کوئی اِن کا استقبال کرے تو وہ اسی راکھ کو اُس کی بھوؤں پر ملتے ہیں۔

۱۱۔یہ لوگ پیڑ کے بڑے، سوکھے پتوں پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہرے پتّے وہ استعمال میں نہیں لاتے کیونکہ اُنکا کہنا ہے کہ اِن پتوں میں بھی روح ہوتی ہے۔یہاں تک کہ وہ کوئی بھی ہری چیز جب تک نہ وہ خود سوکھ جائے، کھانے کیلیئے استعمال نہیں کرتے۔

۱۲۔یہ لوگ بَرت (فاقہ) رکھتے ہیں اور دن بھر سوائے پانی پینے کے کچھ نہیں کھاتے۔

۱۳۔یہ لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں اور ایسے اشخاص کو عبادت گاہوں کا چارج دیتے ہیں جنہوں نے خوبصورت عورتوں کو چُھوا تک نہ ہو۔

ایشیر کا شہر (Eshier)

عدن کی بندرگاہ سے چارسومیل کی دوری پر''ایشیر'' کا شہر واقع ہے۔یہاں سے جہاز اور سوداگر واپس ہند کا سمندری سفر طے کرتے ہیں۔اس شہر میں بہت اچھے

گھوڑے جن پر دوزین (Saddle) کسے جاسکتے ہیں، ملتے ہیں۔ یہاں بغیر کانوں کے بھیڑ ملتے ہیں اِنکے کانوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سینگ ہوتے ہیں۔

بیل، بھیڑ، گھوڑے، اونٹ اور مچھلیاں کھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سارا خطہ بنا گھاس کے ہے، اِس لئے یہ دُنیا کا بے حد خشک علاقہ ہے۔ جو مچھلیاں مویشی کھاتے ہیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں اور مارچ اپریل مئی کے مہینے میں کافی مقدار میں دستیاب ہوتی ہے۔ اِن مچھلیوں کو سُکھا کر سردیوں میں مویشیوں کو کھلایا جاتا ہے۔ لیکن مویشی اِنہیں زندہ کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بڑی مچھلیوں سے لوگ لذیذ ''مچھلی بسکٹ'' بناتے ہیں۔

اس طرح نہ جانے مارکو پولو نہ کتنے برس اس لمبے سفر میں صرف کئے اور کتنی عجیب باتوں کا مشاہدہ کیا۔ کئی رواج جو وسطِ ایشیا سے متعلق ہیں کشمیری پنڈتوں میں ابھی تک جاری ہیں۔ تمدنی اور تہذیبی سمندر میں جوار یں اُٹھتی ہیں وہ نہ جانے کہاں کی ثقافت کہاں لے جاتی ہیں۔ آپسی تجارت، میل جول، مہم بازی، دُور دراز ممالک کا سفر اب بھی ہوتا ہے لیکن اس میں وہ قدیم جوش اور تجسس دکھائی نہیں دیتا۔

۱۱راگست ۲۰۰۳ء ایکسلیشر (Excelsior) روزنامے کے مطابق بُخارا جیسے خوبصورت شہر میں روس کے بٹوارے کی وجہ سے نہیں جایا جاسکتا حالانکہ اگر کوئی کچھ خوبصورت دیکھنا چاہے تو وہ بُخارا ہے۔ وسطِ ایشیا کے نہایت عمدہ شہروں میں بُخارا میں محرابدار مساجد، ان سے وابستہ سکول، گول گول بازار اور پُر اسرار صحن، سفر پر نکلے شخص کے لئے ایک خواب ہی تو ہیں۔

مارکو پولو کا نام آئندہ آنے والی نسلوں تک ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ اُس نے اُن عجائبات کو دیکھا ہے جس میں سے اب بہت موجود ہیں۔ اُس نے لوگوں کو خوب دیکھا پرکھا اور بغیر کسی جھجک کے وہ سب کچھ ضبطِ تحریر میں لایا جس پر اُس زمانے کے لوگوں کو یقین تھا۔ وسطِ ایشیا سے کشمیر کے رشتے اِتنے گہرے ہیں کہ اُن کی جڑیں آج تک ہماری خوبصورت ریاست میں موجود ہیں۔

☆☆

مرغوب بانہالی☆

البیرونی اور کشمیر

ساتویں صدی عیسوی میں طلوعِ اسلام کے ساتھ ہی دُنیا میں اِنسانی تہذیب کا وہ روشن دَور شروع ہوگیا جس نے علم واَدب کے حصول اور پھیلاؤ کو اپنی سب سے پہلی اور سب سے بڑی ترجیح بنانے والے ایسے دَرجنوں ممتاز محقق، مؤرخ، مترجم اور اعلیٰ پایہ قلمکار دُنیا کو دیئے جنکی بصیرت اور وسعتِ دِلی سرزمینِ مشرق کے علاوہ اندھیروں میں پڑے ہوئے یورپ جیسے دُور براعظموں میں بھی کئی طرح کی روشنی پھیلانے کا باعث بن گئی۔ تحقیق وتنقید کی روشنی پھیلا کر اِنسانی دل اور دماغ کو حصولِ علم کے لئے سرگرم بنانے میں مسلمان عالموں میں سے خاص امتیاز سرزمینِ عرب سے تعلق رکھنے والے اُن اعلیٰ پایہ محققوں اور دانشوروں کو حاصل ہے جو قرآن حکیم کی زبان کے ساتھ اور قرآنِ حکیم پیش کرنے والے اُس نبیِّ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زُبان عربی کے ساتھ نزدیکی اور قربتِ خاص رکھتے تھے اور جو دوسروں سے پہلے اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ علم حاصل کرنے اور علوم کو پھیلانے کے لئے جتنی تاکید اکیلے اُس نبیِّ اُمی اور خاتم النبین کہلانے والے رحمۃً للعالمین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، اتنی تاکید اُن سے پہلے گذرے ہوئے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار اولوالعزم پیغمبروں نے مل کر بھی نہیں کی ہے۔ اُسی تاکید کے تناظر میں خلافتِ راشدہ سے شروع ہوگئی ہوئی علوم کی آبیاری اگلی تین صدیوں

☆ عمر کالونی (اے) لال بازار سرینگر کشمیر

میں جو کمالات مختلف مشرقی ممالک میں دِکھاتی ہے، وہ اُن ملکوں میں چھوٹے بڑے ہزاروں مراکز قائم ہونے سے عبارت تھی۔ جہاں اُن مرکزوں کا مشترکہ ماٹو رسولِ محترم نبی امیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے تاکیدی الفاظ کو عملی جامہ پہنانا تھا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان خاتون پر فرض ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے اگر چین جیسے کسی دُور اُفتادہ اور پرایا لگنے والے ملک میں بھی جانا پڑے تو دوسروں سے پہلے تم ہی یہ کام انجام دینا۔ کیونکہ اللہ نے علم و حکمت کو خاص طور پر تمہاری نورانی میراث قرار دیا ہے۔ وہاں اُن مرکزوں میں سے خاص امتیاز حاصل کرنے والے مقامات میں بغداد اور غزنیہ کا نام تاریخوں میں سُنہری حروف سے لکھا ملتا ہے۔ بغداد (عراق) کو علم و ادب کا خاص مقام بن جانے کی فضیلت اُس خلافتِ عباسیہ کے دور میں حاصل ہوگئی جس کے ساتھ خلیفہ ہارون رشید جیسے ممتاز علم دوست خلیفہ کا تعلق تھا اور غزنیہ (افغانستان) کو علم و اُدب کی آبیاری کرنے والا مقام بن جانے کی فضیلت امیر سبکتگین اور یمین الدولہ محمود غزنوی کے اُس دَور میں خصوصیت کے ساتھ حاصل ہوگئی جس کے ساتھ فردوسیؔ اور فرخیؔ جیسے شعراء اور بیہقیؔ جیسے مورّخ کے علاوہ البیرؔونی جیسے ممتاز محقق اور مترجم کا تعلق رہا ہے۔

البیرؔونی کا پورا نام ابوریحان محمد ابن احمد البیرؔونی تھا البتہ ،نسبت کا تلفظ 'ر' حرف کے ماقبل یای معروف کو چھوڑ کر بھی ''اُلبِرونی'' کے طور پر کیا جاتا ہے۔

البیرونی سال 973ء کے دوران خوارزم (موجودہ خیوا) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوگیا تھا۔ اپنے ہی علاقے میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کافی دیر دَرس و تدریس کے ذریعے روزگار کماتا رہا۔ لیکن اَپنی خداداد صلاحیتوں کو مشہور فاتح اور علوم و فنون کے عظیم سرپرست سلطان محمود غزنوی (1030ء۔997ء) کے دربار میں پہنچا کر کئی اُونچائیوں کو چھونے کا ریکارڈ بنانے سے بھی پیچھے نہ رہا۔ اگرچہ اُس کے دربار میں فارسی زبان واَدب کی آبیاری کے لئے ہر صاحبِ اقتدار امیر اور وزیر سرگرم ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ہی ملک الشعراء عُنصریؔ چارسو شاعروں کے کلام

کی اصلاح کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور ایک ہی فردوسی جیسا شاعر ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہنامہ مکمل کرنے پر کمربستہ ہوگیا تھا۔ پھر بھی سُلطان محمود خود عربی زبان واَدب کا دامن مالامال کرانے کی طرف خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ یہ اُسی خاص توجہ کا نتیجہ تھا کہ البیرونی اپنے عظیم اَدب نواز شاہ کا اِشارہ پاکر ہندوستان جیسے دُور اور پرائے ملک میں گہری تحقیق انجام دینے، سنسکرت اور ہندومت کی ساری باریکیاں جاننے کے لئے کئی سال وقف کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ سالہا سال کی محنتِ شاقہ سے کام لے کر نہ صرف ہندوستان میں شامل علاقہ جات بلکہ اس کے قُرب وجوار میں واقع بہت سے علاقوں میں رائج مذہبوں، فلسفوں، اَدب پاروں ریاضی دانوں، نجومیوں، کیمیا گروں، جغرافیہ دانوں اور دانشوروں اور اُن کے کارناموں کی بہت ہی مُفید اطلاعات بہم پہنچانے والا پہلا مسلمان عالم بن گیا اور مشہور چینی سیاح فاہیان سے زیادہ وقیع علمی اساس ہندوستان شناسی کیلئے قابلِ ستائش بنا سکا۔ بلکہ جو بے تعصبی مقدمہ ابن خلدون کے حوالے سے مسلمان اسکالروں کا طرہ امتیاز رہی ہے اُس کا ایک بڑا علمبردار یہی البیرونی تھا۔ اِس کا اعتراف اُن لوگوں نے بھی کیا ہے جو اہلِ اسلام کے سرکردہ لوگوں پر ایک یا دوسرا الزام لگانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ بقولِ کشمیری شاعر ؎

ونان یم اَسہِ متعصب چھو، فلاَنی
چھِ کِتیاہ بے تعصب تم، اَسان چھس

یعنی جو لوگ ہمارے کسی آدمی کو متعصب قرار دیتے ہیں وہ خود کتنے بے تعصب ہیں مجھے اس پر ہنسی آتی ہے۔ البیرونی پر تعصب کا کوئی الزام لگانے کے بجائے ایڈورڈ سی سچو کا انگریزی ترجمہ Alberuni's India دو ضخیم جلدوں کے ساڑھے آٹھ سو صفحات پر چھپنے والی ایٹلانٹک پبلیشرز اینڈ ڈسٹی بیوٹرس نامی پبلشرز بھی اُسکی بے تعصبی کا اعتراف ان الفاظ میں کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں:-

"It can be visualized from Alberuni's account that he was conscious of not allowing a place to the religious

enthusiasm, bordering of fanaticism and the racial superiority complex in his survey and due to this character the account made by Alberuni has proved to be the best among the records made by the foreigner".

(Cover Jacket)

یعنی البیرونی کی نگارشات کا مطالعہ کر کے خود اِس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شعوری طور پر اس بات پر عمل کرتا گیا ہے کہ نہ اپنی تحریر میں وہ کسی مذہبی جوشیلے پن کو کوئی جگہ دے، نہ علاقائی وطن پرستی کی عصبیت کو اپنائے اور نہ کسی قسم کے نسلی احساس برتری کو اپنی عبارت پر حاوی ہونے دے۔ اس قسم کا روّیہ اپنانے کی بدولت ہی البیرونی اپنے اِس کارنامے کو اُن سب اندراجات میں بہترین اور ممتاز بنا سکا ہے جو غیر ملکی سیاحوں نے اس علاقے سے متعلق یادگار چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر ایڈورڈ سچو کے ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے مذکورہ پبلشرز نے اس بات کا بھی خاص خود اعتمادی سے اظہار کیا ہے کہ البیرونی کے اس کارنامے کا گہرا مطالعہ اُن سب محققوں کے لئے ناگزیر ہے جو قدیم ہندوستان پر کوئی سنجیدہ کام کرنا چاہتے ہوں پبلشرز کے الفاظ یہ ہیں:-

This book is an indespensible source work to the scholars researching on ancient India.

بُنیادی طور پر آسان اور فصیح عربی میں لکھی گئی البیرونی کی عالمگیر شہرت والی اس کتاب کے مذکورہ ترجمے کے اٹھارہ صفحوں پر کشمیر کا ذکر جستہ جستہ کیا گیا ہے جس کا خلاصہ کچھ اِس ڈھنگ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

''کشمیر ایک سطح مرتفع یعنی پھیلے ہوئے زمین کے اُس ہموار ٹکڑے پر واقع ہے جو چاروں طرف ناقابلِ عبور اُونچے پہاڑوں سے گھِرا ہوا ہے۔ اس ملک کے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر ہندو راج کرتے ہیں۔ البتہ اِس کے مغربی علاقوں میں سے کچھ حصے بولر شاہ کے قصبے میں ہیں کچھ حصے شگنن شاہ کے قصبے میں اور کچھ بہت دُور اُفتادہ حصے جو بدخشاں کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں وہ اِس وقت وخان شاہ کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ کشمیر کے شمالی علاقے اور چند مشرقی علاقے ان تُرکوں

کے زیرِ عنان ہیں، جن کا تعلق ختن اور تبت کے ساتھ ہے۔

کشمیر کے باشندے بُنیادی طور پر پیدل چلنے والے ہیں۔ اُن کے پاس اچھی سواری کے قابل حیوانات اور ہاتھی موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اِن کے علاقائی سردار ایسی پالکیوں میں سوار ہوکر اُدھر اِدھر جاتے ہیں جن کو ''کٹ'' کہا جاتا ہے اور جن کو کندھا لگا کر (چار) آدمی چلاتے ہیں۔ کشمیر کے لوگ اپنے ملک کی مضبوط قدرتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بڑے مُتفکر نظر آتے ہیں اِس لئے وہ آس پاس کے دَرّوں سے وارد ہونے والوں کے داخلے پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ ان حالات میں کشمیریوں کے ساتھ تجارتی رابطے بڑھانے کا کام خاصا دُشوار دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے دنوں تک وہ اِکا دُکا بعض غیر ملکیوں کو خصوصاً یہودیوں کو اندر آنے کی اجازت دیتے تھے لیکن اب یہ اُن ہندوؤں کے داخلے کو بھی گوارا نہیں کرتے جن کو وہ پوری طرح سے جانتے نہ ہوں دوسری قوموں کے داخلے کی بات ہی نہیں۔

کشمیر میں داخل ہونے کا بہترین راستہ جس کو بہت سے لوگ جانتے ہیں وہ ہے جو اُس ببرہن قصبے سے گذرتا ہے جس کی ایک طرف سے دریائے سندھ اور دوسری طرف سے دریائے جہلم بہتا ہے۔ تب یہ راستہ اُس پُل کے پاس پہنچاتا ہے جو کُسناری اور محوی نام کی اُن ندیوں کے سنگم کے پاس واقع ہے جو دونوں شاملان نام کے پہاڑوں سے نکل کر جہلم کے ساتھ مِلتی ہیں۔ وہ پُل مذکورہ قصبے سے آٹھ فرسخ کی دوری پر واقع ہے۔

اِس مقام سے پانچ دِن کا پیدل سفر کر کے آدمی اُس گھاٹی میں پہنچتا ہے جسکے سِرے پر جہلم دریا کا منبع واقع ہے۔ اِس گھاٹی کے دوسرے سِرے پر نگرانی کا دِوار نامی پڑاؤ آتا ہے۔ وہاں اِس دریا کے دونوں کناروں پر جانچ پڑتال کا خاص انتظام ہے، گھاٹی کا حصہ ختم ہوجانے کے بعد آدمی وادی میں پوری طرح داخل ہوجاتا ہے۔ جہاں سے کشمیر کے دارالحکومت ''ادشتان'' تک پہنچنے میں اور دو دن لگتے ہیں۔ اِس راستے پر چلتے ''اُشکر'' نامی اس گاؤں سے گذرتا ہے جو بارہمولہ کی طرح دو

کناروں پر واقع ہے''۔ کشمیر کی اُس وقت کی وسیع وعریض قلمرو اور خاص راستے کی طرف اِس کے فکر انگیز اشارے کرنے کے بعد البیرونی دسویں صدی عیسوی میں کشمیر کے شہر خاص یا دارالخلافہ کے پھیلاؤ کو یوں نشاندہی میں لاتا ہے:-

''کشمیر کا شہر (ادشتان) چار فرسخ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اِس کے اندر مکانات جہلم کے دونوں کناروں پر اِس طرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کئی پُلوں اور لوگوں کو آر پار لیجانے والی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں دریائے جہلم ہرماکوٹ پہاڑوں کی معاون ندیوں سے قوت حاصل کرتا ہے وہاں دریائے سندھ ایسے یخ بستہ اور ناقابل گذر خطوں سے حصولِ قوت کرتا ہے جہاں برف گھل کر کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ اصل میں اُس کے معاونوں کی پُشت پر مہاچین کھڑا ہے۔ اپنے منبع سے نکل کر جب جہلم پیدل چلنے والوں کے دو دن کا سفر طے کرتا ہے تب وہ ادشتان شہر کے بیچ سے گذرتا ہے۔ پھر جب یہ اور چار فرسخ کا فاصلہ طے کرتا ہے تو یہ ایسی دلدلی زمین سے گذرتا ہے جو تقریباً ایک فرسخ پر پھیلا ہوا ہے۔ لوگوں نے اس دلدل والے رقبے پر بھی درخت لگا رکھے ہیں لوگوں کو اِن میں سے اپنے حصے کے درخت آسانی سے الگ کرنا آتے ہیں۔ اِس دلدلی زمین سے نکلنے کے بعد ہی جہلم اُشکر گاؤں سے ہوتا ہوا اُس گھاٹی میں داخل ہوتا ہے جس کا ذِکر اُوپر کیا گیا ہے'' ص ٦٠٢۔

البیرونی کشمیر کے موسموں کے بارے میں رقمطراز ہے۔

''خطۂ کشمیر میں (ہندوستان کے دوسرے خطوں کی طرح کا) برساتی بارشوں والا کوئی زور دار موسم نہیں ہوتا۔ البتہ یہاں سردی کے ڈھائی مہینوں کے دوران کبھی کبھی اچھی خاصی برفباری ہوتی رہتی ہے۔ برفباری کا آغاز یہاں کے ماگ مہینے میں ہوتا ہے۔ البتہ جب چیترا (ژِتھر) مہینے کے نصف سے زیادہ کچھ دن گذرتے ہیں تو کبھی کبھار بہار کی بارشیں کئی کئی دن تک جاری رہتی ہیں جن سے برف بھی پگھلنے لگتی ہے اور زمین سبز فرش کے لئے صاف لگتی ہے۔ برف وباران کے

اس نظام میں خال ہی کسی سال کوئی تبدیلی آتی ہے''۔ص ۲۱۲۔

کشمیر کے خوشگوار موسم کی مشابہت اور مطابقت البیرونی کی نظر میں تُرکستان کے اُن علاقوں سے بہت نزدیک ہے جو ہندوستان کے شمال میں واقع سلسلۂ کوہستانی کے درمیان ہونے کے ناطے اِس خطے کو ہندوستان کے دوسرے خطوں سے مختلف اور ترکستان کے مختلف خطوں کے مشابہ بنا دیتا ہے۔ص ۸۵۲۔

کشمیر کے فطری مناظر اور خارجی خدوخال کے بارے میں اِس طرح کی بیشتر باتیں جو اُلبیرونی نے دسویں صدی عیسوی کے دوران یا گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مشاہدہ کی ہیں کی ہیں اُن میں اب تک بھی زیادہ تبدیلی نظر نہیں آتی البتہ کشمیر کی ثقافت اور کشمیریوں کے رہن سہن سے متعلق درج کی گئیں اُلبیرونی کی بیشتر باتیں عام آدمیوں کے لئے پہیلیوں کا درجہ رکھتی ہیں خصوصاً اُن کے لئے جو علمِ فلکیات، علم جغرافیہ علمِ ریاضی اور علم نجوم کی اصطلاحات سے آشنا نہ ہوں۔ جب بھی ایسی چند عبارتوں کا ترجمہ پیش کرنا فکر کو مہمیز لگانے کے لئے مفید معلوم ہوتا ہے مثلاً:

''کشمیر کے (ماہرینِ تقویم) لوگ اِس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ مہاشکتی (جو انگریزی میں Great bear کہلاتی ہے) پورے ایک سو سال تک شمسی برج میں چکر لگاتی ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا کلینڈر کی رُو سے موجودہ صدی کی تکمیل مذکورہ ستارے کے آئینے میں یہ دکھاتی ہے کہ مطلوبہ نتائج پیش ہونے میں ابھی ۳۲ سال بچتے ہیں'' (ص ۳۹۳)۔

''ہندو (آواگون یا تناسخ کے قائل ہونے کے ناطے) یہ بھی جانتے ہیں کہ دیو پارا یوگ کہلانے والے دور میں ویدوں میں درج رسموں اور عقیدوں کے علاقے سے وابستہ اکثر باتیں مسخ کر کے مِٹا دی گئی ہیں۔ یہ وہ دَور تھا جس کا ذِکر ہم مناسب جگہ پر اس اطلاع کے ساتھ کریں گے کہ اصل ویدوں کے احیاء کا کام پرسارا کے بیٹے ویشا نے کیسے کیا ہے۔ ویشنو پُران میں یہ بات درج ہے کہ ہر منونترا دَور کے شروع ہوتے ہی ایک ایسا دیوتا پیدا کیا جاتا رہے گا جس کی اُولاد اِس خاص

دور کے خاتمے تک پوری زمین پر حکومت کیا کرے گی اور اُن میں سے کا ہی ایک شہزادہ پوری دُنیا کا سردار ہوا کرے گا پھر ایسے چھوٹے دیوتا جن کو مختلف علاقوں کے لوگ آگے کے تحفے نذر و نیاز کے طور پر پیش کرتے ہونگے اُن میں بیٹھ کر ہی وہ مہاشکتی (Great bear) اُن ویدوں کو نیاپن عطا کرتی رہے جو ہر دَور کے خاتمے پر گُم یا مَسخ ہو گئے ہونگے۔

وشنو پُران میں بیان کی گئی اِسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہمارے (البیرونی کے) یہاں آنے سے چند ہی سال پہلے کشمیر کے ایک وسکورا نامی نامور برہمن نے اَز خود یہ محنت اپنے ذِمے لی کہ وہ وید کو تشریح کے ساتھ کتابی شکل میں درج کر لے۔ واقعاً اُس نے وہ مُشکل کام ہاتھ میں لیا ہے جس کے کرنے سے ہر ایک نے جی چُرایا ہوگا۔ اُس نے یہ زحمت اِس ڈر سے گوارا کر لی ہوگی کہ لوگ ویدوں کو بالکل بھول ہی نہ جائیں اور نتیجتاً ویدوں کا وجود ہی ختم نہ ہو جائے۔ اُس کے مُشاہدے میں بات بخوبی آچکی تھی (کُل یومٍ بَتر کے مصداق) لوگوں کا کردار اور روز بروز تنزل اختیار کر رہا ہوگا اور اَب لوگ اَچھائیوں اور اپنے فرضوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہونگے۔ ویدوں کی چند عبارتوں کے بارے میں کشمیر کے برہمنوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اُن کو آباد علاقوں میں نہ پڑھنا چاہئے کیونکہ ایسا کرنے سے وہاں کی عورتوں اور مادہ مویشیوں کے حمل گرنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے وہ اُن عبارتوں کو آبادی کے باہر ہی پڑھتے ہیں''۔ (ص ۱۲۷)

دسویں گیارہویں صدی عیسوی کے کشمیریوں کے عقائد واَوہام پر اِس طرح کا کئی رنگوں والا اظہارِ خیال کرنے کے ساتھ ساتھ البیرونی ہندوستان اور کشمیر کے بعض دُور علاقوں کے سماجی رسوم اور عائلی رہن سہن کے بارے میں بھی دلچسپ اطلاعات بہم پہنچاتا ہے جس سے باریک بین محقق کی تجسّس و تفحص کے معیار کا اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ لکھتا ہے ''پانڈو کے چار بیٹوں کی ایک ہی بیوی تھی وہ اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ باری باری ایک مہینہ گذارنے کی

باپند بنائی گئی تھی۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ پرسارا نام کا سادھو ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر رہا تھا کہ وہ دیکھتے ہیں کشتی چلانے والی ملّاح کی کنواری بیٹی پر عاشق ہو کر اُس کے ساتھ مباشرت کرنے پر جذبات میں آ گیا۔ پہلے ہانجی کی لڑکی نہ مانی مگر آخر مان گئی البتہ دریا کے کنارے پر اُنکے فعلِ بد کو چھپانے والی کوئی چیز نہ تھی تو دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اِملی کا ایک ایسا درخت اُگا جس نے اِن کو لوگوں کی نظروں سے چھپنے کی ایک آڑ بہم پہنچائی۔ پھر کیا تھا ہانجی کی بیٹی کو حمل ٹھہرا تو وقت گذرنے پر وہ بچہ پیدا ہو گیا جس کا نام عُمدگی کے ساتھ ویشار کھا گیا...... کشمیر کی ہمسائیگی میں پانچیر سلسلۂ کوہ کے علاقے (لداخ) میں بھی کئی کئی بھائیوں کی ایک ہی مُشترکہ بیوی رکھنے کا رواج پایا جاتا ہے''۔ ص ۱۰۸۔

اس طرح کے سماجی رسم و رواج کی کہیں کہیں موجودگی کا پتہ بتانے والا اعظیم محقّق کشمیریوں کی علم دوستی اور ذہانت سے ابھی آنکھیں نہیں چُراتا جس نے اِس خطۂ ارضی کو بُدھ مت کے دورِ عروج کی طرح ہندو مت کے دورِ عروج میں بھی علم واَدب کا ایک مرکز بننے یا بعد کے ہندو عالموں کی اصطلاح میں شاردا پیٹھ کہلانے میں مدد کی تھی اور معیاری سنسکرت اَدب کا ساٹھ فیصد حصّہ کشمیریوں کی دین ہونے کے ناطے اس خطے کو بنارس اور قنوج سے بھی اونچا علمی فخر حاصل ہو گیا تھا۔ اَلبرونی کے چند الفاظ کو اس سلسلے میں نقل کرنے پر ہی میں یہ مقالہ ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ لکھا ہے ''گرامَر اور عروض کا علم دوسرے مروّجہ سائینسوں کے لئے بہت مفید گردانا جاتا ہے۔ اِن کے اندازہ کے مطابق گرامُر کو اوّلین دُرجے کی اہمیت حاصل ہے (اس کے سب سے معیاری کام کشمیر میں ہوتے ہیں) اس سائینس پر لکھی گئیں جو آٹھ کتابیں میری نوٹس میں لائی گئیں اُن میں شامل آخری کتاب یوراج آنند پال کے اُستاد یعنی (مشہور حکمران) جے پا کے بیٹے کے اُستاد اُگربھتی کی تیار کردہ کتاب تھی۔ تیار کر کے اُس نے یہ کشمیر کے عالموں کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی لیکن اُنہوں نے اسکی پذیرائی نہ کی۔ کیونکہ کشمیر کے عالم ایسے علمی

معاملے پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اب ہمارے ہم عصر حکمران شاہ آنند پال کے پاس اُستاد کی شکایت پہنچی تو اُس نے اپنے اُستاد کی لاج رکھنے کی ایک ترکیب سوچ لی۔ اُس نے حکم دیا کہ دولاکھ درہم کے برابر رقم اور قیمتی تحفے کشمیر کے عالموں کی خدمت میں بھیج دئے جائیں جو اُن عالموں میں تقسیم ہوں جنہوں نے میرے اُستاد کی کتاب کا مُطالعہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن عالموں نے اُگر بھٹی کی اس کتاب کو اصلاح کر کے اتنا معیاری بنادیا کہ بعد میں وہی کتاب سب سے قابلِ قبول اور سب سے بڑی انعام یافتہ قرار پائی۔ ص ۶۳۱





غلام رسول جان☆

مرزا حیدر۔ تاریخِ رشیدی اور کشمیر

تاریخِ رشیدی کی مناسبت سے تواریخِ کشمیر کی ورق گردانی کرنے سے قبل مناسب ہے کہ اس مصنّف کی زندگی کے چند نکات اور کارناموں سے متعلق بعض گوشوں کی نقاب کشائی ہو۔ مرزا حیدر کا تعلق گورگان کے مُغل چغتائی خاندان سے تھا۔ اُس کی ولادت ۱۴۹۹ء میں تاشقند میں ہوئی۔ اس کا باپ محمد حسین گورگان، صوبہ شوش کا گورنر تھا۔ وہ اپنی ماں خوب نگار خانم کی طرف سے بابر مرزا کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد خان مرزا نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس کے پاس مرزا ایک سال رہا اور پھر بابر مرزا کے بُلاوے پر کابل چلا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی مرزا شاہی گھرانے کے ایک فرد کے طور رہنے لگا اور اُس کی پرورش شاہانہ طریقے پر ہوئی۔ اُس کے بعد مرزا نے اپنے چچا سلطان سعید خان کی مُلازمت اختیار کر لی۔ اس کے اُنیس سالہ دورِ اقتدار میں مرزا نے ایک تجربہ کار فوجی ماہر کی حیثیت سے بہت سارے کارنامے انجام دئے۔ سلطان موصوف کی وفات پانے کے بعد مرزا حیدر لاہور آیا اور مُغل دربار میں ملازمت اختیار کر لی یہاں تک کہ ۱۵۴۰ء کشمیر پر اپنا تسلّط جما لیا۔ آخر کار یہاں گیارہ سال تک کاروبارِ سلطنت میں مصروف رہنے کے بعد ۱۵۵۱ء میں ایک شبخون میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ اُسکی قبر مزارِ سلاطین (زینہ کدل) میں دریائے

☆ وسط ایشیائی مطالعاتی مرکز۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سرینگر

جہلم کے کنارے بطرفِ شمال ایک چبوتر پر واقع ہے۔ قبر پر ایک لوح نصب ہے جس پر درجِ ذیل فارسی اشعار کندہ کئے گئے جس سے کہ تاریخِ وفات اخذ ہوتا ہے۔

شہ گورگان مرزا حیدر آخر
بملکِ شہادت زدہ کوس شاہی
قضائے الٰہی چنین بود تاریخ
شُدہ بہروصلش قضای الٰہی ۹۵۸ھ[1]

سیاسی اغراض سے قطع نظر مورّخ حسن، مرزا حیدر کے انتظام سے مُتعلق یوں لکھتے ہیں۔ "دورِانتظام مملکت مساعی جمیلہ بکار آوردو اُستادان حرفت وصنعت رااز ہر جا طلبید ہرونق ورواج این مُلک را بخشندہ وتعمیر حمام وطاقہائے دریچہ تکیہ دار و کاغذگری پنجرہ ہا و بدروہائے اسواق وخشک کردن شالی کہ آن رانارہ للومی یند از مخترعات اوست"[2]

مرزا حیدر اہلِ قلم بھی تھا۔ چنانچہ کشمیر میں اپنے دورِاقتدار (۹۴۷۔۹۵۸ھ/۱۵۴۰۔۵۱ء) کے دوران تاریخِ رشیدی کو تالیف کیا[3]۔ ترک نژاد مرزا نے اِسے فارسی میں تصنیف کیا۔ دو حصوں پر مشتمل تاریخِ رشیدی میں کشمیر سے متعلق مفصلاً خامہ فرسائی کی گئی ہے اور یہی ہمارا مطمع نظر بھی ہے۔ مرزا موصوف شاعرانہ شغف بھی رکھتا تھا اور بقولِ مورّخ حسن "وَدَرعلوم عقلی ونقلی شعروسخن طبع موزون داشت"[4] اور مرزا سے منسوب کچھ نمونہ کلام تاریخوں میں بھی درج ہوا ہے۔

شاعرانہ ذوق وشوق مورّخانہ صلاحیت رکھنے کے نتیجے میں مرزا حیدر اہلِ فضل و کمال کا قدردان بھی تھا اور ان کا حامی اور سرپرست بھی۔ خود رسمی اور دینی علوم، شعرو حکمت، حساب ونجوم، لمعات اور انشا پر قدرت رکھتا تھا[5]۔ کشمیر میں اُپنے دورِاقتدار میں فنِ موسیقی کو خوب رونق بخشی اور مختلف سازوں کا اختراع کیا[6]۔

تاریخ رشیدی جیسا کہ اولاً بیان ہوا، دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کشمیر کی جغرافیائی، ماحولیاتی، سیاسی، مذہبی اور مسلکی تاریخ کا بیان اسکے دوسرے حصہ میں آیا ہے۔ نیز مختلف فنون لطیفہ، بعض عجائب وغرائب اور صنعت وحرفت کا یہی حصہ آئینہ دار ہے۔

مرزا حیدر نے کشمیر سے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ خود اُس کے بقولِ اُسکا آنکھوں دیکھا اور مشاہدہ کیا ہوا ہے۔ مرزا حیدر کا دعویٰ ہے کہ کشمیر کی اپنی شہرت کے باوجود کوئی اُس کی موجودہ کیفیت کو نہیں جانتا ہے اور نہ ہی اُسکی خصوصیات متقدمین کی تحریروں سے اُخذ کی جاسکتی ہے۔ تاریخِ رشیدی میں کشمیر کو دنیا کے مشہور ترین ملکوں میں شمار کیا گیا ہے اور اسکی شہرت کے دو اسباب رہے ہیں۔ اوّل اسکے عجائبات، دوم اسکی فطری دلکشی۔

تاریخ رشیدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے کشمیر سے متعلق خامہ فرسائی کرنے کی تاریخ خود ہی محرم ۹۵۰ھ مطابق ۴۴-۱۵۴۳ء بتائی ہے۔ یہاں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا ماہِ رجب ۹۴۷ھ میں کشمیر پر متصرف ہوا تھا اور تین سال سے زائد عرصہ سے کشمیر اسکے زیرِ نگین تھا۔ مرزا نے کشمیر کی جغرافیائی اور دیگر ماحولیاتی پہلوؤں کی عکاسی بخوبی کی ہے جو کہ اس طرح سے ہے کہ کشمیر کا چٹیل میدان بکنی چوتھائی یعنی جنوب اور مشرق کے درمیانی علاقہ سے رکن بین یا شمال مغرب کی جانب پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہموار زمین تقریباً ایک سو کروہ جو کہ تیس فرسخ کے برابر ہے، کی وسعت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسکی چوڑائی کچھ حصوّں پر تقریباً بیس کروہ اور بعض جگہوں پر دس کروہ ہے۔ اس پورے علاقے کی زمین چار اقسام میں بٹی ہوئی ہے۔ ۱۔ زراعتی، آبی ۲۔ وہ زمین جسے مصنوعی آبپاشی کی ضرورت نہیں۔ ۳۔ باغات۔ ۴۔ زمینِ مسطح جہاں دریا کے کنارے پر گلہائے بنفشہ اور مختلف رنگوں کے پھول بہتات میں ہیں۔

مرزا حیدر موسمیاتی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ موسم گرما میں گرمی قابلِ برداشت ہوتی ہے اور کسی بھی وقت پنکھے وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی ہے دراصل یہ سردی موافق گرمی کو بہم پہنچانے میں ممد و معاون ہوتی ہے اور جب بھی سورج نہیں چمکتا ہے تو آگ کی گرمی ناخوشی سے کوسوں دُور بھاگتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام چار موسموں میں موسم کی خوشگواریت کے لحاظ سے کشمیر کے برابر نہ ہی میں نے کسی مُلک کو دیکھا اور نہ ہی کسی مُلک کے بارے میں سُنا۔

تاریخِ رشیدی میں کشمیر کے شہرۂ آفاق میوؤں اور پھلوں سے متعلق خامہ سرائی

کی گئی ہے۔ یہاں کے میوؤں میں مرزا نے ناشپاتی، توت' میٹھے اور کھٹے گلاس ملنے کی بات کہی ہے۔ سیبوں کے ضمن میں آیا ہے کہ یہ خصوصاً اچھے ہیں۔ مرزا نے توُت کے درختوں کو کشمیر کے عجائبات میں شمار کیا ہے جنہیں کہ اُنکے پتوں کے لئے کاشت کیا جاتا ہے جس سے ریشم کا حصول ہوتا ہے۔ بقولِ مرزا حیدر کے' لوگوں میں میوے کھانے کی رسم نہیں ہے۔ باغ کا مالک اور وہ جِسکا کوئی اپنا باغ نہ ہو، دونوں برابر ہیں کیونکہ باغات بِنا دیوار کے ہوتے ہیں اور یہاں یہ رسم نہیں ہے کہ کسی کو باغات میں جانے سے روکا جائے۔ کشمیر میں میوؤں کی بہتات کے ضمن میں مرزا رقمطراز ہے کہ میوے اتنی بہتات میں ہیں کہ اُنہیں شاذ و نادر ہی بازار میں لا کر بیچا جاتا ہے۔ کشمیر میں ایک آدمی اُن تمام ہُنروں اور دستکاریوں سے دوچار ہوتا ہے جو کہ دوسرے مُلکوں میں نایاب ہیں۔ ماہر فنکاروں میں نگینہ ساز، سنگ تراش، شیشہ گر، تابدان تراش (کھڑکیوں کو تراشنے کا عمل) اور زرکوب وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیر کے فنِ تعمیر سے متعلق تجزیہ تاریخِ رشیدی میں آیا ہے اور اس سلسلے میں شہروں یا قصبوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مرزا حیدر کا کہنا ہے کہ شہر یا قصبوں میں کچھ بڑی عمارتیں تازہ بَبل کے درختوں کی لکڑی سے بنی ہیں ان اکثر پانچ منزلہ ہیں اور ہر ایک منزل ہالوں، گیلریوں، دالانوں اور ایوانوں پر مشتمل ہے۔ انکی بیرونی خوبصورتی اپنا بیان آپ ہے اور جو اُنکو پہلی نظر میں دیکھتا ہے وہ اُنگشت بدنداں رہتا ہے اِن عمارتوں کا اَندرونی منظر اُنکے بیرون کے برابر نہیں ہے۔

مرزا حیدر نے تاریخِ رشیدی میں کشمیر اور اسکے گرد ونواح میں پائے جانے والے منادر کی تعداد ایک سو پچاس لکھی ہے اور ان مندروں کو بے مثال قرار دیتے ہوئے اُنہیں کشمیر کے عجائبات میں سب سے مُقدّم اور اہم گردانا ہے۔ کسی مخصوص مندر کا نام لئے بغیر ہی مرزا موصوف نے مجموعی طور ان مندروں کی طرزِ تعمیر سے مُتعلق سیرِ حاصل تبصرہ کیا ہے اور اُنکے عمدہ اور جُدا گانہ پہلوؤں کو زیرِ نظر لایا ہے۔ ان میں کام آنے والی اشیاء، طرزِ تعمیر اور کاریگری کو سراہا ہے۔ اُنکی طرزِ تعمیر سے مرزا اِنتہائی مُتاثر دکھائی دے رہا ہے جس سے کہ اس فن سے اسکی غیر معمولی دلچسپی اور معلومات کا اظہار

ہوتا ہے۔ مرزا نے ان مندروں کو ایک ہی منصوبہ پر تعمیر کیۓ جانے کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ باقی ساری دُنیا میں اسطرح کی ایک بھی عمارت کو نہ ہی دیکھا گیا اور نہ ہی سُنا گیا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ یہاں ایک سو پچاس ایسی عمارتیں موجود ہیں۔

مرزا حیدر نے کشمیر کے دیگر عجائیات و غرائب میں یہاں کے چشموں، تالابوں، جھیلوں اور محلات کا تذکرہ کیا ہے اور تاریخ رشیدی میں برنگ کے مقام جسے ضلع کا نام دیا گیا، پر واقع ایک تالاب جیسی کھائی اس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر مُندرج ہے[۸] بقولِ مرزا حیدر طرفگی کا عالم یہ ہے کہ یہ تالاب سال کے گیارہ مہینے خشک رہتا ہے اسکی پینیدی میں ایک سوراخ ہے۔ بُرجِ ثور کی آمد پر دن میں دو تین بار شدت کے ساتھ پانی اُچھل پڑتا[۹] اور یہ تالاب بھر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے ایک طرف سے پانی بہہ نکلتا ہے۔ برکھراس یا بُرجِ ثور کی مُدت کے ختم ہونے پر یہ تالاب سال بھر کے لئے خشک ہو جاتا ہے[۱۰] مرزا حیدر کے بقول اُس کے دہانے کو سیمنٹ اور چونے گارے سے بندھ کرنے کی سعی کی گئی لیکن وقت آنے پر وہ سب کچھ بہا کے لے گیا اور یہ کبھی ممکن نہ ہوا کہ اُسکے بہاؤ کو روکا جائے“۔

مرزا حیدر نے ناگام کو ایک مشہور قصبہ گردانا ہے اور یہاں پر ایک اُونچے درخت کی موجودگی کو بیان کیا ہے۔ موصوف کے بقول یہ درخت اتنا بلند ہے کہ اگر اسکے سِرے پر ایک تیر پھینکا جائے تو شاید ہی اسکو لگے اور اگر کوئی شخص اس درخت کی ٹہنی کو پکڑ کر اسکو ہِلا دے سارے دَرخت کا وجود تھرانے لگتا ہے[۱۱]۔

مرزا حیدر نے بعض چشموں، تالابوں کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ہی کشمیر کے ایک اہم جھیل، جھیل اُولر کا نام بھی لیا ہے جسکا دائرہ موصوف نے سات فرسخ لکھا ہے[۱۲] جھیل کے درمیان میں سلطان زین العابدین (۱۴۲۰-۷۰ء) کے بنائے گئے محل اور اس قصر کو تعمیر کرنے سے متعلق کیفیت بیان کی ہے۔[۱۳] سلطان زین العابدین کا شہر میں بنائے گئے ایک اور محل کا تذکرہ تاریخِ رشیدی میں آیا ہے جسے بقولِ مرزا حیدر کے کشمیری لہجہ میں راجدان (رازدانی) کہا جا رہا ہے اور موصوف نے اسکی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ یہ بارہ منزلہ عمارت ہے جس میں کچھ پچاس پچاس کمروں، ہالوں

اور دالانوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سارا اعلیٰ اور مُرتفع تعمیر لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ مرزا حیدر نے تبریز، ہرات اور سمرقند کے مقامات پر بنائے گئے دیگر وسیع و عریض محلات کے نام گِنانے کے بعد لکھا ہے کہ اگرچہ راجدان (رازدانی) ان سے زیادہ مرتفع اور بہت سارے کمروں پر مشتمل ہے تب بھی وہ اُن کی خوش وضعی اور ڈھنگ کو نہیں پہنچتی ہے تاہم یہ ایک عمدہ تعمیر ہے۔

تاریخ رشیدی میں کشمیر پر ہندوؤں کی حُکمرانی کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسلام کا بر سبیلِ تذکرہ کرنے کے ساتھ ہی یہاں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کا بیان آیا ہے اور اس سلسلے کا بُنیاد گذار سلطان شمس الدین کو بتایا گیا[۱۴] سلطان کے بارے میں مرزا حیدر رقمطراز ہے کہ وہ قلندرانہ لباس زیب تن کئے اُسوقت کشمیر آئے جب ملک کی حکمرانی ایک ملکہ کے ہاتھوں میں تھی۔ طوائف الملوکی کے زمانے میں سلطان نے ملکہ کی ملازمت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ گذرنے پر ملکہ سلطان کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوئی اور اس واقعہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سلطان نے کشمیر کو اَپنے زیرِ نگین لایا[۱۵] تاریخِ رشیدی میں درج ہے کہ سلطان شمس الدّین کے بعد اُسکا بیٹا سلطان علاؤالدّین (۱۳۴۴ـ۵۵ء)[۱۶] اور اُسکے بعد سلطان قطب الدین بن علاؤالدّین تخت نشین ہوا۔ مرزا حیدر نے سلطان شہاب الدین بن علاؤالدّین کی تخت نشینی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ قطب الدین کا بیٹا سلطان سکندر (۱۳۷۹ـ۱۴۱۲ء) اپنے باپ کے بعد اس مُلک کا حُکمران ہوا۔ سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ـ۷۰ء) اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا اور پچاس سال حکومت کی۔ مرزا کا کہنا ہے کہ سلطان موصوف کشمیر کی تعمیر و مرمت میں کوشاں رہا اور اُسکے زمانے میں کشمیر شہر بنا جسکے آثار اَب تک ظاہر ہیں۔

تاریخِ رشیدی میں آیا ہے کہ سلطان زین العابدین کے بعد کشمیر کے بادشاہوں کا دورِ تنزل شروع ہوا اور اُنکی قوّت جواب دینے لگی۔ اُمراء اتنے طاقت ور بن گئے کہ سلطان فقط برائے نام بادشاہ تھے، اِس حد تک کہ اُنکی ظاہری رعایت بھی نہیں برتی جاتی تھی۔ چنانچہ بادشاہ بے بس تھے لہٰذا اپنے آپ کے بچاؤ کی خاطر ترکِ سکونت

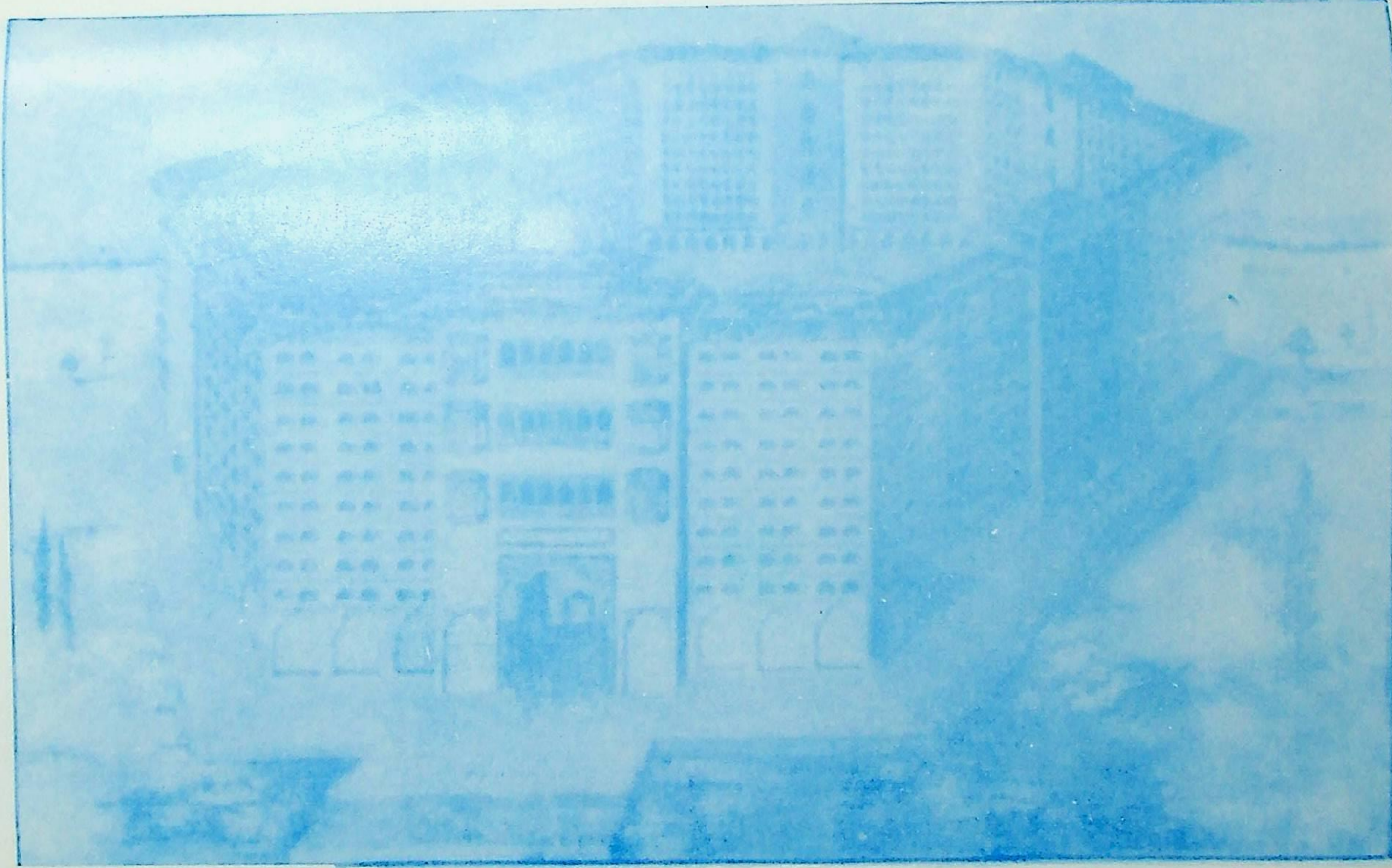
کر گئے۔ مُلک سے بھاگ گئے اور بہت ساری مصیبتوں کو جھیلا۔ سلطان نازک شاہ، جسے مرزا نے بادشاہ کہنے کے بجائے اپنا ساتھی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے اُس کی نسبت کافی زیادہ قدردانی کا مظاہرہ کیا۔ سلطنت سے وابستہ سابقہ حُکمرانوں کی اس بات کے لئے کُھلی تنقید کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاصر بادشاہوں کے تئیں عزت افزائی دکھانے میں ناکام رہے۔ مرزا حیدر کا بیان ہے کہ چونکہ سلطان زین العابدین کی نسل کے چند لوگوں نے بادشاہ کا لقب پایا لیکن وہ اختیار کے مالک نہ تھے۔ مرزا حیدر نے تاریخِ رشیدی میں جن دیگر کشمیر اُمراء و وزراء کی طرف اپنی توجہّٰ مبذول کی ہے اُن میں ملک کاجی چک، زنگی چک، ملک ابدال ماگرے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ موصوف کو اوّل الذکر کر کے ساتھ کئی بار نبرد آزما ہونا پڑا۔ تاریخِ رشیدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مرزا حیدر دوسری بار جانب کشمیر متوجہ ہوا اُس وقت ملک کاجی چک یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ خود مرزا کے بقول وہ ملک کاجی چک کے ساتھ کوئی مقابلہ کئے بغیر ہی واردِ کشمیر ہوا اور کشمیر کے دُرّہ کو عبور کرنے کی تاریخ ۲۲ر رجب لکھی ہے اور یہاں کے تخت پر بیٹھنے کی تاریخ "جلوس دارالملوک کشمیر" کے تاریخی جُملہ کہہ کر بیان کی ہے۔

مرزا حیدر نے ملک کاجی چک کی تین بار حکومت سے بے دخلی کی بات بیان کی ہے۔ اب کی بار جب مرزا حیدر کشمیر پر قابض ہوا تو ملک کاجی چک نے شیر شاہ سوری سے امداد حاصل کی اور مرزا کے خلاف برسر پیکار ہونے کی غرض سے ایک لاؤ و لشکرؔ جس کی تعداد مرزا نے پانچ ہزار بتائی ہے، جانبِ کشمیر متوجہ ہوا۔ مرزا حیدر اپنی لشکر، جس کی تعداد اُس نے خود ہی تین سو لکھی ہے، کا مقابلہ کیا۔ سوموار ۸ر ربیع الثّانی ۹۴۸ھ بعد اَز دوپہر اتنی بڑی جمعیت کے پاؤں اُکھاڑ دیئے۔ بقولِ مرزا کے اِس فتح کی تاریخ مولانا یوسف خطیب نے "فتح مُکرّر" کہہ دی ہے۔ اس طرح سے مولانا یوسف وہ واحد فرد ہیں جکا نام مرزا حیدر نے کشمیری دانشوروں کے طور لیا ہے۔

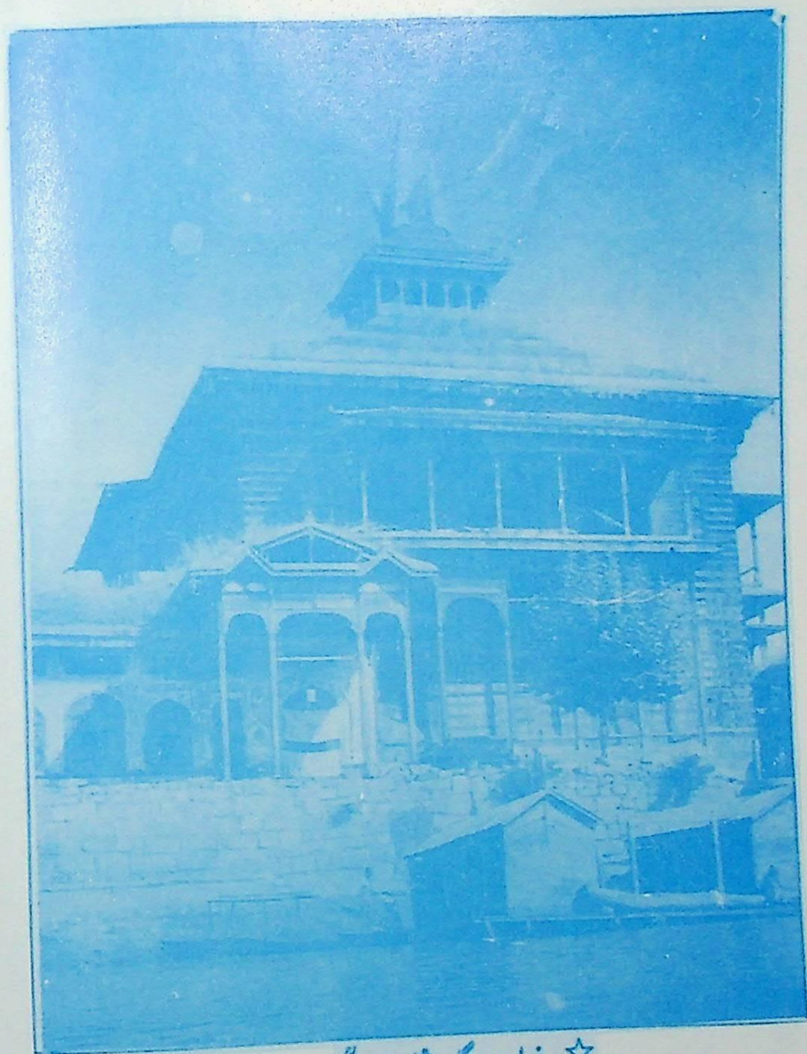
سیاسی واقعات سے قطع نظر مرزا حیدر نے کشمیر میں مذہبی صورتحال اور صوفیانہ اور رُوحانی اقدار سے مُتعلق خامہ سرائی کی ہے۔ موصوف نے کشمیر میں مذہبِ اسلام کو

قریب العہد جانا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں سبھی لوگ برہمنوں کا عقیدہ لئے ہوئے ہندو رہتے ہیں۔ سلطان قطب الدین کے دور میں بانیٔ مسلمانی حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ (م۔۷۸۶ھ) کو کشمیر آ گئے۔ الناس علی دین ملوکھم کے مصداق سلطان سکندر شہمیری کا دینِ اسلام کو رواج دینے اور بُت خانوں کی مسماری کی بات مرزا حیدر نے رقم کی ہے۔ سُلطان زین العابدین کی مذہبی رواداری اور صُلح پسندی کو سلطان کا دُنیا کے لوگوں کے تمام طبقوں کے تئیں رعایت برتنے اور کفر و اسلام کی نظر سے نہ دیکھنے کے تناظر میں دیکھا ہے۔ مرزا حیدر نے کشمیر میں مذہبی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں پہلے پہل تمام لوگ حنفی مسلک کے تھے لیکن فتح شاہ کے دَورِ حکومت میں طالش (عراق) سے شمس (میر شمس الدین عراقی) نام ایک شخص آیا جنہوں نے اپنے آپ کو نُوربخشی ظاہر کیا اُس نے مذہب کی ایک مسخ شدہ شکل متعارف کرائی اور اُسے نوربخشی کا نام دیا اور بہت ساری بدعات کو عملایا۔ اُنہوں نے ان کم ظرفوں کے لئے فقۂ اَحوط کی مکمل کتاب لکھی جو کہ نہ سُنی اور نہ شیعہ فرقوں سے ہی مُطابقت رکھتی ہے۔ مرزا حیدر کا مزید کہنا ہے کہ اُس نے کشمیر میں مشہور فقۂ احوط کی مکمل کتاب ہندوستان کے علماء کے پاس بھیج دی جسے اُنہوں نے رد کیا اور کتاب کی پُشت پر ایک حُجت آمیز فتویٰ لکھ دیا اس فتویٰ کو مرزا حیدر نے تاریخِ رشیدی میں درج کیا ہے۔ مرزا حیدر نے کشمیر میں حنفی اور نوربخشی فرقوں کے علاوہ آفتاب پرستوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جنہیں بقولِ مرزا شماسی (آفتاب پرست) کہا جاتا تھا۔

مرزا حیدر نے کشمیر میں اپنے عہد کے صوفیوں کو ہدفِ ملامت قرار دیا ہے اور اس ضمن میں کسی مخصوص فرقہ کا نام لئے بغیر اُنکی بدعات اور گمراہیوں اور بے راہ رویوں کی کھلی تنقید کی ہے۔ ان صوفیوں کا علم و حکمت اور علماء و فضلاء پر اتہام باندھنے اور نفرت کرنے کو بھی بیان کیا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ان بدعتیوں جیسا گروہ کہیں نہیں پایا جاتا ہے[۱۷]۔ صوفیوں کے لباس میں ملبوس بدعتیوں کے اس گروہ کے ضمن میں مرزا حیدر کشمیر میں دوسرے مسالک اور فرقوں کی بہ نسبت اپنی سفّاکی اور خون ریزی کا



رازدانی - سلطان زین العابدین بڈشاہ (۷۰-۱۴۲۰ء) کا تعمیر کردہ عجوبۂ روزگار محل



☆ زیارت گاہ شاہِ ہمدانؒ

برملا اظہار کر کے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کشمیر میں کوئی شخص اعلانیہ اس عقیدہ کا برملا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ سب کے سب اسکے منکر ہیں اور اپنے آپکو اچھا سُنّی (مسلمان) ظاہر کرتے ہیں وہ ان کے خلاف میرے مظالم سے خوب واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر کوئی اِس مسلک کا اظہار کرے گا وہ موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خواہش اور میری اپنی کوشش سے سرزمینِ کشمیر آہستہ آہستہ مصائب وآلام سے مکمل طور پر نجات دیا جائیگا اور سبھی جیسا کہ وہ اس وقت ظاہر کررہے ہیں دل کی گہرائیوں سے مسلمان بنیں گے۔[۱۸]

حواشی ومصادر:-

☆۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو (ا) این، الیاس، انگریزی ترجمہ تاریخ رشیدی، مُقدمہ، چاپ پٹنہ ۱۹۷۳ء (ب) ڈاکٹر جی۔ایم۔ڈی صوفی، کشیر، ج ۲ صفحہ ۲۰۰۔۲۰۱ (ج) پارمو، مسلم رُول اِن کشمیر، حاشیہ صفحہ ۳۱۷۔۱۸ (د) محمد اعظم، واقعاتِ کشمیر مطبوعہ صفحہ ۸۱

☆ ۲- پیر غلام حسن، تاریخ حسن، ج ۲ صفحہ ۲۵۴۔

☆ ۳- تاریخِ رشیدی کا ایک اہم اور قدیم ترین نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں زیر اندارج نمبر ۳۷۹۰ موجود ہے اور اسکی کتابت ۹۵۲ھ میں ہوئی ہے۔تاریخِ رشیدی کا انگریزی ترجمہ مع حواشی وتعلیقات کے اُین الیاس نے کیا ہے۔

☆ ۴- پیر غلام حسن، تاریخِ حسن ج ۲ صفحہ ۲۶۲ -

☆ ۵۔ محمد اسلم منعمی، گوہرِ عالم، مخطوطہ صفحہ ۴۹ -

☆ ۶ نراین کول عاجز "مُنتخب التواریخ"، مخطوطہ -

☆ ۷ آئینِ اکبری کے انگریزی مترجم نے اس سے ویرناگ کا عندیہ دیا ہے۔ (مُلاحظہ آئین اکبری، ج سیوم صفحہ ۳۹۷)۔

☆ ۸ - آئینِ اکبری میں سات گز والا چکور تالاب درج ہے کہ قدِ آدم کے برابر ہے (جیرٹ، انگریزی ترجمہ، آئین اکبری ج ۳ صفحہ ۵۷) -

☆ ۹۔ ابوالفضل کے کہنے کے مُطابق اُردی بہشت (اپریل۔ مئی) کے الٰہی مہینے میں اس میں پانی دو چشموں یعنی چشمہ سند براری اور چشمہ سپت ریشی سے اُبل پڑتا ہے اور ان ہی منابع سے تالاب بھر جاتا ہے (جیرٹ، انگریزی ترجمہ، آئین اکبری ج ۳ صفحہ ۳۵۷)

☆ ۱۰۔ ابوالفضل نے اسے ایک مُقدس مقام کے طور پر یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ لوگ رنگ برنگی پھول بطورِ پوجا کے پھینکتے ہیں اور پانی کے ختم ہونے کے موقعہ پر ہر ایک معتقد اپنے اُپنے پھول اِن چشموں سے اُٹھا کر لے جاتا ہے (جیرٹ، انگریزی ترجمہ، آئین اکبری صفحہ ۳۵۷)

☆ ۱۱۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں رقمطراز ہے کہ پرگنہ پچھ کے ہل تھل نامی گاؤں میں ایک ہلنے والا درخت ہے اگر اس کی معمولی ٹہنی کو حرکت دی جائے تو سارا درخت لرزہ براندام ہو جاتا ہے (جیرٹ انگریزی ترجمہ آئین اکبری، ج ۳ صفحہ ۳۶۳ نیز واقعات کشمیر صفحہ ۲۶۸ بھی دیکھئے) موّرخ حیدر کا کہنا ہے کہ بیس گز والی رسی اس درخت کے تنہ کو گھیر لیتی ہے اور پانچ سو سوار اُس درخت کے سایہ میں کھڑا رہ سکتے ہیں۔ موصوف کا مزید کہنا ہے کہ کسی شاعر کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ؎

بانیازی کہ بدستش نبود نیم درم　　　تنش از فاقہ بلرزد چو درخت ہل تھل

(ملاحظہ ہو حیدر ملک، تاریخ کشمیر صفحہ ۱۰۶)

☆ ۱۲۔ ابوالفضل نے اِسکا دائرہ ۲۸ کوس بتایا ہے (جیرٹ، انگریزی ترجمہ، آئین اکبری صفحہ ۲۴۶) موّرخ محمد اعظم نے اسکی ہر حد کو سات سات کروہ اور تمام اَدوار کی تعداد ۲۸ کروہ بتائی ہے۔ موصوف کا مزید کہنا ہے کہ اکثر جگہوں پر جھیل اولر کی گہرائی معلوم نہیں۔ گویا کہ یہ ایک دریائے محیط کا نمونہ ہے (مُلاحظہ ہو، واقعاتِ کشمیر، مطبوعہ صفحہ ۲۷۰) مورخ حسن کا کہنا ہے کہ جھیل اولر کی لمبائی مشرقی ساحل سے قصبہ سوپور تک تخمیناً ۱۲ میل اور اسکی چوڑائی جنوب سے لیکر شمال تک ۸ میل ہے اُسکا دَورِ محیط اعتدال کے وقت تقریباً ۴۰ میل کا ہے (پیر غلام حسن، تاریخ حسن، ج صفحہ ۱۵۲)

☆۱۳ چنانچہ یہ محل زینہ دیب کے نام سے مشہور عالم تھا اسکی تعمیر ہونے پر شعراء نے قصاید کہے اور درجِ ذیل فارسی قطعہ تاریخوں میں یوں درج ہوا ہے جس سے کہ مادۂ تاریخ بھی اخذ ہوتا ہے۔

این بُقعہ چو بنیاد فلک محکم باد | مشہور بہ زین دیب در عالم باد
شاہ زین عبادت تا درو جشن کند | پیوستہ چو تاریخ خودش 'خرم باد'

(۸۴۹ھ)

(ملاحظہ ہو، تاریخ حیدر ملک، صفحہ ۴۶۔ واقعاتِ کشمیر، مطبوعہ صفحہ ۵۰۔ تاریخ حسن، ج ا صفحہ ۱۵۴)

بقول محمد اعظم، دیدہ مری کے یہ تاریخ اب تک نقش بر سنگ ہے اور یہ تاریخی کتبہ جو نقش فی الحجر ہے اَب ایس، پی، ایس، میوزیم میں محفوظ حالت میں صدر دروازے کی جانب داخل ہوتے ہی دائیں طرف رکھا ہوا ہے۔

☆۱۴۔ تاریخ میں اسکا نام شاہ مرزا ابن طاہر شاہ بن فور شاہ رقور شاہ درج ہے راجہ سہد یو (۰۵ ۷ ۔ ۲۴ ھ) کے زمانے میں واردِ کشمیر ہوا اور اُسکا تعلق گُبز سواد کے علاقے سے تھا۔ راجہ مذکورہ کے وزیر رام چندر نے شاہ مرزا کو بارہمولہ میں دارہ ویر بطور جاگیر عنایت کیا (واقعات کشمیر صفحہ ۲۷، تذکرہ اولیائے کشمیر صفحہ ۱۶۱)

☆۱۵۔ مورخین نے شاہ مرزا کا کشمیر ورود اُسکے دادا کا وہ خواب بیان کیا ہے جسکی رُو سے وہ بعد میں سُلطان شمس الدین کے لقب سے کشمیر کے تخت پر بیٹھا (واقعات کشمیر صفحہ ۲۷) واضح رہے شاہ مرزا سلطان شمس الدین کے لقب سے ۴۰ ۷ ھ/۱۳۳۹ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا (راج ترنگنی، جون راج تدوین شری کنٹھ کول صفحہ ۸۲)

☆۱۶ مرزا حیدر کو اشتباہ ہوا ہے کیونکہ سلطان شمس الدین کے بعد اُسکا بیٹا جمشید ۷۴۳ ھ ۱۳۴۲ء میں کشمیر کا حاکم بنا (راج ترنگنی، جون راج، تدوین شری کنٹھ کول صفحہ ۸۳، کیشر ج ا صفحہ ۳۶ ۔ ۳۷)

☆۷ امیر شمس الدین محمد عراقیؒ اپنے عہد کے عالم تھے (پیر غلام حسن، تاریخ حَسن، ج اصفحہ ۱۳۰) اور تمام علوم سے بہرہ ور (خواجہ محمد اعظم، واقعات کشمیر، مطبوعہ، صفحہ ۷۵)۔ اگرچہ بعض موّرخوں کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے شیعہ مسلک کے عقائد پر کچھ اہم رسالے اور فقہ اَحوط نام کی کتاب تصنیف کی (مُلاحظہ ہو تاریخ سید علی، مخطوطہ، ورق ۲۲/ا، واقعات کشمیر، صفحہ ۵، تاریخ حسن ج اصفحہ ۱۳۱۔ علی ابن رضا، کحل الجواہر چاپ لاہور، صفحہ ۸، حکیم صفدر ہمدانی تاریخ شعیان کشمیر) لیکن یہ محض مفروضہ ہے اُنہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ کتاب تحفۃ الاحباب' جو حضرت میر عراقی کی زندگی اور کارناموں سے متعلق ایک مبسوط تذکرہ ہے، کے مُطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فقہٗ احوط سیّد محمد نور بخش کی تصنیف ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ کتاب کے درج ذیل بیانات سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ تحفۃ الاحباب کے باب چہارم کے صفحہ ۲۳ پر درج ہے۔ آنحضرت (سیّد محمد نور بخش) در رسالۂ عقاید و در کتاب فقہ احوط کہ ہر دو تصانیف آنحضرت اند۔ علاوہ ازیں یہ اقتباس بھی قابلِ ذکر ہے......وفقہ احوط در رسالۂ عقاید حضرت امام ہُمام (محمد نور بخش) مُطالعہ نمودند۔ تحفۃ الاحباب کے مطالعہ سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ فقہ اُحوط نام کی کتاب سید محمد نور بخشؒ نے عربی زبان میں تالیف کیا اور سیّد محمد نور بخش کے ایک برگزیدہ خلیفہ مولانا حسین کوکبی نے اسکے بعض مندرجات کو فارسی کے سانچے میں ڈالا۔ چنانچہ تحفۃ الاحباب میں آیا ہے کہ......وایں حسین کوکبی درزمان حضرت امام علیہ السلام بتدریس و تعلیم حضرت شاہ قاسم فیض بخش علیہ وعلی آبایہ السلام وسایر اولاد و فرزندان حضرت امام مُشرف بُود و برائے عورات و بنات آنحضرت (محمد نور بخش) کہ قوت فہم عربیہ نداشتند بعضی از واجبات وفرائض وسنن نماز وطہارت از فقہ احوط بفارسی ترجمہ نوشتند (مولانا محمد علی کشمیری، تحفۃ الاحباب، مخطوطہ، باب اول، صفحہ، ۲۱)۔ کتاب تحفۃ الاحباب میں مزید آیا ہے کہ جب حضرت میر شمس الدین محمد عراقیؒ عراق سے دوسری بار کشمیر متوجہ ہوئے اُسی ترجمہ والے نُسخہ کو اپنے چھوٹے بچوں، لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم و تعلم کی خاطر

اپنے ساتھ کشمیر لائے اور اُسی نُسخہ سے مسایل کی تحقیق کر کے صوم وصلوٰۃ اور ساری عِبادات بجالاتے تھے (محمد علی کشمیری، تحفۃ الاحباب، صفحہ ۱۲، ۲۲)

درجِ ذیل اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ فقہ احوط حضرت سید محمد نور بخش کی ہی تصنیف ہے اور حضرت میر عراقی اُسے الغ بیگ مرزا کو بطور تحفہ وہدیہ کے پہنچانا چاہتے تھے...... وبعد از روزی چند ازاں ممالک (خراساں) کوچ ونہضت نمودند متوجہ قندہار شُدند دو چوں بہ قندہار رسیدند می خواستند کہ از راہ کابل بجانب کشمیر بیایند بغرض آنکہ حضرت شاہ ولایت پناہ فقہ احوط حضرت امام ہمام محمد نور بخش برائے تحفہ وہدیہ اُلغ بیگ رسانند (مُلاحظہ ہو تحفۃ الاحباب، باب چہارم، صفحہ ۲۴)

محمد قاسم ہندو شاہ اُستر آبادی حضرت میر عراقی کے ہمعصر مورخ مرزا حیدر دوغلت کا قول نقل کرتے ہوئے اس بات کو خارج از امکان قرار دیتا ہے کہ فقہ احوط حضرت میر شمس الدین محمد عراقی کی ہی تصنیف ہے۔ اُس کا مزید کہنا ہے کہ...... وکتاب احوط تالیف میر شمس عراقی نیست بلکہ یکی از معتمدان گمراہ آنرا تصنیف کردہ (یعنی کتاب فقہ احوط میر شمس الدین محمد عراقی کی تالیف نہیں ہے بلکہ اُنکے کسی معتمد نے اسے تصنیف کیا ہے) (مُلاحظہ ہو، تاریخ فرشتہ، اردو ترجمہ، صفحہ ۳۳۷)

شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مُطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد نور بخش نے اپنے اصول وعقاید کی تعلیمات اپنی منظومات میں پیش کردی ہیں اسکے علاوہ اُنہوں نے نثر میں رسالہ عقاید اور عربی میں الفقہ احوط نام کی کتاب تصنیف کی (ای جی برل، شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام چاپ لندن ج ۴ صفحہ ۲۵۲۔۵۳)

غلام حسن بلتستانی جنکے ذاتی کتب خانے میں تحفۃ الاحباب کا ایک مُکمل مخطوطہ محفوظ ہے، کا بیان ہے کہ میر عراقی بہت بڑے عالم دین اور شعلہ بیان مُقرر تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اُنہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ تحفۃ الاحباب میں اُن کی کسی تصنیف کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے (مُلاحظہ ہو فصلنامہ دانش، چاپ اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۰ء صفحہ ۱۸۸۔۸۹)

محولہ بالا مندرجات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مرزا حیدر کی بات کی قلعی کھل جاتی ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ احوط، سید محمد نوربخش کی عربی زبان میں لکھی گئی تصنیف ہے۔ جسکی تلخیص اُن کے ایک برگزیدہ خلیفہ اور اپنے وقت کے مجتہد مولانا حسین کوکبی نے فارسی زبان میں لکھی اور یہی تلخیص حضرت میر شمس الدین عراقی اپنے ساتھ کشمیر لے آئے تھے جب وہ دوسری بار ۹۰۲ھ میں وارد کشمیر ہوئے۔ لہٰذا جہاں تک حضرت میر عراقیؒ کا فقہ احوط کو تصنیف کرنے کا تعلق ہے وہ سراسر من گھڑت اور فرضی ہے۔

☆۱۸ مرزا حیدر نے بقول خود فقۂ احوط کو ہندوستان کے جن علماء کے پاس بھیج دیا اور جنہوں نے اسکے خلاف اپنا فتویٰ صادر کیا اُنکے ناموں کا اظہار تاریخ رشیدی میں مندرج فتویٰ کے مُطالعہ سے نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخ کا ہی کوئی عندیہ ملتا ہے۔

☆۱۹ مرزا حیدر نے بدعتیوں کے اس گروہ کے مسلک کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ لیکن چونکہ اُسکے گیارہ سالہ دور تسلط (۹۴۷ھ۔ ۵۸) میں کشمیر میں سلسلہ ہمدانیہ، نوربخشیہ، قادریہ، سہروردیہ، کے صوفیاء اور عرفاء سرگرم عمل تھے۔ خود مرزا کا جھکاؤ نقشبندی سلسلہ کی جانب رہا ہے اور اُسکی اپنی تاریخ میں بعض سرکردہ نقشبندی صوفیوں کا تذکرہ بھی درج ہے۔ نوربخشی سلسلہ سے اُسکی دلچسپی کا اظہار بھی اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً خانقاہ زڈی بل میں اُسکی آمدورفت اس بات کی دلیل ہے۔ خانقاہ زڈی بل میں حضرت شاہ سید احمد نوربخشی سے مُلاقات کی اور اس ضمن میں سلسلہ نوربخشیہ کی نسبت اپنا اعتقاد و اعتماد کا اظہار کیا چنانچہ تاریخ میں درج ہے کہ وبعد ازاں بطبقہ بالائی خانقاہ (زڈیبل) با حضرت شاہ (سید احمد نوربخشی) مُلاقات نمود و در محاکات و مکالمات آنحضرت اعتقاد و اخلاص خود بہ سلسلہ شریف نوربخشیہ بسیار اظہار نمود (بہارستان شاہی مطبوعہ صفحہ ۲۴۷)

اسکے علاوہ مرزا حیدر، میر شمس الدین محمد عراقی کے کارہائے نُمایاں کے معترف تھا اور حضرت شیخ دانیال سے بھی اُسکی ملاقات تھی۔

☆★☆

مشعل سُلطانپوری☆

کشمیر......ابوالفضل کی نظر میں

کشمیر کی تعریف میں فارسی اُدب کا معتد بہ حصہ مغل دَور سے تعلّق رکھتا ہے۔ مغل دَربار سے وابستہ اُدباء و شعراء کے علاوہ اس دور میں دَرباری دائرہ سے باہر زندگی گزارنے والے فارسی شعراء بھی کشمیر کی تعریف میں رَطبُ اللسان ہیں۔ دَربار سے وابستہ شعراء کی کشمیر سے دلچسپی کا ایک بڑا سببّ یہ ہے کہ خود مغل بادشاہ یعنی اِن شعراء کے خداوندانِ نعمت کشمیر سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ اِسی عشق کی بناء پر مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدّین بآبر سے لے کر جلال الدّین اکبر تک کشمیر فتح کرنے اور اِسے اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوششیں ہر مغل بادشاہ نے کیں۔ بابر اور ہمایوں تو اِن کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اکبرِ اعظم کا نیرِّ اقبال فتح کا سورج بن کر اُن کے سر پر ضیا پاشیاں کرنے لگا۔ بابر کا زمانہ سلطنت قائم کرنے کی کوششوں میں گزرا اور ہمایوں کا دَور شیر شاہ سوری کی صلاحیتوں اور اُن کی حکمرانی کے باعث ایک عبوری دور ثابت ہوا۔ اصل میں مغل سلطنت کے مستقل قیام اور اِسے استحکام بخشنے کا سہرا جلال الدین محمد اکبر کے سر ہے جس کے زمانہ میں اَمن وامان کے دَور دورہ، ملک کی خوشحالی اور انعامات و عنایات کے غلغلہ نے بیرونِ ملک دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو ہندوستان آنے پر راغب کرنے کے ساتھ ساتھ اندرونِ ملک بھی باصلاحیت لوگوں کو

☆ جٹی روڈ بار ہمولہ کشمیر

جولانیٔ طبع دکھانے کے مواقع فراہم کیۓ۔ اکبر کی جوہر شناس نگاہوں نے پتھروں سے ہیرے تلاش کیۓ اور انہیں چُن چُن کر اپنے دربار کی زینت بنادیا۔ عنایاتِ خسروانہ کی شعاعوں سے ان ہیروں کی آب و تاب میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ابوالفضل کا شمار بھی ان ہی بیش قیمت ہیروں میں ہوتا ہے۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں مجھے ابوالفضل کی چند تصانیف دیکھنے اور اِن کے سرسری مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ترجموں کے ذریعے نہیں، براہِ راست اُسی زبان میں' جس میں یہ لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں دفترِ ابوالفضل یعنی اُن کے مکاتیب، آئینِ اکبری اور اکبرنامہ کی دو ایک جلدیں مطالعہ میں آنے کے بعد میں نے ابوالفضل کے بارے میں جو تاثرات قائم کیۓ تھے چالیس برس گزرنے کے بعد وہ اب میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ مجھے ان کا دقیق اندازِ بیان دیکھ کر غصہ نہیں آتا تھا بلکہ میں مرعوب سا ہو گیا تھا۔ سچ پوچھیۓ تو اِس دَور میں بھی جب مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس قسم کے اسلوب کو خود ایران کے ادیبوں نے ''سبکِ ہندی'' کا نام دے کر ناپسند کر دیا تھا اور یہ اندازِ بیان دُور اَز کار اور پیچ در پیچ استعارات، بے جا طوالت پرتصنّع و پُرتکلف زبان اور محاورے کے ابہام و اہمال کی بناء پر علم و فضل کی فضول نمائش کے سوا اور کچھ نہیں، میں ابوالفضل کی طرز تحریر سے برابر مرعوب ہوں۔ اُن کی عبارت آرائی، رنگین بیانی اور فارسی زبان پر قدرت، اُن کی نازک حنائی اور اُن کے تخیّل کی بلند پَروازی آج بھی اپنا لوہا منوا سکتی ہے۔

جب میں نے یہ مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو بسیار کوششوں کے باوجود ابوالفضل کی یہ تصانیف فارسی میں دستیاب نہ ہوسکیں۔ بمشکل اُن کے انگریزی ترجمے حاصل کیۓ۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں سے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تو آسان ہے لیکن اُن کی تحریروں کی روح تک پہنچنا ناممکن۔ بہر کیف جہاں آدمی کا بس نہ چلے، حسرت و افسوس کے سِوا اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

کشمیر کے بارے میں ابوالفضل کی دو کتابوں سے معلومات فراہم ہوتی

ہیں۔ آئینِ اکبری اور اکبر نامہ اُن کے خطوط میں تو صرف چند اِشارے پائے جاتے ہیں۔ آئینِ اکبری کی دوسری جلد اور اکبر نامہ کا تیسرا حصہ اس سلسلے میں زیادہ کارآمد ہے۔ اکبر نامہ، دربار اکبری سے متعلق ایک قسم کا روزنامچہ ہے جس میں اکبر کے دورِ حکومت میں پیش آنے والے وہ واقعات جو کسی نہ کسی طرح شاہی دربار سے تعلق رکھتے ہیں سال بسال یا ماہ بہ ماہ ہی نہیں، روز بروز درج ہیں۔ اس میں ہمیں اکبر کی فتوحات تو تفصیل سے ملتی ہی ہیں' ان کے ساتھ ساتھ شاہی مزاج، اس کے عادات و اطوار، اس کی پسند و ناپسند، اس کے مشاغل، اُس کے جذبات و خیالات کے علاوہ ملکی حالات کے بارے میں بھی کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آئینِ اکبری' اکبر کی حکومت کا دستور ہے۔ دستور العمل ملکی انتظام، صوبوں کی تقسیم، اراضی اور پیداوار کا تعین' صوبوں کا محل وقوع اور اُن کے جغرافیائی حالات اس کتاب کے اہم موضوعات ہیں۔

اکبر نامہ سے کشمیر کی اس دَور کی تاریخ سے متعلق چند اہم باتیں معلوم ہونے سے کئی غلط فہمیاں دُور ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابوالفضل بادشاہ کے اہم ترین وزیروں میں شامل ہونے کے ناطے بادشاہ کا نمک خوار ہے۔ اس لئے اس کی دربار سے وفاداری قابلِ تعریف ہے لیکن اپنی تصانیف میں وہ بادشاہ کا وفادار ملازم سے۔ اس کا عاشق، اُس پر مفتون اور اُس کا والہ و شیدا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی مورّخانہ غیر جانب داری کو بھی اِسی عشق کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ بالکل سعدی کے اس شعر کے مصداق۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں

بباید گفت اینک ماہ و پرویں

وہ جگہ جگہ اکبر کی غیر معمولی صلاحیتوں کا کلمہ پڑھتا نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اَدبار اور کس مپرسی کے عالم میں پروان چڑھنے، تعلیم و تربیّت سے محروم رہنے اور صاحبانِ علم و فضل اور فہم و ذکا سے فیض نہ پانے کے باوجود اکبر کی ذہنی، فکری

اور انتظامی صلاحیتیں سربرآوردہ لوگوں کو بھی وَرطۂ حیرت میں ڈالتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے قریب رہنے والے لوگوں کو بادشاہ کے الہام پانے، علمِ لدنی عطا ہونے اور فوق الفطری درجہ ملنے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ لیکن ابوالفضل کو اپنی مورخانہ ذمہ داریوں کا احساس تو ہونا ہی چاہئے تھا اور اُسے اپنی عقلِ سلیم کو آنے والی نسلوں کے ہدفِ ملامت ہونے سے بچانے کا خیال رہنا چاہئے تھا۔ جن باتوں کو محض اتفاق کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اُن کو بھی بادشاہ کے عالم الغیب ہونے سے تعبیر کرنے کی کمزوری کا شکار ہونے سے اپنا آپ بچانے میں ابوالفضل ناکام رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعات:

(۱) اکبر جب کشمیر آیا اور یوسف شاہ کے محلات دیکھنے گیا تو کئی کئی منزلوں کے سربفلک محلات اور ان کے اُونچے اُونچے جھروکے دیکھ کر ششدر رہا۔ وہ تعجب سے انہیں دیکھتا جاتا تھا کہ کسی نے اُسے بتادیا کہ یوسف شاہ نے ایک بار نشے کی ترنگ میں آکر ایک حرم کو جھروکے سے نیچے پھینک دیا۔ اکبر نے محل کے آس پاس گھومتے وقت ایک جھروکے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اُس جھروکے سے اُس بدنصیب حرم کو پھینکا ہوگا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بادشاہ کی بات سچ تھی۔ اس پر سب لوگ عش عش کرنے لگے۔ (۲) ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ گانے کی آواز سُنائی دی، اکبر نے درباریوں سے پوچھا مغنّیہ کی عمر کیا ہوگی؟ غور کرنے کے بعد وہ کہنے لگے چالیس برس سے زیادہ اور پچاس برس سے کم۔ بادشاہ نے کہا بیس برس سے زیادہ اور تیس برس سے کم۔ جب اصلیت کا پتہ چلایا گیا تو بادشاہ کا اندازہ صحیح تھا۔

ابوالفضل نے تاریخ کشمیر سے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر راج ترنگنی پر قائم کی گئی ہے۔ وہ خود بھی لکھتا ہے کہ ''جب پہلی بار اکبری دَربار کشمیر پہنچا تو اُنہیں سنسکرت میں لکھی ہوئی ایک کتاب راج ترنگنی پیش کی گئی جس میں چار ہزار برس دوران کشمیر پر حکومت کرنے والے بادشاہوں کے حالات درج تھے۔ وہاں کے بادشاہوں کا یہ طریقہ تھا کہ عالموں کو اپنے دَور کے حالات لکھنے پر مامور کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔'' ابوالفضل نے ستی سر کی کہانی

دُہرانے کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کی فہرست، اُن کا زمانۂ حکومت اور اُن کے خاندانوں کا شجرہ راج ترنگنی سے لیا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں مُلّا احمد کی تاریخِ کشمیر کے علاوہ، مقاماتِ اولیاء کشمیر از بابا حاجی ادھمی (بڈشاہ) تاریخِ قاضی ابراہیم (درعہدِ حسن شاہ) اور تاریخِ سیّد علی (درعہدِ چکاں) جیسے فارسی ماخذ بھی آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس سے ابوالفضل کی طبیعت میں تحقیق و جستجو سے لگاؤ نہ ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابوالفضل نے اکثر وبیشتر گول مول باتیں پیش کی ہیں اور اس اصل واقعات پیش کرنے میں جانب داری سے کام لیا ہے اور بادشاہ کی غلطیوں سے چشم پوشی کی ہے۔ پھر بھی جہاں وہ بادشاہ کی بڑائی جتاتے ہوئے اس کی مطلق العنانی اور شاہی دبدبے کا ذکر کرتا ہے اس کے قلم سے ایسے واقعات صفحۂ قرطاس پر آہی جاتے ہیں جن سے بادشاہ کی قہاری، شقی القلبی اور بے رحمی بے نقاب ہوتی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ کسی درباری کی زبان سے ایک شہزادے کی شان میں ایک قابلِ اعتراض لفظ نکلا اور شہزادہ خفا ہو گیا تو بادشاہ نے درباری کی زبان کا ایک حصہ کٹوانے کا حکم دیا۔ اسی طرح زندہ شخص کی کھال اُتروانا، ہاتھی کے پاؤں میں ڈالنا، کولھو میں پلوانا وغیرہ ثابت کرتا ہے کہ بادشاہ کی طبیعت میں چنگیزی خونخواری کا شائبہ بھی تھا۔

اکبر کے کشمیر پر قبضہ کرنے کا حال بیان کرتے ہوئے سب سے پہلا واقعہ یوسف شاہ کے اکبری دربار میں آنے کا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اُس کا باپ علی شاہ کشمیر کا بادشاہ تھا۔ وہ چوگان کھیلتے گھوڑے کی زین کے گھنڈے سے زخمی ہو کر مر گیا۔ اُمرائنے یوسف کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے چچیرے بھائی اَبدال نے تخت چھیننا چاہا۔ یوسف نے اُس کے مکان کو گھیرے میں لیا اور ابدال مارا گیا۔ سیّد مبارک، عبدالمعالی، اُس کے بیٹے علی خان، حیدر چک، علی ملک جیسے اُمراء نے یوسف کے چچیرے بھائی یعنی حسین خان کے بیٹے یوسف کو بادشاہ بنانا چاہا۔ شر پسندوں نے سید مبارک کو اُکسایا تھا۔ یوسف شاہ بادشاہ کے ساتھ عیدگاہ میں جنگ ہوئی تو حکمران یوسف شاہ میدان میں آنے سے پہلے ہی بھاگ گیا۔ وہ پیر پنچال پار کر کے تھنہ پہنچا تھا کہ اُسے کشمیری

امراء نے خطوط لکھ کر واپس بلایا۔ یوسف شاہ واپس گیا لیکن خطوط لکھنے والوں نے ساتھ نہ دیا۔ سیّد مُبارک مقابلے پر آیا تھا۔ یوسف شاہ پھر بھاگ کر مرزا یوسف خان اور راجا مان سنگھ کے پاس لاہور پہنچا۔ بادشاہ کے دربار میں آکر زمین بوسی کی اور عنایات خسروانہ سے نوازا گیا[1]۔ یہ بات ذہن میں رکھنا مفید ہوگا کہ اکبری دربار اور کشمیر کے تعلق سے اس زمانے میں تین اہم آدمی ہم نام تھے۔ ریاست کا حکمران یوسف شاہ چک، اُس کا چچیرا بھائی یوسف بن حسین چک اور اکبر کا ایک خاص امیر مرزا یوسف خان، ان تینوں کو اکثر خان بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے ان کا ذکر کہیں کہیں خلط ملط بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب مرزا یوسف خان کو کشمیر کا صوبیدار بنایا جاتا ہے۔ بہر حال ابوالفضل یہ نہیں لکھتا کہ یوسف شاہ چک مدد مانگنے آیا تھا۔ یہ اکبر کی تخت نشینی کے چوبیسویں سال کا واقعہ ہے۔ اکبرنامہ کی اِسی جلد کے صفحہ نمبر ۴۱۵ پر تخت نشینی کے پچیسویں سال میں ہونے والے واقعات بیان کرتے ہوئے ابوالفضل یوسف شاہ کے کشمیر لوٹنے کا ذکر کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سیّد مبارک کو دو ماہ کے اندر اندر تخت سے اُتارا گیا تھا اور یوسف شاہ کے چچیرے بھائی لوہر چک کو تخت سونپا گیا تھا۔ یوسف شاہ نے دربار میں آداب بجالا کر واپس کشمیر جانا چاہا تو اُسے اجازت دی گئی اور پنجاب میں موجود افسروں کو اُس کے ساتھ کچھ فوج بھیجنے کی ہدایت کی گئی۔ کشمیریوں نے یوسف شاہ کو خطوط لکھے اور اپنے ساتھ فوج لانے کے نتیجہ سے آگاہ کیا اور کہا کہ اکیلے چلے آؤ تخت تمہارا منتظر ہے۔ فوج تیار کر لی گئی تھی لیکن وہ چُپکے سے چلا گیا۔ بہرام گلہ میں اُس کا استقبال ہوا۔ وہاں کا حکمران مقابلے پر آیا۔ یوسف شاہ نے تاب مقاومت نہ پا کر سوپور کی راہ لی۔ لوہر چک نے پیچھا کیا وہاں یوسف شاہ نے دریا کو عبور کیا تو دیکھا کہ اُس کے ساتھ تھوڑی فوج ہے، مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا، لوہر چک کو گرفتار کر کے اُس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی۔

ابوالفضل نے اکبر کے توسیع پسندانہ عزائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] اکبرنامہ جلد سوم ۴۸۸، ترجمہ BEVERIDGE، انڈین ایڈیشن ۱۹۷۳ء

اُس نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اکبر نے اس سلسلہ میں کسی قسم کی پیش قدمی کی لیکن بین السطور یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اکبر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بے چین تھا۔ ابوالفضل ان واقعات کا عینی گواہ ہے۔ اس کے بیانات سے یہ غلط فہمی مکمل طور پر دُور ہوجاتی ہے کہ کشمیر کے سربرآوردہ لوگوں نے اکبر کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اکبر کو کشمیر پر تسلط جمانے کا موقع خود یوسف شاہ چک نے فراہم کیا۔ وہ اکبری دربار میں تھا کہ اُس کے بیٹے یعقوب نے کشمیر میں حکومت سنبھالی اور کچھ ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں نے اکبر تک معاملہ پہنچایا۔ اس لئے نہیں کہ اکبر کشمیر پر قبضہ کرے بلکہ اس لئے کہ اکبر یعقوب کو تنبیہ کرے اور ظلم وستم سے باز رکھے۔ کشمیر اس وقت بھی اکبر کی باج گزار ریاست تھی اور خود یوسف شاہ نے اس کی اطاعت کا طوق گلے میں ڈالا تھا۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب اکبر نے صالح عاقل کو یوسف شاہ کے پاس کشمیر بھیجا تو یوسف نے اپنے چھوتے بیٹے حیدر کو تحفہ تحائف دے کر دربار میں بھیجا اور اطاعت کا ثبوت دیا۔ ابوالفضل صفحہ ۵۵۰ پر لکھتا ہے ''عالم پناہ اپنے عہد کے شہزادوں سے اطاعت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے، جب وہ اطاعت چاہتے ہیں تو شاہی طاقت استعمال نہیں کی جاتی۔'' اسی سلسلے میں صفحہ ۵۷۶ پر لکھتا ہے ''جب صالح نے حکمران کشمیر کی اطاعت کی خبر دی اور کہا کہ یوسف نے اکبری عنایات سے محروم ہونے کی حسرت کا اظہار کیا ہے تو اکبر نے شیخ یعقوب کشمیری کو بھیجا اور اس کے ساتھ حیدر کو یوسف کے لئے اعزازات دے کر رخصت کیا۔'' اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۶۷۶ پر درج ہے کہ ''یوسف نے دیکھا کہ دربار میں اُس کی عزت افزائی ہورہی ہے تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے یعقوب کو عالم پناہ کی خدمت سے فیض اُٹھانے کے لئے دربار میں بھیجا۔ اُس نے آکر تسلیمات وکورنشات بجالائے اور انعام واکرام سے سرفراز ہوا۔'' اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۰۷ پر لکھا ہے کہ جب اکبر ۱۵۸۵ء میں پنجاب روانہ ہوا تو کلانور پہنچ کر اُس نے یوسف کو بلوانا چاہا۔ یوسف خان حاکم کشمیر اکبر کو تحائف بھیجا کرتا تھا اور اپنے آپ کو بادشاہ کا مطیع مانتا تھا۔ دربار میں حاضری دینے میں وہ طویل

مسافت بہانہ بناتا تھا۔ چونکہ پنجاب آنا مشکل نہ تھا اور یوسف نے بھی چند خطوط لکھ کر خود نذر گزارنے کی خواہش کی تھی۔ اس لئے یوسف کو بلایا گیا۔ یعقوب کو کچھ شُبہ ہوا تو وہ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ یہ ۲۲/اگست ۱۵۸۵ء کا واقعہ ہے۔ یوسف شاہ کو لکھا گیا کہ یعقوب کو تادیب کی جائے اور اُسے واپس بھیج دیا جائے۔ اکتوبر میں حسن ابدال کے مقام پر حکیم علی اور بہاء الدین کمبو کشمیر سے واپس آکر حاضر ہوئے۔ اُن کے ساتھ یوسف شاہ تھا نہ یعقوب، اس لئے لشکر کشی کا حکم دیا گیا۔"

حیدر ملک چاڈورہ لکھتا ہے کہ اکبر یعقوب کے دربار میں آنے سے خوش نہیں ہوا تھا۔ یعقوب کے پہنچنے پر کہا تھا "یوسف خود نہیں آیا، پہلے ایک بچے کو بھیجا جو خدمت کے قابل نہیں، پھر یعقوب کو جو پاگل پن اور شرارت سے مبرّا نہیں"۔ اس بات کے پیش نظر یعقوب فتح پور میں دو برس رہ کر بھی دربار سے بھاگ گیا۔

۲۰/دسمبر ۱۵۸۵ء کو شاہ رخ بہادر، بھگوان داس، شاہ قلی محرم، مبارک خان کے ہمراہ زیر کمان محمد علی اکبر شاہی فوج بھیجی گئی۔ پہلے طے پایا کہ بھمبر کے راستے سے جائیں، جب سرما ختم ہو تو درّے عبور کریں۔ لیکن پھر پکھلی سے جانے کا حکم دیا گیا۔ یوسف خان نے مقابلہ کرنا چاہا۔ اُس نے دریائے نین سکھ پر قلعہ بندی کرنے کے لئے تجربہ کار لوگ بھیجے۔ اُس کی فوج بارہمولہ سے چھ کوس آگے گئی تھی کہ اکبری یلغار کی خبر ملی۔ اُمراء نے زمستان اور نا قابل عبور درّوں کا حوالہ دے کر اُسے غافل کر دیا۔ اکبری فوجیں بلیاس پہنچیں تو انہیں ہوش آگیا۔ ابوالفضل اپنی فوجوں کی شکست کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔ نہ یہ کہ اکبری سالار نے صلح کرنے کی پیش کش کی۔ بلکہ یہ لکھتا ہے کہ ایک دن یوسف فوجوں کے معائنہ کے بہانے قوار مست میں نمودار ہوا اور اپنی آرزو ایلچی کے ذریعے بھیجی۔ لیکن اُس کا یہ اشارہ کہ شاہی افسر اور سپاہی سردی سے تنگ آئے تھے، غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ پسپائی کس طرف سے تھی۔ بہر حال صلح ہوئی اور طے پایا کہ یوسف دربار میں آئے گا۔ بادشاہ نے صلح منظور کی لیکن اُسے فوجوں کا لوٹنا ناپسند ہوا۔ وہ کشمیر کو فتح کر کے یوسف کے حوالہ کرنا چاہتا تھا۔ یوسف

جب دربار میں پیش ہوا تو بادشاہ نے اُسے اپنی غلطیاں یاد دلائیں۔ یوسف شرمندہ رہا اور خاموش۔ بادشاہ نے اُسے کشمیر واپس کرنے کا ارادہ کیا لیکن امراء نے مشورہ دیا کہ اُسے یہیں رکھا جائے۔ پہلے کشمیر کو فتح کیا جائے پھر اسے سونپا جائے (ملاحظہ ہو صفحہ ۷۲۸) اُسے ٹوڈرمل کے حوالہ کیا گیا۔ اکبرنامہ میں بھگوان داس کے اقدامِ خودکشی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بہرحال یعقوب نے کشمیر کی حکومت سنبھالی۔ جب اُس کے متعلق شکایتیں دربار میں پہنچیں تو پھر فوج بھیجی گئی۔ اس بار بھی ابوالفضل اپنی شکست کا ذکر نہیں کرتا۔ اسی کتاب کے صفحہ ۷۶۲ پر درج ہے کہ ''یعقوب نے معاہدہ توڑا اور مشیروں نے اُسے شاہ اسمٰعیل کا لقب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اُس نے ظلم کا دروازہ کھولا، سُنیوں کو ستانے لگا، قاضی موسیٰ کو شہید کیا، شمسی اُس کے خلاف اُٹھا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور شمسی چک کو صلح کرنے پر کمراز کا علاقہ ملا۔ لیکن یعقوب نے جلد ہی چھین لیا۔ غرض بدامنی کا دَور دَورہ تھا'' ۱۱ستمبر ۸۶ء کو پھر فوج کشی ہوئی۔ بھمبر کے راستے سے فوج گئی، کشمیریوں نے مقابلہ کیا۔ یعقوب خود شہر میں تھا۔ جب وہ ہیرہ پور پہنچا تو پتہ چلا کہ کوئی اُس کا ساتھ نہ دے گا۔ اُسے مشورہ دیا گیا کہ کشتواڑ چلا جائے۔ کشمیریوں نے پہلے حسین چک اور پھر شمسی چک کو سردار بنایا۔ لڑائی ہوئی اور مغل فوج ہار گئی'' ابوالفضل اس شکست کے بارے میں بھی خاموش ہے۔ اسی سال مغلوں نے دوسری بار حملہ کیا اور قاسم خان میر بحری خود فوج کے ساتھ تھا۔ مغلوں نے اپنے ساتھ آنے والے کشمیریوں کو قید کیا، کشمیریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ناکام رہے۔ اور مغل فوج سرینگر میں داخل ہوئی۔ یہ اکتوبر ۱۵۸۶ء کا واقعہ ہے۔ ۱۵۸۷ء میں یعقوب کشتواڑ سے آیا اور چھاپہ مار لڑائی شروع کی۔ اب مرزا یوسف خان، قاسم خان کی جگہ کشمیر کے صوبیدار مقرر ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ حاکم خان کشمیریوں کی چھاپہ مار لڑائی سے تنگ آیا تھا اور اس نے واپس بلائے جانے کی درخواست کی تھی۔ (ملاحظہ ہو اکبرنامہ جلد ۳ / صفحہ ۷۹۶)۔

اب اکبر نے خود کشمیر جانے کا ارادہ کیا اور بھمبر کا راستہ منتخب کیا۔ یہ سال

۱۵۸۹ء کا واقعہ ہے۔ کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنے کے بعد وہ پکھلی کے راستے واپس گیا۔ یعقوب چک نے پہلے بھائی کے ذریعے اور پھر خود آکر معافی مانگی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اُس نے لکھا تھا ''جوانی کی ترنگ میں جو ہُوا سو ہُوا، اَب بادشاہ اپنا چپل بھیجے جسے میں اپنے تاج پر رکھ کر حاضر ہو جاؤں۔ صفحہ ۸۷۷ پر لکھا ہے کہ چند کشمیری اُمراء بھاگ کر کشمیر گئے اور علی رینہ کے پاس پناہ لی۔ وہاں انہیں مغل حاکموں نے پکڑ کر سرینگر میں پھانسی دے دی۔ صفحہ ۸۸۳ پر یعقوب اور اُس کے بھائی کے فرار ہونے کی کوشش کا ذکر ہے، جسے ناکام بنایا گیا اور انہیں مان سنگھ کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے تین سال بعد اکبر دوسری بار پیر پنچال کے راستے کشمیر آیا۔ شمسی چک کی بیٹی داخلِ حرم ہوئی اور حسین چک کے بیٹے مبارک خان کی بیٹی سلیم کے حرم میں شامل ہوگئی۔ خواجہ شمس الدین صوبیدار رہا۔ اس کے پانچ سال بعد اکبر تیسری بار واردِ کشمیر ہوا۔ ہیرہ پورہ کے راستے سے آیا اور اسی راستہ سے لوٹا۔ پہلے وہ پکھلی کے راستہ سے لوٹا کرتا تھا۔ اس بار ریاست کا بندوبست ہوا، ملکی انتظام پر توجہ ہوئی اور ناگرنگر کے گرد فصیل تعمیر ہوئی۔

ابوالفضل کشمیر میں شہنشاہ اکبر کے جن مشاغل کا ذکر کرتا ہے، اُن میں دریائی سیر، آبی جانوروں کا شکار، ولر کی سیر، صوفیوں سنتوں سے ملاقات، گھوڑ سواری، چناروں کی چھاؤں سے لطف اندوزی، ڈلر میں کشتی رانی، زعفران کے کھیتوں میں تفریح اور تعمیرات سے دلچسپی اور اس سلسلے میں اقدامات شامل ہیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ کشمیر میں اکبر دریائی سفر کا شوقین تھا۔ وہ کھنہ بل تک کشتی میں جاتا تھا۔ ایک بار اچھابل گیا تو گھوڑے پر سوار ہو کر۔ اُن دنوں آبی جانوروں کے شکار کا طریقہ بڑا دلچسپ تھا۔ لوگ باز پالتے تھے اور اُن کو کندھوں پر بٹھا کر کشتی میں سوار ہوتے تھے۔ جونہی آبی پرندے نظر آتے اپنے سے باز اُڑاتے۔ یہ باز کافی اونچائی تک اُڑ کر زور سے پرندوں پر جھپٹتے اور ان کو پنجوں میں پکڑ کر ان کی پیٹھ پر کھڑے رہ کر، انہیں پانی میں تیرا کر کشتی تک لے آتے۔ یہ بڑا دلکش نظارہ ہوتا تھا۔ اکبر نے بھی یہ شکار کھیلا۔ اسلام آباد جاتے ہوئے انہوں نے واحد صوفی کی جھونپڑی پر جا کر اُس سے ملاقات

کی۔ کشتی ہی کے ذریعے دوسرے اور تیسرے سفر کے دوران زعفران کے کھیت دیکھنے گئے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ گلاب کے باغ دلفریبی اور خوشبو میں لاجواب ہیں۔ اگرچہ کنول جیسے دلکش نہیں لیکن ان کی دلکشی بے مثال ہے۔ اکبر جہاں سیر کو جاتا وہاں صرف تفریح میں محو نہیں ہوتا تھا بلکہ اس جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور اپنے مشاہدہ سے بھی خوب کام لیتا تھا۔ ابوالفضل کے بیانات، زبان، جغرافیائی حالات، تہذیب و تمدن اور حکومت کے اعتبار سے کشمیر کو ایک الگ تھلگ دیس ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ دیس بانہال سے اوڑی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا حدودِ اَربعہ، مشرق میں پرستان اور چناب، جنوب مشرق میں بانہال اور جموں کی پہاڑیاں، شمال مشرق اور شمال مغرب میں تبت، جنوب مغرب میں گکھر اور مغرب میں پکھلی اور کشن گنگا قرار پاتا ہے۔ وہ اس کی لمبائی ۱۲۰ رکوس اور چوڑائی دس سے پچیس کوس (کوس: پونے تین میل) درج کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے چاروں طرف ہمالیہ کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کشمیر سے باہر جانے کے چھبیس راستے ہیں جن میں سے بھمبر اور پکھلی کے راستے گھوڑسواری کے قابل ہیں اور بھمبر کا راستہ نزدیک ترین ہے۔

وہ یہاں کے لوگوں کی زبان کو کشمیری کا نام دیتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ لفظ کشمیری سنسکرت سے تعلق رکھتا ہے یا فارسی سے لیکن یہ بات واضح کرتا ہے کہ کشمیر کے لوگ یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنے ملک کو ''کشیر'' اپنے آپ کو ''کاشُرِ'' اور اپنی زبان کو ''کاشُر'' لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔ وہ کشمیری کو ایک ہی زبان سمجھتا ہے اور لکھتا ہے کہ جموں صوبے اور وادیٔ چناب کی بولیوں، پوگلی، سراجی اور رام بنی کا تعلق بھی اسی زبان سے ہے۔ ان کی شکلیں اس بناء پر مختلف دکھائی دیتی ہیں کہ یہاں کشمیری، ڈوگری میں ضم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ریاسی ضلع کی کئی بولیاں کشمیری زبان کے لہندا کی بولی چبل سے ملنے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں۔ کشمیری کی ایک خاص بولی صرف کشتواڑ میں پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ کی رُو سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بولی میں ذرا سا فرق ہے۔ وہ کشمیری زبان کو دردی اور

شنا خاندان کی زبان قرار دیتا ہے اور سنسکرت سے اس کے رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس زبان کو سنسکرت جتنی قدیم زبان سمجھتا ہے۔

ابوالفضل کے زمانے میں مغل سلطنت انتظامی امور کے پیش نظر صوبوں میں منقسم تھی اور صوبے سرکاروں میں، سرکاریں پرگنوں یا محالوں میں اور محال دستوروں میں یعنی صوبہ موجودہ زمانہ کی سٹیٹ اور سرکار، ڈویژن یا پراونس، پرگنے یا محال، موجودہ زمانہ کے ضلع ہوں گے۔ کشمیر کی حیثیت ایک سرکار کی تھی اور یہ سرکار صوبہ کابل میں شامل تھی۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق کشمیر سرکار کے دو حصے تھے، مراز اور کمراز، سرینگر مراز میں شامل تھا۔ مراز تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ سرینگر، شمال مشرقی پرگنہ اور شمال مغربی پرگنہ۔ اوّل الذکر تین محالوں، ثانی الذکر سات محالوں اور ثالث الذکر گیارہ محالوں پر مشتمل تھا۔ یعنی مراز کے کل اکیس محال تھے۔ کمراز کے صرف سولہ محال، کمراز خود ایک محال کا نام بھی تھا، جب کہ مراز کسی محال کا نام نہ تھا۔ مراز کا مالیہ ۱۷۹۲۸۱۹ خروار مقرر تھا اور کمراز کا ۱۲۱۸۷۹۹ خروار۔ مراز میں رسالہ فوج تھی ۱۶۲۰ اور پیدل ۴۶۰۰ کمراز میں پیدل فوج ۱۶۹۶۵ اور رسالہ ۱۵۹۰ ظاہر ہے کہ کمراز فوجی اعتبار سے اہم تھا اور مراز زرعی اعتبار سے۔

لگان کے سلسلے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ ''یہاں مالیہ نقد میں وصول کرنے کا رواج نہیں، صرف سائر المواضع میں کہیں کہیں نقد میں لیا جاتا ہے۔ پیداوار کا ایک تہائی لگان مقرر تھا لیکن عملاً دو تہائی لیا جاتا تھا۔ اکبر نے نصف پیداوار لینا مقرر کیا۔'' ابوالفضل کے بیان کی رُو سے بڈشاہ کے زمانے میں مالیہ کا تخمینہ ۷۷ لاکھ خروار تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہمیریوں کے نالائق جانشینوں اور چکوں کے دور کی خانہ جنگی اور بدامنی کے علاوہ بیرونی حملوں سے تباہی کے نتیجہ میں اکبر کے زمانہ میں لگان کا تخمینہ تیس لاکھ خروار کے لگ بھگ ہی تھا۔

اکبر نے لگان کے علاوہ لئے جانے والے ۵۵ ٹیکس معاف کئے، خصوصاً باج اور تمغہ جس سے لگان میں ۲۷۸۲۴ خروار کی کمی ہوئی۔ اکبر نے یہ اقدام نہ صرف اس

غرض سے کیا کہ ریاست میں خوشحالی کا دور دورہ ہو بلکہ اس لئے بھی کہ لوگوں کے دل جیتے جاسکیں۔ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کے لئے اکبر نے ناگرنگر (قلعہ ہاری پربت کا علاقہ) کے گرد بہت چوڑی اور اونچی فصیل تعمیر کرنے کا حکم دیا جس سے بہت سے لوگوں کے روزگار کی سبیل پیدا ہوگئی بلکہ دوسری بار کشمیر آنے پر عیدگاہ میں نقد رقم بھی تقسیم کی اور تیسری مرتبہ دورۂ کشمیر کے دوران چودہ مقامات پر لنگر کھولے اور ہرائیت وار کو لوگوں میں نقد رقم تقسیم کرتے رہے۔ عوامی، فصلی اور مذہبی تہواروں میں شمولیت کی اور چک شہزادوں کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں۔ اکبر کے ان اقدامات سے جہاں اُس کی سیاسی حکمت عملی، اعلیٰ تدبر اور عوام الناس کی نفسیات سمجھنے کی صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اکبر نے طاقت استعمال کرنے کے سارے حربے بے کار ثابت ہوتے دیکھے تو فیاضی، دَریادِلی، جود وسخا اور مہر ومحبت کے ساتھ ساتھ ترغیب وتحریص کے ذرائع بھی کام میں لائے۔ اِس سے جہاں کشمیریوں کی بہادری، دلیری اور شجاعت جیسی خوبیوں کی داد دینے کو جی چاہتا ہے وہاں ان کے ہوسِ زر، ذات پسندی، نااتفاقی اور شکم پروری جیسی برائیوں پر افسوس ہوتا ہے۔ ابوالفضلؔ کے بیانات اُن لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ زور زبردستی اور دباؤ یا دھمکیوں سے کشمیریوں پر حکومت کی جاسکتی ہے۔ ان پر آزمانے کا بہترین نسخہ ہے خلوص ومحبت، ایثار وہمدردی، رواداری اور بھائی چارہ۔

ابوالفضل کی تحریر کشمیریوں کے دلوں میں کشمیریت کے شدید احساس ہونے پر بھی مہر تصدیق ثابت کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”سُنّی اِمامیہ اور نور بخشیہ ایک دوسرے کے ساتھ مستقبل طور دست وگریباں ہیں لیکن یہ باہر سے آئے لوگ ہیں خاص کر ایران اور ترکستان سے۔ خود کشمیری بھی انہیں جذب نہیں کرسکتے۔ ان کے خیال میں اصلی کشمیری بہت امن پسند ہیں اور پیار ومحبت کے بھوکے۔ علم وفضل کے لئے وہ ہندوؤں کی سراہنا کرتے ہیں اور برہمنوں کو معزز ترین طبقہ قرار دیتے ہیں جو رسم و روایت کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی ضرورت کے باوجود خدا کے سچے پجاری

ہیں''۔ مغلوں کے زمانے میں بھی بقول ابوالفضل علمی کتابیں سنسکرت میں تھیں، کشمیری صرف بولی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''پرانے زمانے میں ہندوؤں کا علم مروّج تھا لیکن ان دنوں کئی علوم سیکھے جاتے ہیں''۔ کشمیریوں کے نجوم اور ہیئت کے علوم ان کے بقول ہندوؤں کی طرح کے ہیں۔ اُس زمانے میں یہاں بھوج پتر لکھنے کے کام آتا تھا۔ وہ اس کے لئے ''توز'' لفظ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ ایک درخت کا چھلکا ہے جو تہوں کی صورت میں درخت سے کاٹ کر اُتارا جاتا ہے۔ اُن کے تمام پُرانے دستاویزات اسی پر لکھے ہوئے ہیں۔'' مسوّدات کی تیاری اور سیاہی بنانے میں وہ کشمیریوں کی مہارت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سیاہی دھونے سے جاتی ہے نہ مٹانے سے مٹتی ہے۔ ابوالفضل نے کشمیر میں سادات اور علماء کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن اُن کا ریشیوں کی تعریف کرنا اور اُن کی تعداد دو ہزار بتانا ثابت کرتا ہے کہ اُن کے زمانے میں ریشی سلسلہ نہایت مقبول تھا۔ لکھتے ہیں ''وہ مختلف عقیدہ رکھتے والوں کو بُرا بھلا نہیں کہتے، بھیک نہیں مانگتے، نہ تنگ کرتے ہیں۔ راستے میں ثمر دار درخت لگاتے ہیں اور لوگوں کی بھلائی کے کام آتے ہیں۔ وہ گوشت نہیں کھاتے اور شادی نہیں کرتے۔ اس قسم کے قریب دو ہزار لوگ ہوں گے''۔

ابوالفضل کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ مغلوں کو فتح کرنے میں کوئی اقتصادی فائدہ نہ تھا۔ وہ فوجی لحاظ سے بھی اہم نہیں سمجھتے تھے۔ کشمیر کی جو کچھ اہمیت تھی وہ صرف ایک تفریح گاہ کی حیثیت سے تھی۔ یہ مغلوں کو یہاں پہنچنے میں ناقابلِ بیاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بادو باران کا شکار ہونا، پہاڑوں پر سے لڑھک جانا، برف اور یخ پر پھسل کر گہری کھائیوں میں گرنا، سپاہیوں اور گھوڑوں کا نقصان، سردی سے ہمراہوں کا لقمۂ اجل ہونا وغیرہ وغیرہ، خود اکبر دو ایک بار گھوڑے سے گر کر بمشکل جان بچا سکا۔ لیکن جب وہ ان تمام صعوبتوں کا سامنا کرنے کے بعد اس جنتِ ارضی میں پہنچ جاتے تھے تو سارا دکھ درد اور سفر کی تمام صعوبتیں بھول جاتے تھے۔ ان کے لئے کشمیر کی حیثیت ایک بہترین سیر گاہ کی تھی۔ ابوالفضل نے یہاں کے

سبزہ زاروں، آبشاروں، برف پوش پہاڑوں، کھنکتے پانیوں، چھلکتے چشموں، جھنجھناتے جھرنوں، نغمہ زن نالوں، ندیوں اور انواع قسم و اقسام کے پھولوں اور شیرین و خوش ذائقہ پھلوں کی خوب تعریف کی ہے۔ لیکن ان تعریفوں میں ادیبانہ انداز سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ایک سفرنامہ نویس کی طرح جیسے لکھنا تھا، لکھا گیا ہے۔ وہ اس ملک کو مسحور کن سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک سر بفلک قلعہ کے اردگرد جیسے دائمی بہار لیا ہوا باغ ہو۔ یہ دنیاداروں کے لئے طرف افزا ہے اور زاہدوں کے لئے خلوت گاہ، اس کے چشمے ذائقہ کے لئے شیرین، اس کے آبشار سامع کے لئے نغمہ، اس کی آب و ہوا زندگی بخش، ترکستان ایران جیسی بارش اور برف وہاں سے ملتی جلتی، موسمی بارشیں ہندوستان کی طرح، پھول دلفریب اور طرف افزا۔ بنفشہ، گلاب اور جنگلی نرگس سے میدان بھرے ہوئے ہیں۔ پھولوں کی تفصیل بتانا ناممکن ہے، بہار اور خزاں حد درجہ حسین ہیں۔" وہ پہلی بار اکبر کے ہمراہ کشمیر آتے ہوئے بہرام گلہ پہنچا تو لکھا "خوبصورت جگہ ہے، پھولوں کے انواع اور آب و ہوا میں چند ہی جگہیں اس کا جواب ہیں، پشیانہ میں جنگل سے بھری پہاڑیوں، بے شمار پھولوں اور آبشاروں سے دل کو فرحت ہوئی...... درختوں، پھولوں، فرحت بخش ہوا، آبشاروں کے نغمے حیرت میں ڈالتے گئے اور راستہ کی تکلیف بھلاتے گئے لیکن جب میدانوں میں آئے تو ایک نئی دنیا سامنے تھی، نئی جنت نے چہرے سے نقاب اُٹھائی۔"

ابوالفضل کشمیر میں بہنے والے دریا کے لئے "بہت (وبتھ)" لفظ استعمال کرتا ہے اور دریا اور ندیوں پر کدل (پُل) ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے زمانے میں دریا پار کرنے کے لئے لکڑی کے بنے ہوئے پُل تھے اور لکڑی کی بنی ہوئی کشتیاں۔ کشتی رانی عام تھی، دریائی ٹرانسپورٹ ہی کا رواج تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے یا بوجھ ڈھونے کے لئے کشتیاں تھیں۔ کشتیوں کی کئی قسمیں تھیں، شکارہ ڈونگے، بار بردار کشتیاں (بُہثر) اور (زوہرقہ) یعنی شکاری کشتیاں۔ دریائی جلوس نکالنے کا رواج تھا۔ حکمران طبقہ یا رئیسوں کی دریائی سیر کے وقت پرندے کام میں

لائے جاتے تھے۔ اکبر کشتی ہی کے ذریعے انت ناگ اور بارہمولہ جاتے تھے۔ کشتی میں ہی ڈل کی اور ولر کی سیر کو جاتے۔ کشتیوں اور لکڑی کے مکانوں کے رواج سے نجاروں اور ہانجیوں کی چاندی تھی، یہ دونوں پیشے خوب نفع بخش تھے۔ سڑکیں نہیں تھیں۔ خشکی کا سفر گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر کیا جاتا تھا یا پیدل۔ خشکی اور پہاڑی علاقوں میں باربرداری کا کام گھوڑوں اور گدھوں کے علاوہ بیلوں اور بھیڑوں سے لیا جاتا تھا۔ آدمی بھی بوجھ ڈھوتے تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ہاتھی اور اونٹ اس ملک میں نہیں ہوتے۔ گائیں کالی اور بھدی ہوتی ہیں لیکن ان کا دودھ نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ گھوڑے پست قد ہیں لیکن مضبوط اور دشوار راستوں پر چلنے والے۔ بھیڑوں کی ایک عمدہ قسم ہے جسے ہنڈو کہتے ہیں، ان کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے اور صحت بخش۔

معاشرتی حالات میں ذرائع آمدورفت کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے کے عادات اور لباس کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ پٹو کا لباس پہنتے تھے جو عام طور پر ایک ہی کپڑے پر مشتمل ہوتا تھا یعنی ''پھرن'' (پیراہن)۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ کئی سال چلتا ہے۔ یہ لوگوں کے افلاس کا ثبوت ہے۔ وہ لوگوں کی اقتصادی پسماندگی، ان کے افلاس اور ادبار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''یہاں کے لوگ اس ملک کا ملال ہیں''۔ عسرت و تنگدستی، افلاس و فاداری کے باوجود وہ یہاں کے لوگوں کی دو خوبیوں کی طرف خاص طور پر اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ''تعجب یہ ہے کہ گزراوقات کے لئے ذرائع کی کمی اور آبادی کی کثرت کے باوجود چوری اور بھک منگی بہت کم ہے''۔ رہائش کا حال لکھتے ہوئے لکڑی کے مکانات کا ذکر کرتا ہے جو اُس کے زمانے چار چار پانچ پانچ منزلہ بھی ہوتے تھے۔ شاید یہ امیروں کے مکان ہوں گے۔ مکانات صحن بند نہیں ہوتے تھے۔ پہلی منزل میں گاؤ خانے اور گودام، دوسری منزل میں رہائش اور تیسری منزل اور چوتھی منزل اسبابِ خانہ رکھنے کے کام آتی تھی۔ اُس کے بقول لکڑی کی افراط اور لگاتار زلزلوں کی وجہ سے پتھر اینٹ کے مکان نہیں بنائے جاتے...... چھتوں پر گلِ لالہ اُگایا جاتا ہے جو بہار میں عجیب بہار دکھاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

کہ ''لوگ چاول اور مچھلی کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور سبزیوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ سبزیوں کو سکھا کر بھی رکھتے ہیں۔ چاول شام کو پکا کر رات کو اُٹھار کھتے ہیں اور صبح کھاتے ہیں''۔ یہاں ابوالفضل کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زیادہ محنت کے لئے وقت بچانے کی غرض سے لوگ صبح کو رات کا بچا ہوا کھانا کھاتے تھے' نہ کہ قصداً اٹھار کھتے تھے۔ انڈے گلگت اور تبت سے لائے جاتے تھے۔ پیداوار کے سلسلے میں ن اُس کا بیان ہے کہ ''چنا اور جو نہیں اُگایا جاتا، گندم کی پیداوار کم ہے اور دانے سیاسی مائل ہوتے ہیں، لوگ بہت کم کھاتے ہیں۔ تربوز، سیب، خوبانیاں اور آلو بخارے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ انگور کافی ہیں لیکن اچھی قسمیں بہت کم۔ انگور کی بیلیں توت کے درختوں پر چڑھتی ہیں۔ توت کم کھایا جاتا ہے کیونکہ اس کے پتے ریشم کے کیڑوں کی غذا بنتے ہیں۔ پیداوار کا انحصار بارش پر ہے، مصنوعی ذرائع آبپاشی بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔''

دست کاروں اور ہنر مندوں کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ ''یہاں پٹو کا عمدہ کپڑا تیار ہوتا ہے، خصوصاً شال بڑے خوبصورت بنتے ہیں۔ اونی پارچے نہایت ملائم ہوتے ہیں۔ اون کی عمدہ قسم تبت سے لائی جاتی ہے۔ یہاں کے ہنر مند بڑے بڑے شہروں میں کام کرنے کے مستحق ہیں۔ ان کی چیزوں کا بازار نہیں لگتا۔ ان کے گھروں پر ہی خرید و فرخت کا کام ہوتا ہے اور بڑی بھیڑ لگی رہتی ہے، یہ لوگ زیادہ تر سرینگر میں ہیں۔''

ابوالفضل کشمیر میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے خانقاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ اس شہر میں رہے۔ ان کی بنائی ہوئی خانقاہ ابھی اس کی یاد قائم رکھے ہوئے ہے۔'' کشمیر کے مندروں کے کھنڈرات دیکھ کر ابوالفضل ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ ان عمارتوں کو حیرت انگیز قرار دیتا ہے۔ ابوالفضل اس بات پر بھی حیران ہے کہ کشمیر میں زہریلے جانور اور کیڑے مکوڑے جیسے سانپ اور بچھو نہیں ہوتے۔ وہ اس روایت کا ذکر بھی کرتا ہے کہ مہادیو پہاڑ کی چوٹی جہاں جہاں نظر آئے، وہاں سانپ بچھو نہیں ہوتے لیکن اُس کے بقول جوئیں، پسو، مچھر اور مکھیاں عام ہیں۔

سرینگر کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ "سرینگر شہر راجدھانی ہے، اس کی لمبائی چار فرسخ ہے (فرسخ ۳ ۳/۴ میل) بہت، مار اور چھمن نام کی ندیاں اس شہر میں بہتی ہیں، چھمن کول میں اکثر پانی نہیں ہوتا۔ مار کبھی کبھی اس قدر پایاب کہ کشتیاں نہیں چل سکتیں۔ شہر زمانۂ قدیم سے پُررونق رہا ہے اور مختلف قسم کے ہنرمندوں کا مسکن ہے...... مشرق میں کوہ سلیمان نام کی ایک اونچی پہاڑی ہے اور شہر سے ملی ہوئی دو بڑی جھیلیں جو ہمیشہ پانی سے بھری رہتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا پانی صحت بخش ہونے کے علاوہ ذائقہ میں کبھی خراب نہیں ہوتا بشرطیکہ بدرو جاری رہے۔"

سرینگر کے علاوہ ابوالفضل دوسرے مقامات کا ذکر بھی کرتا ہے۔ خاص کر کشمیر کے مشہور تیرتھوں کا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہاں کے ان سارے مقامات کی سیر نہیں کی ہے اور اُن کا بیان ذاتی مشاہدہ پر مبنی نہیں، انہوں نے لوگوں سے اطلاعات حاصل کر کے درج کئے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں میں مشہور روایتوں ان کے توہمات اور ان کے عقائد کے بارے میں بھی ابوالفضل خاموش نہیں۔ ان میں سے چند باتیں خود اس کے تجربے میں آئی ہیں۔ مثلاً بہرام گلہ کے راستے سے گزرتے ہوئے پہاڑ پر بادو باراں کا شکار ہونا اور اس سلسلے میں یہ روایت کہ خدا دوستوں نے طلسم باندھا ہے کہ یہاں سے کوئی فوج گزرے، کوئی گھوڑا یا بیل مارا جائے یا ڈھول بجے تو طوفان اُٹھتا ہے، برف و باران ہوتا ہے۔" ابوالفضل لکھتا ہے کہ "یہ بات ہر بار سچ لگی۔" اُس نے کسی کسی روایت کی تکذیب بھی کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر ہر بات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ مثلاً اکبر جب شہاب الدین پورہ گیا تو سنگم کے قریب چناروں کی چھاؤں سے بھی لطف اُٹھایا۔ اُسے بتایا گیا کہ اگر یہاں کوڑا کرکٹ یا غلاظت ڈالی جائے تو غیبی طور صاف ہو جاتی ہے۔ اس کی تحقیق کی گئی تو غلط نکلا۔ ابوالفضل نے جن پوتر جگہوں کا نام لیا ہے ان میں ویرناگ، قمبر گاؤں میں بون سپندھ کا چشمہ، دیوسر کا بلاوناگ، کٹھار کا چشمہ، نیلہ ناگ، چشمہ بیرو، لار کے چشمے، اشہ بری اور شکرناگ کے چشمے، تھید کے چشمے، زیون کا چشمہ، کھریو کے چشمے، اچھابل کا فوارہ، مٹن کا مندر،



جلال الدین محمد اکبر اعظم



مزار یوسف شاہ چک ۔ بسوک (بہار)



مزار شعراء، درگجن سرینگر

جو سلیمان ٹینگ (کوہ سلیمان) کے دامن میں شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵ء — ۱۵۸۶ء) کے دور کی یادگار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعراء نے یہ جگہ اپنی آخری آرامگاہ کے لئے اپنے دلکش محل وقوع کے سبب منتخب کی تھی۔ یہاں پر شاہ ابوالفتح، حاجی محمد جان قدسی، طغرائے مشہدی، قاضی ابوالقاسم، محمد قلی سلیم اور مرزا ابوطالب کلیم جیسے معروف شعراء دفن ہیں۔



شبیہ یوسف شاہ چک — عمل فیروز حسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

IN MEMORY
OF
SULTAN YUSUF SHAH CHAK
KING OF KASHMIR
PATRON OF FINE ARTS

BORN: C1545 A.D.
ACCESSION: 1580 A.D.
EXILED BY EMPEROR AKBAR: 1586 A.D.
DEATH IN JAGAN NATH PURI (ORRISA)
SEPTEMBER 22,1592 A.D.
BURRIED AT BISWAK
DECEMBER-28,1592 A.D.
THIS MEMORIAL STONE
WAS INSTALLED BY
SHEIKH MOHAMMAD ABDULLAH
CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR STATE
ON 19TH JANUARY 1977 A.D.
AGENCY: J&K ACADEMY OF ART
CULTURE AND LANGUAGES

یادگاری کتبہ ـــ یوسف شاہ چک ـــ ایک عکس

عیش مقام، بیج بہاڑہ، امرناتھ، برنگ کا تالاب، گنگر ناگ کے چشمے، بانہال کا مندر، تولہ مولہ، ست پورہ کا تالاب، ترہگام، نچھ ہامہ کی گھاٹی، شاردا مندر وغیرہ شامل ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندو سادھو سارے ملک کو مقدس سمجھتے ہیں۔ یہاں مہادیو کے ۴۵، وشنو کے ۶۴، برہما کے تین اور درگا کے ۶۶ متبرک استھاپن ہیں۔ وہ بغیر شاہ ہمدانؒ اور زین شاہ صاحب مسلمانوں کی کسی زیارت کا ذکر نہیں کرتا۔ کئی مقامات کی اہمیت بیان کرنے میں کہیں کہیں وہ کا قلم بھٹک گیا ہے۔ جیسے نیلہ ناگ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ نیل مت پوران اسی کی گہرائیوں سے حاصل ہوا جب کہ اس کا تعلق ویر ناگ سے بتایا جاتا ہے۔ یا مٹن کریوے کا وہ تالاب جسے چاہِ بابل کا نام دیا گیا تھا۔ پھر بھی ابوالفضل کے بیانات سے کچھ پتے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ شالا مار پہاڑی کا نام شاہ کوٹ تھا اور اس گاؤں کا نام بازوال یا مرواڈون میں عظیم الجثہ ہنڈو پایا جاتا جو باربرداری کے کام آتا تھا۔

عام لوگوں میں پوتر مقامات سے متعلق روایتوں کو بھی قابلِ ذکر سمجھا گیا ہے جیسے لار کے پہاڑ کی چوٹی پر موجود تالاب میں گوشت کی بوٹی ڈالی جائے تو باد و باراں کا طوفان آ جاتا ہے، دیوسر کے بلاو ناگ میں قسمت آزمانے کے لئے اپنا اپنا نام لکھ کر چاول بھرا مٹی کا برتن منہ بند کر کے ڈالا جاتا ہے جو کچھ دیر بعد سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ اگر اس میں پکّے ہوئے چاول پائے جائیں تو نیک شگون ہے اور اگر کیچڑ نظر آئے تو بُرا شگون۔ بانہال مندر میں دو فریق میں سے کسی کا حق پر ہونا معلوم کرنا ہو تو پکّے چاولوں کے دو برتن رکھے جاتے ہیں جن پر فریقین اپنا نام لکھ رکھتے ہیں صبح کو جس برتن سے گلاب اور زعفران برآمد ہوں وہ شخص حق پر ہے اور جس میں کیچڑ پایا جائے وہ موردِ الزام۔ اگر کسی ماہ کی نویں تاریخ کو شکروار آئے تو شکرناگ کا چشمہ اُبلتا ہے۔ زیون کے چشمہ میں بُوائی کے موسم میں دُودھ ڈالا جاتا ہے۔ اگر ڈُوب جائے تو فصل اچھی ہوتی ہے۔ اگر سطح پر تیرنے لگے تو فصل کی خرابی کا اندیشہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

زعفران کے سلسلے میں ابوالفضل نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اُس کے

بقول پانپور گاؤں میں دس ہزار بیگہ زمین پر کیسر کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ مارچ کے آخر سے اپریل تک بوائی ہوتی ہے۔ زمین تیار کر کے کیاریاں بنا کر اس کی گٹھیاں لگائی جاتی ہیں۔ پودے اُگ کر ستمبر میں جوبن پر آجاتے ہیں۔ تنا انگلی کے برابر ہو جائے تو پھول لگتے ہیں۔ آٹھ پھول لگنے کے بعد پھولوں سے ریشے الگ کئے جاتے ہیں۔ ہر پھول میں چھ چھ پنکھڑیاں اور چھ چھ ریشے ہوتے ہیں۔ تین زرد اور تین سرخ۔ یہی سرخ ریشے زعفران کہلاتے ہیں۔ پھول چننے کا نظارہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ یہ پودا ایک دفعہ بویا جائے تو چھ سال تک پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان گٹھیوں کو نکال کر پھر سے لگایا جاتا ہے۔ وہ پانپور کے علاوہ پرسپور میں بھی زعفران کی کاشت کا ذکر کرتا ہے۔

ابوالفضل کے بقول یہاں آبی پرندوں کا شکار کھیلنے کے ساتھ ساتھ تیتروں اور بارہ سنگھوں کا شکار بھی کھیلا جاتا تھا اور کبھی کبھی چیتوں کا بھی۔ یہ امیر لوگوں کی ایک دلچسپ تفریح تھی۔ اس زمانے میں چوگان بازی کا رواج ہونے کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ یہ کشمیریوں کا پرانا کھیل تھا۔ نندی مرگ کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نندی، مہادیو کی پجاری تھی۔ ایک جوان جو یہاں پولو کھیلنے آتا تھا کو محبت ہوئی۔ گورنر نے یہ جگہ آباد کروانا چاہی لیکن نندی نے خرید کر چوگان بازی کے لئے وقف کر دی۔

ابوالفضل نے اُس زمانے کے مشہور تیوہاروں کا حال بھی لکھا ہے، خاص کر ۱۳ بھادون کو منایا جانے والا وتستا کے سلسلے کا تیوہار۔ جب چراغ جلا کر دریا میں بہائے جاتے تھے اور دریا کے دونوں کناروں پر چراغاں کیا جاتا تھا، اُن نے یہاں کے چند عجائبات کے بارے میں بھی قلم کو جنبش دی ہے۔ ڈل کی سطح پر بہتے ہوئے جزیرے، جن پر کھیتی ہوتی ہے اور اُن کی چوری جسے زمین کی چوری کا نام دیا گیا ہے یا بچھ پرگنہ میں پایا جانے والا شجرِ لرزاں یا ہلتا درخت جس کی صرف ایک شاخ ہلائی جائے تو پورا درخت کانپنے لگتا ہے۔ اس کا نام ہل تل، ہل دل اور ہل تھل بتایا جاتا ہے۔ آئین اکبری میں ہل تل آیا ہے اور اقبالنامہ میں ہل دل۔ آئین اکبری میں یہ نام

گاؤں کے لئے دیا گیا ہے اور تزک جہانگیری میں درخت کے لئے۔ حیدر ملک نے ہل تھل لفظ استعمال کیا ہے۔ تزک کی رُو سے یہ چاڈورہ میں پایا جاتا تھا اور آئین اکبری کے مطابق خام پورہ یا خانپورہ میں۔

ابوالفضل کے زمانے میں کشمیر میں گھاس کی جوتی[۱] کا خوب رواج تھا۔ خود اکبر کو پہلی بار سفر کشمیر کے موقع پر بہرام گلہ سے گزرتے وقت یخ اور برف سے آسانی کے ساتھ گزرنے اور پھسلنے سے بچنے کے لئے گھاس کی جوتی پہننے کے لئے پیش کی گئی لیکن وہ اسے پہننے پر رضامند نہ ہوا۔ البتہ اُس کی تحریروں میں کسی جگہ کانگڑی کا ذکر نہیں ملا۔ شاید اس لئے کہ اکبر کو زمستان کے موسم میں یہاں کبھی ٹھہرنا نہ پڑا اور ابوالفضل کو بھی یہ عجوبہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔

مغلوں کے زمانہ میں کشمیر میں اشرفی چلتی تھی اور یہ ہندوستان کی اشرفی سے مختلف تھی۔ وزن میں اُس سے چار سرخ زیادہ۔ ماشہ چھ سرخ کا ہوتا ہے۔ دانگ بھی چھ سرخ کا۔ سونے کی اشرفی سولہ دانگ کی ہوتی تھی۔ تولہ سولہ ماشے کا ہوتا تھا۔ چاندی کا سکہ نو ماشے کے برابر ہوتا تھا اور اسے روپہ ساسُن کہتے تھے، پیسہ تانبے کا ہوتا تھا ۱/۴ دام، جسے کشُر کہتے تھے۔

مغل دور تک بھی کشمیر میں سانپوں کو پوجنے کے آثار پائے جاتے تھے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق یہاں سات سو جگہوں پر سانپوں کی شکلیں پتھروں پر کندہ تھیں جنہیں لوگ پوجتے تھے اور جن سے متعلق حیرت ناک کہانیاں کہی جاتی تھیں۔

کشمیر کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ابوالفضل کی تصانیف کافی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ اُن سے ہم کچھ زیادہ تفصیلات کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ یہ زمانہ کشمیر میں مغلوں کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہاں ابھی مغل حکومت اپنے پاؤں ہی جما رہی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کہیں مقامات کے ناموں میں کچھ غلطیاں پائی جاتی ہیں تو وہ اُن ترجمہ کاروں اور منشیوں کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہیں جو ابوالفضل کو سنسکرت میں لکھا ہوا مواد فارسی کے قالب میں ڈال کر پیش کرتے تھے۔ ☆☆

۱۔ اِسے کشمیری میں "پُلہور" کہا جاتا ہے (ادارہ)

سیّد رسول پونپر

جہانگیر اور کشمیر

مغل شہنشاہ محمد سلطان سلیم نُورالدّین جہانگیر (۱۵۶۹ء-۱۶۲۷ء)[۱] نے کشمیر کو بجا طور جنتِ ارضی قرار دیا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اور شاید اسی لئے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مارچ ۱۶۲۷ء کے دوران چہیتی بیوی نورِ جہاں، آصف خان شہر یار اور دوسرے مصاحب کے ساتھ لاہور سے کشمیر آیا تاکہ عرفی کے شعر کا خود عملی روپ دھار سکے۔[۲]

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

اور جہانگیر نے کشمیر ہی کو گوشۂ آخرت بنانے کی تمنا بھی کی تھی۔

۱؎ تاریخ جہانگیر- ڈاکٹر بینی پرشاد- ترجمہ: رحم علی الہاشمی- ترقی اردو بورڈ- ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۱-۴۲۱

۲؎ ایضاً صفحہ: ۴۱۹

از شاہ جہاں گیر دمِ نزع چو جستند
باخواہش دل گفت کہ کشمیر دِگر ہیچ

مشیئت ایزدی کو شاید یہ اس طور منظور تھا کہ جہانگیر نے اکتوبر ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپسی پر جانِ آفرین کو اپنی جان سپرد کر دی۔

جان جہاں دینی تھی دی۔ موت کو بھی بہانہ چاہیے، وہ دن بدن نڈھال ہوتا گیا، یہاں تک کہ شاہ سواری کے قابل بھی نہ رہا اور وہ پالکی کے سہارے ہی اِدھر اُدھر جاسکتا تھا لیکن زندگی کے آخری لمحات کے بیت جانے کے ساتھ ساتھ وہ سرگرم سفر بھی رہا۔ چنانچہ کشمیر سے واپسی سفر پر جب وہ بیرم کلا[1] پہنچا جو اُس کی پُرانی شکارگاہ تھی تو اُس کا جی چاہا کہ وہاں ایک مرتبہ پھر شکار کھیلے اور جیسا ثابت ہوا یہی اُس کا آخری شکار تھا۔

جہانگیر نے اپنی توڑے دار بندوق ایک دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی جو اِسی لئے بنی تھی اور ایک ہرن کو نشانہ لگایا جسے گاؤں کے لوگ اُسی طرف ہنکار رہے تھے۔ ایک پیادہ سپاہی جو بادشاہ کے لئے شکار مہیا کرتا تھا ایک ڈھلوان پہاڑی کے سرے پر

---

[1] اب اس جگہ کا نام بہرام گلا یا بہرام گلی ہے۔ 'رچرڈ ٹمپل' نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے اور میں نے جہاں جہاں قیام کیا اُن میں سب سے زیادہ اچھی ہے، اس کے قریب پہاڑی سے تیز دھار کا آتا ہوا چشمہ چٹا پانی (جسے سفید پانی کہتے ہیں) ہے یہی دِلربا اور سیماب یا آبشار ''نوری چھم'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جگہ ''نوری چھم'' کے نام سے مشہور ہے۔ ''نوری'' اِسے 'نور جہاں' کی نسبت سے کہتے ہیں۔ ''چھم'' گوجری زبان میں آبشار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دونوں الفاظ کے اتصّل سے نوری آبشار بنتا ہے جو شہنشاہ جہانگیر نے اپنی چہیتی ملکہ نور جہاں سے منسوب کیا تھا۔ کول سر اور کٹورہ سر جھیلوں سے نکل کر اور یہاں آکر اسی (۸۰) فٹ کی اونچائی سے گرتا ہوا یہ صاف وشفاف پانی نہایت ہی دلربا آبشار کی شکل اختیار کرتا ہے۔ آبشار کے عین مغرب واقع پہاڑی پر شہنشاہ جہانگیر نے ایک قد آدم آئینہ اس طرح نصب کروایا تھا تاکہ سامنے والے ایک اور آئینہ میں محوِ آرائش ملکہ نور جہاں کا حُسنِ مجسم، حسن فطرت سے ہم آغوش ہو کے جلوہ افروز ہوتا تھا جس سے جہانگیر کے ذوقِ جمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(''پونچھ'' کے، ڈی، مینی۔ مطبوعہ: ۱۹۸۰ء)

کھڑا تھا۔ اُس کا پیر پھسل گیا اور پہاڑی سے نیچے گر پڑا۔ اُس کی ہڈی پسلی چُور چُور ہوگئی۔ اس حادثہ سے بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے مرنے والے کی ماں کو بلا کر اُس کی گزر بسر کے لئے روپیہ دیا مگر اُس کی پشیمانی اور دُکھ میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی اور اُس نے خیال کیا کہ یہ خود اُس کی موت کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ موت کا خیال برابر اُس کے ذہن پر حاوی رہا اور وہ مایوسی میں ڈوب گیا۔ اُس کی بیماری نے ہمیشہ سے زیادہ سنگین صورت اختیار کرلی۔ اُسے ایک لمحہ کیلئے نیند آتی اور نہ سکون ملتا تھا۔ اس حادثہ کے دوسرے دن شاہی خیمہ تھانہ[1] میں نصب ہوا۔ اگلی منزل راجوری تھی۔ ۲۷ر صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۶۲۷ء کو وہ بھیم بھار کے قریب چنگیز ہٹلی کی طرف روانہ ہوگیا[2] اُسی رات اپنی فرمانروائی کے بائیس سال، اور عمر کے اٹھاون سال پورے کر کے جان بحق ہوا[3] یہاں سے اُس کے جسدِ خاکی کو نُور جہاں کے باغ شاہدرہ لاہور لے جایا گیا جہاں سے اُسے چُپ چاپ سُپردِ خاک کیا گیا۔ نورُ جہاں نے اپنے خرچہ سے وہاں ایک شایانِ شان مقبرہ تعمیر کرایا۔

جہانگیر ۱۰۱۴ھ (مطابق ۱۲۰۵ میلادی) ہر سال کشمیر آتا رہا۔ لیکن مارچ تا اکتوبر ۱۶۶۰ء اُس کا پہلا سات ماہ کا قیام اِس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اِس دوران میں اُس نے کشمیر کے قدرتی حُسن کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ باوجود صحت کی خرابی کے جہانگیر یہاں کے قیام سے بہت لُطف اندوز ہوا۔ اُس نے یہاں کے جتنے بھی تفریح اور خوبصورتی کے مقامات تھے سب دیکھے۔ جیسے کہ ایک فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے والے حُسن پرست سے توقع تھی۔ وہ کشمیر سے بہت مسحور ہوا اور دِلی مسرّت کے جوش کے ساتھ لکھتا ہے۔ کہ "اگر کوئی کشمیر کی تعریف لکھنا چاہے تو پوری کتاب کی ضرورت ہوگی۔ کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے جو شاہی محل کا ایک آہنی قلعہ اور درویشوں کیلئے ایک

---

[1] تھنہ منڈی،

[2] یہ جگہ آج کل چنگس سرائے کے نام سے مشہور ہے۔ سر رچرڈ ٹمپل نے بھی ۱۸۵۹ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ شاہی قیام گاہ تھی۔

[3] تاریخ جہانگیر۔ صفحہ: ۴۲۰-۴۲۱

پھولوں سے لدا ہوا دلفریب ورثہ۔ اس کے خوبصورت مرغزار، دلکش چشمے، بے شمار فوارے تعریف سے بالاتر ہیں۔ یہاں بے شمار بہتے ہوئے دریا اور آبشار ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے سبزہ زار اور پھول ہیں۔ سُرخ گلاب، بنفشہ اور نرگس اُز خود اُگے ہیں۔ میدان میں طرح طرح کے پھول اور خوشبو دار گھاس ہے جس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ رُوح پَرور موسمِ بہار میں پہاڑ اور میدان پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور دروازے، دیواریں اور صحن لالہ زار ہوجاتے ہیں جہاں ضیافت کا دسترخوان سجانے والے گُل لالہ جگمگاتے ہیں۔ اِن وسیع مرغزاروں اور خوشبودار پھولوں کا ہم کیا بیان کریں۔''[۱] یہ جمال پرست بادشاہ پھول چُننے میں بھی مسرّت محسوس کرتا تھا۔ ایک اور جگہ وہ یوں رطب اللسان ہے:

''اس پھولوں سے بھری ہوئی سرزمین کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، جہاں تک نظر جاتی ہے، ہر رنگ کے پھول لہلہاتے ہیں۔ میری موجودگی میں پچاس قسم کے پُھول چُنے گئے۔ شاید ان کے علاوہ اور بھی ہونگے جو میں نے نہیں دیکھے''[۲]

اَچھ بل کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر نے لکھا کہ اس کا چشمہ (مچھی بھون، یعنی مٹن) چشمہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کے گرد فلک بوس چنار کے درخت کھڑے ہیں۔ جن کے سر باہم مل کر خوشنما ستانے کی جگہ بناتے ہیں ایک خوبصورت باغ میں جہاں تک نظر جاتی ہے، جعفری کے پُھول کھلے ہیں۔ گویا یہ بالکل جنت کا ایک ٹکڑا ہے[۳]

پھر چشمہ ویری ناگ کا ذکر ہے جو جہلم کے سرے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے جہاں اپنی شہزادگی کے زمانے میں جہانگیر نے ایک عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ تالاب کا پانی اتنا شفاف ہے باوجودیکہ چار گز (بارہ فٹ)

۱۔ تزک جہانگیری۔ راجرس و بیوریج، صفحہ ۱۴۲-۱۴۴۔ جلد دوم

۲۔ ایضاً۔ صفحات ۱۶۲-۱۶۳۔

۳۔ ایضاً صفحہ: ۱۷۳

گہرا ہے، نہر کی خوبصورتی بے مثال ہے اور چشمہ کے نیچے گھاس اُگتی ہے۔ اُسکی سرسبزگی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ مختلف قسم کے پودے اور خوشبودار گھاس یہاں بہ کثرت اُگتی ہے اور اس میں ایک پودے کی ڈنڈی نظر آئی جو ہو بہو مور کی دُم کی طرف مختلف رنگوں کی تھی۔ وہ چشمہ کی لہروں میں بَل کھاتی تھی اور کہیں کہیں اس میں پھول بھی تھے۔ مختصر یہ کہ سارے کشمیر میں وادی کا اُوپری حصہ جتنا خوبصورت ہے اُس کا نشیبی حصّہ کی خوبصورتی سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ان علاقوں میں کچھ دن قیام کرنا چاہئے اور قرب و جوار کے مناظر دیکھنے چاہئیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس چشمہ کے گرد چنار کے درخت لگائے جائیں"[1]

ویری ناگ کے حُسنِ فطرت کی تعریف کرتے ہوئے جہانگیر کمراز پر مراز کی فطری برتری کی طرف صریح اشارہ کرتا ہے:

مناظرِ فطرت، دریاؤں، دیہاتوں، وادیوں، پہاڑیوں، پودوں، پھولوں، پرندوں، جانوروں اور لوگوں کا جو حال اُس نے لکھا ہے وہ نہایت شستہ، رواں اور خوبصورت فارسی میں ہے جسے لفظ بہ لفظ معاصر مورخین جیسے خافی خان، سجان رائے اور دوسروں نے نقل کیا ہے اور آج بھی وہ دلچسپی اور لُطف سے پڑھا جاسکتا ہے۔[2]

پرگنہ لار کے صفاپور گاؤں خاص کر جھیل مانسبل کی بھی وہ بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس جھیل کے شُمال میں درختوں سے بھری پہاڑی ہے۔ یہ درخت جھیل میں اپنے عکس سے ایک دلفریب سماں باندھتے تھے کیونکہ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ خزاں کا حُسن بوقلموں سے کچھ کم نہیں۔ جہانگیر یہاں کئی روز مُرغابیوں کا شکار کرتا رہا بندوق سے نہیں بلکہ شاید جال سے، کیونکہ جہانگیر نے اپنا عہد پورا کرنے کے حوالے سے پچاس کی عمر سے بندوق سے شکار کھیلنا بند کر دیا تھا۔[3]

جہانگیر اہرہ بل کے آبشار کے حُسنِ خداداد میں بھی محو ہو جاتا ہے۔ پامپور

---

[1] تزک جہانگیری، ص: ۱۷۴

[2] تاریخ جہانگیر، صفحہ: ۳۱۵،

[3] تزک جہانگیری، جلد دوم صفحہ: ۱۷۶، راجرز و بیوریج۔



نورالدین محمد سلیم جہانگیر

الدین جهانگیر پادشاه ابن اکبر پادشاه غازی

تاریخ سنه ۱۵ جلوس

این عمارت بحکم آن حضرت تمام یافت

شاه اکبر

۱۰۲۹

(چند ہار کریوہ) کے زعفران کے شگوفوں کی بہار دیکھنے بھی گیا۔ جہانگیر تفصیل سے بتاتا ہے کہ زعفران کے پھول کے کتنے حصے ہیں اور یہ کتنی پتیوں پر مُشتمل ہوتا ہے۔ اِس کی کاشت کیسے کی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس وقت زعفران کی پیداوار تین ہزار دو من خراسانی ہے۔ رسم یہ تھی کہ زعفران کی نصف پیدار حکومتِ وقت کو پیش کی جاتی تھی اور بقیہ نصف کا حقدار کاشتکار ہوتے تھے۔ مرّوجہ ضابطہ کے مطابق وہ زعفران چُن کرلاتے اور اپنے نصف حصّہ پیداوار کے عوض نمک لیتے تھے، جو وہ اپنی مزدوری تصور کرتے تھے[1]

زعفران کے شگوفوں کی مہک سے سر درد ہونے کے سلسلہ میں پوچھے جانے پر کارکن کشمیریوں نے نفی میں جواب دیا۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ کشمیری عورتوں میں صاف اور پاکیزہ لباس پہننے کی رسم نہیں۔ پٹو کا کُرتہ[2] سِلواتے ہیں جو تین چار سال تک پہنتے ہیں اور پھٹنے تک اِسے پانی دیکھنے تک کی نوبت نہیں آتی۔

پاجامہ پہننا عیب سمجھتے ہیں۔ کشمیری اگرچہ دریا کے کنارے پر رہتے ہیں تاہم پانی کی بوند بھی اُن کے جسم کو نہیں چھوتی۔

اُن کا باطن اُن کے ظاہر کی طرح میلا ہے۔ اُبلے چاول جسکو "بھتہ" کہتے ہیں رکھ دیتے ہیں اور سرد ہونے پر کھاتے ہیں۔ گرم غذا کھانے کی عادت نہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے۔ کہ اکبر کے زمانہ سے پہلے کشمیر میں پست قد کا گھوڑا ہوا کرتا تھا جس کو اُن کی زبان میں گونٹ کہتے تھے۔ قد آور اور تیز رفتار گھوڑوں کا رواج یہاں تب ہوا جب اِس نسل کے گھوڑے عراق اور تُرکی سے تحفے کے طور پر بھیجے گئے اور پھر اِن سے قد آور تیز رفتار گھوڑوں کی نسل معرضِ وجود میں آئی۔ جہانگیر اس بات کو دہراتا ہے کہ مزار حیدر دوغلات نے کشمیر کی صنعت و حرفت کو بڑی ترقی دی۔ اُس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کشمیر میں اہلِ حرفہ اور سوداگر سُنی فرقہ کے لوگ ہیں اور شعیہ لوگ جو اِمامیہ اور نور بخشیہ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں سپہ گری کرتے ہیں۔ رشیوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ اِن میں علم اور معرفت نہیں۔ گوشت نہیں کھاتے ازدواجی زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ زمین میں میوہ دار

---

[1] تزک جہانگیری، جلد دوم، صفحہ: ۱۷۶، راجرز بیورتج [2] پھرن

درخت لگاتے ہیں۔ اس زمانے میں اُن کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ کشمیر کے برہمن سنسکرت میں اپنی کتابیں تالیف کرتے ہیں جو بڑی معتبر سمجھی جاتی ہیں[1]

کشمیریوں کے رہن سہن کے بارے میں جہانگیر کے خیالات یک رُخہ اور خُسروانہ ہیں کیونکہ صدیوں کی پسماندگی، جغرافیائی اور موسمی حالات، عُسرت و غربت اور محکومیت سے کسی قوم کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر بُرے اُثرات پڑنا لازمی ہیں جو چشم زدن میں زائل نہیں ہوتے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اُس نے کشمیر میں سو پنکھڑیوں والا کنول کا پھول دیکھا۔ وہ اِس کا بھی اظہار کرتا ہے۔ کہ گوری مرگ (گلمرگ) کے حُسنِ لازوال نے اُسے مسحور کیا۔

شہر سرینگر کی بات کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے کہ دریائے بہُت (وتستا، دریائے جہلم) پر عبور و مرور کیلئے لکڑی کے چار مضبوط کدل (پُل) بنائے گئے ہیں۔ لکڑی اور غلے کے نقل و حمل کیلئے کشتیاں استعمال ہوتی ہیں۔ کشتیوں کی تعداد پانچ ہزار سات سو اور ملاحوں کی تعداد سات ہزار بتائی ہے۔ مکان تین تین چار چار منزلہ ہیں۔ چھت پر مٹی ڈالی جاتی ہے، جس پر گلِ لالہ اُگتا ہے جس سے بہار میں دیکھنے کو عجیب منظر ملتا ہے۔ پھول اَن گنت قسم کے اُگتے ہیں۔ اُستاد منصور نے سو سے اُوپر پھولوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ اکبر کے زمانے میں پیوندی شاہ آلو یعنی آلو بخارا وجود میں لایا گیا۔ سمرقند نام کا کشمیری سیب بہت اچھا ہوتا ہے۔ توت کی بہتات ہے۔ دھان کی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ شال تبت سے لایا جاتا ہے۔ اکبر نے اس کا نام پرم نرم رکھا تھا۔

کشمیر کے خارجی و داخلی جغرافیہ کے بارے میں جہانگیر نے توزکِ جہانگیری میں اطلاعات فراہم کی ہیں...... کشمیر کی وادی میں داخل ہونے کے دو راستے بتلائے گئے ہیں۔ ایک بھمبر کا، دوسرا پکھلی کا بھمبر کا راستہ، نوشہرہ، راجوری، بہرام گلہ[2] پوشیانہ،

---

[1] سون ادب۔ تواریخ نویسی نمبر، ۲۔ مضمون توزک۔ کے این پنڈتا۔ صفحہ: ۹۱

[2] بہرام گلہ کا راستہ یونہی کھلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اُس وقت کے دو زمیندار مہدی نایک اور حسن نایک ہیر پورہ سے بہرام گلہ تک کے راستے کے پہرے داروں کی حیثیت سے کلیدی رول ادا کرتے تھے۔ مہدی نایک کا باپ بہرام نایک حکومت کشمیر کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اغلب ہے کہ اسی نسبت سے اس کا نام بہرام گلہ پڑا ہو۔

پیر پنچال، باڑی بزاری، ہیر پورہ (ہُرپورہ) اور قلمپورہ (کلیان پور) سے ہو کر سرینگر سے ملتا ہے۔ پچھلی کا راستہ پنبہ دژ نگ، (مظفر آباد) کھٹالی اور بارہمولہ سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچ جاتا ہے۔

یہاں کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ بہرام گلہ کے لوگ فارسی، ہندی اور کشمیری تینوں زبانیں بول سکتے ہیں۔ اُن کی عورتیں پٹو پہنتی ہیں اور ناک میں نتھنی ڈالتی ہیں۔ راجوری کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بھی عورت کو خاوند کی موت واقع ہونے پر زندہ دفن کرتے اور لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے ہیں لیکن میں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔

کشمیر میں مروّج سازوں کے نام بھی جہانگیر نے لئے ہیں یعنی کمانچہ، جنتر، قانون ُدفَ ُ نےُ، وغیرہ۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ کشمیری موسیقار ہندی مقامات میں کشمیری نغمے گاتے ہیں[1]

ہندوؤں کے نہایت ہی اہم تیوہار دسہرہ کے دُھوم دھام اور عقیدت سے منانے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے۔ یہ تیوہار ہر سال معمول کے مطابق منایا جاتا تھا[2] دریائے جہلم میں مچھلی پکڑنے کے ایک خاص طریقے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے۔[3] جہانگیر لوکہ بھون کے اندھے ناگ اور مٹن کے مچھی بھون ناگ بھی دیکھنے گیا تھا، جسکا ذکر اُس نے اپنی توزک میں کیا ہے۔

وتستا کے جنم کے سلسلہ میں اُن دنوں ''وِ تھ تُرواہ'' کے موقعہ پر دریائے جہلم کے کنارے چراغاں کئے جانے کی قدیم رسم کے بارے میں جہانگیر لکھتا ہے کہ یہ ایک قدیم رسم ہے جو اِس روز (اگست کے اختتام یا یکم ستمبر پر) ادا کی جاتی ہے۔ جہانگیر بچشمِ خود، شکارے میں بیٹھ کر اِس دلربا چراغاں کا نظارہ کرتا ہے۔ شمسی سال کے اعتبار سے اُس

---

۱ تزکِ جہانگیری، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا۔ مطبوعہ سون ادب...... تاریخ نویسی نمبر۔ کلچرل اکادمی سرینگر۔
تزکِ جہانگیری راجرز و بیوریج، جلد دوم۔

۲ تزکِ جہانگیری راجرز اور بیوریج، جلد دوم، صفحہ: ۱۷۶

۳ تزکِ جہانگیری راجرز اور بیوریج، جلد دوم، صفحہ: ۱۷۵

کے وزن کیے جانے کا دن بھی اتفاق سے اُسی روز پڑتا تھا' تو اُس نے اپنے وزن کے برابر سونے وغیرہ جیسی گرانقدر اشیاء مستحق لوگوں میں تقسیم کیں۔ ''وِبتھ تُرواہ'' کے موقعہ پر چراغاں کرنے کی مستحسن رسم تو اب نہیں رہی لیکن لڑکیاں اپنے والدین کی طرف سے تحائف حاصل کرتی ہیں۔ شب برات کی مقدس تقریب پر غریب اور امیر سب مُسلمان بھی چراغاں کرتے ہیں[۱]۔ جہانگیر ایسے تیس پرندوں کی فہرست بھی فراہم کرتا ہے جو اُس کے زمانے میں کشمیر میں نہیں پائے گئے۔ ان میں مور، سارس وغیرہ شامل ہیں...... جہانگیر بڑے احترام سے زین العابدین بڈشاہ اور اُس کے کارناموں کا بھی اجمالاً ذکر کرتا ہے۔ وہ یہاں کشمیر میں طاعون سے لوگوں کے مرے جانے کے بارے میں بھی لکھتا ہے[۲] اور دست بدعا ہے کہ خدا اپنے گناہ گار بندوں پر رحم کرے اور اُنہیں مصائب وآلام سے نجات بھی دے۔

جہانگیر نے اپنے دورِ حکومت میں کشمیر کے موسم بہار کی رنگینوں، فیاضیوں اور قدرت کی جلوہ طرازیوں سے حتی المقدور بہرہ ور ہونے کی ہر سال کوشش کی۔ جام و جاناں کی محفلیں سجیں جس کی شہادت یہاں کے جنّت نظیر باغات کے دلربا اور رُوح پرور گوشے دے رہے ہیں۔ جہانگیر اپنی حیاتِ بے ثبات کے آخری لمحات میں بھی مست خرام زندگی پر جاں چھڑکتا رہا۔ بقول غالبؔ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

مغل بادشاہوں کے سکّوں سے اُن کے مذہبی عقیدہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہانگیر کے ڈھالے ہوئے سکّے گول بھی ہیں اور چکور بھی۔ اُس نے چاندی کے سکّے بھی ڈھلوائے اور سونے کے بھی[۳] تانبا بہت کم برتا گیا ہے۔ جہانگیر ہی کے عہد میں سکّہ وزن

۱۔ تزک جہانگیری راجرز اور بیورتج، جلد دوم، صفحہ: ۱۶۷-۱۶۸

۲۔ تزک جہانگیری راجرز اور بیورتج، جلد اول، صفحہ: ۴۴۲-۴۴۳

۳۔ کیٹلاگ آف کوائنز، لاہور میوزیم، آر پی وائٹ ہیڈ، صفحات: ۲۱، ۴۶، ۴۷۔

اور نفاست کے لحاظ سے دُنیا کے کسی بھی ملک کے بہترین سکوں کے مقابلہ میں رکھے جاسکتے ہیں۔ سکوں کے ڈھلوانے میں بھی شہنشاہ کا ذوقِ جمال کارفرما رہا ہے۔ سکوں کے دونوں طرف کندہ عبارت خطاطی کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح یہ سکے نہ صرف تاریخ نما ہیں بلکہ اسلامی فنون کے آئینہ دار بھی۔ مغل بادشاہوں میں کشمیر کی ٹکسال سے سب سے زیادہ سکّے جہانگیر ہی نے جاری کئے۔ اُسکے جاری کردہ سکوں کی تعداد چودہ ہے۔ ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) تک جہانگیری سکّے جاری تھے لیکن اُس کے بعد الٰہی طرز کے سکوں نے اِن کی جگہ لے لی۔ شہنشاہ نے البروج طرز کے دو ہی سکّے اپنی حکومت کے پندرھویں سال میں کشمیر سے جاری کئے۔ ان سکوں پر بُرجِ جوزا (میتھُن) کی شبیہ بھی نظر آتی ہے۔ نور جہاں کے نام ۱۶۲۴ء (۱۰۳۴ھ) ایک مہر کا اجرا ہوا ہے جس پر سرطان (کرک) کی شبیہ اُبھاری گئی ہے۔ مملکت کے دوسرے ضراب خانوں کی طرح کشمیر کی ٹکسال کیلئے بھی ایک شعر مخصوص تھا، جو یوں تھا اور رُوئے و پشتِ ضرب پر اُبھارا جاتا تھا۔

روئے زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

کشمیر کی ٹکسال سے جاری کئے گئے جہانگیری سکوں کی تفصیل یوں ہے:

نمبر شمار	دھات	تاریخ وسال اجراء	روئے	پشت	وزن اور سائز
۱ر	چاندی	۱۰۱۹ھ	نگ مہر و ماہ	نگر ابن اکبر باشاہ	
			ساخت نورالدین	نورالدین جہانگیر	
			روئے بر شاہ		۲۰۹ گرین
			۱۰۱۹		"۷۵

			کشمیر		
٢/	ایضاً	١٠٢٠ھ	ایضاً	ایضاً	ایضاً
٣/	ایضاً	١٠٢١ھ	ایضاً	ایضاً	٢١٠ گرین
٤/	ایضاً	١٠٢٢ھ ٨ اردی بہشت	جہانگیر اکبر شاہ نورالدین	بہشت ماہ اُردی الٰہی کشمیر ٨ ١٠٢٢ حزب	١٧٠ ٠.٨
٥/	ایضاً	١٠٢٢ ٨ شاہ رِدار	ایضاً	ایضاً شہریور	١٧٨ گرین
٦/	ایضاً	١٢٢ ٨ مہر	ایضاً	مہر	١٧٤ گرین
٧/	ایضاً	١٠٢٢ ٨ اسفندارمُز	ایضاً	١٠٢٣ ٨ اسفندارمُز	١٧٠ گرین
٨/	ایضاً	٩ تیر	ایضاً	١٠٢٣ ٩	١٧٥ گرین
٩/	ایضاً	١٠٢٤ ١٠ آذر	ایضاً	تیر ١٠٢٤	١٧٤ گرین
١٠/	ایضاً	١٠٢٦ ١٢	ایضاً	١٠ آذر	
		فروردین		١٠٢٦ ١٢ فروردین	١٧٥ گرین

۱۱/	ایضاً	۱۰۲۷ ۱۳ آذر	ایضاً	۱۰۲۷ ۱۳ آذر	۱۷۲ اگرین
۱۲/	ایضاً	۱۳۱ ۱۷ فروردی	ایضاً	۱۰۳۱ ۱۷	۱۷۴ اگرین
۱۳/	ایضاً مربع	۱۰۲۳ ۱۰	جہانگیر شاہ ۱۰۲۳	فروردی ضرب کشمیر	۲۰ گرین ۳۵۔۰ سائز

باغات لگانے اور حسنِ فطرت کو مزید آراستہ و پیراستہ کرنے کا شغل قدیم ہے۔ عام طور یہی مانا جاتا ہے کہ کشمیر میں مغل شہنشاہوں نے باغات تعمیر کیے۔ کشمیر میں شاہمیری دور سے پہلے بھی چھوٹے پیمانے پر ہی سہی باغات سنوارنے کا شوق موجود تھا۔ زائنہ ڈب (نوشہرہ)، زائنہ لانک (جھیل دل اور وُلر میں) زینہ پورہ اور زینہ کوٹ و دیگر مقامات کو دلرُبا قطعہ ارضی میں تبدیل کرنے کا شوق زین العابدین بڈشاہ کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ چک دور میں بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ مُرورِ ایام نے اکثر ایسے باغات کے نقوش مٹا دیئے، اب صرف نام باقی ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مغل شہنشاہوں نے اپنی نظرِ انتخاب سے ایسے باغات تعمیر کیے جن سے نہ صرف انہوں نے اپنے ذوقِ جمال کی کسی حد تک تشفی کی بلکہ تقریباً ساڑھے تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود جہانگیر کے مینو نظیر منتخب گوشے آج بھی ہمارے لئے راحت و سکون کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جہانگیر کا کہنا تھا کہ کشمیر کی وادی کو ملک نہیں بلکہ ایک باغ ہی کہنا مناسب ہے۔ اُن کے باغات اُن کی ارضی محبت کی یادگار کے طور ہی نہیں بلکہ ذوقِ جمال کے اعلیٰ اقدار کی محافظ کی حیثیت سے بھی ہماری نظروں کو وسعت اور دلوں کو ایک بے نام فرحت عطا کرتے رہیں گے۔

جہانگیر نے شالیمار باغ کی بنیاد ۱۶۱۹ء میں باغِ فرح بخش (The Garden of delight) کے نام سے ڈالی۔ فیض بخش نام سے اس کی توسیع

شاہجہاں کے دور میں ۱۶۳۰ء میں ہوئی لیکن اس کا اپنا پرانا نام یعنی شالیمار ہی مقبول رہا۔ آج کل یہاں روشنی اور آواز (Sound of light) پروگرام کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جو جہانگیر کی زندگی اور تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔

باغ عیش آباد (۳۰ھ مطابق ۱۶۲۲ء) باغِ بحر آرا (۱۶۲۴ء) نور باغ، باغِ دولت آباد، باغِ ارادت خان (۱۰۳۰ھ) باغِ صفا، صفا پورہ، باغِ امرُود، ویری ناگ، اچھہ بل و دیگر مقامات اپنی منفرد تاریخی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ کا تو اب نام ونشان بھی باقی نہیں اور کئی ایک اپنی اصلی حالت برقرار رکھتے ہوئے ہمارے لئے فرحت وشادمانی کا سامان فراہم کررہے ہیں۔ ان باغات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسان کو جنّت سے اسی لئے نکالا گیا کہ وہ اس دُنیا کو بہشتِ ارضی میں تبدیل کردے۔ شاید اسی لئے جہانگیر نے بھی اس ضمن میں اپنا حقیر سا عملی حصہ ادا کردیا اور علامہ اقبالؔ کو کہنا پڑا۔

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

مصوّری اور شبیہ سازی اسلام میں ممنوع ہے لیکن انسان کا باطنی تخلیقی جذبہ کوئی نہ کوئی راہ پا ہی لیتا ہے۔ چنانچہ خطاطی نے اسلامی مصوّری کی جگہ لے لی۔ یہ فنِ شریف صفحۂ قرطاس سے لے کر محلات، مساجد، مقابر اور میناروں کے صدا بہار نقوش کی زیبائی سجائے ہوئے ہے۔ چونکہ مغل بادشاہ علوم وفنون کے دلدادہ تھے اس لئے اُنہوں نے خطاطی کے فن کی سرپرستی کرنا اپنی سعادت سمجھی۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا درباری خوشنویس محمد حسین زرّیں قلم تھا جس نے ابوالفضل کے ''آئینِ اکبری'' کے ایک عمدہ نسخہ کو مصوّر بنایا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کے لئے تین لاکھ روپے صرف کئے۔ نسخہ اب لندن میوزیم میں موجود ہے۔

عہد جہانگیری کا بہترین اور ممتاز کاتب محمد مُراد شیرین قلم کو مانا جاتا ہے۔ خوشنویسی کا کشمیری قلم اُسی سے منسوب ہے۔ شاہجہاں نے اُس کی شہرت سُن کر اُسے

اپنا درباری کاتب مقرر کیا[1]۔ شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ جہانگیر کے دور میں کشمیری زبان وادب پر سکوت طاری رہا۔ البتہ فارسی شعروادب کو فروغ حاصل ہوا جس کا بلاواسطہ مستحسن نتیجہ یہ نکلا کہ آگے چل کر فارسی زبان کے زیرِ اثر کشمیری زبان کے عمومی ڈھانچے میں دُورس تبدیلی آئی اور نہ صرف اِس کے ذخیرۂ الفاظ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا بلکہ اسکی اصنافِ سخن کا دامن بھی کیفیت وکمیت دونوں لحاظ سے بہت وسیع ہوا۔ حیدر ملک چاڈورہ جسے دربارِ جہانگیری سے بڑی قُربت حاصل تھی کی ''تاریخِ کشمیر'' (فارسی) جہانگیر کے عہد ہی کی دین ہے۔ اس خاموش تاریخی عمل میں دربار میں عنایات سے زیادہ کشمیر کے علمی خاندانوں سے وابستہ کشمیری شعراء وادباء کا بہت بڑا دخل ہے جن کی تخلیقی کاوشوں کی صورت میں کشمیری زبان مایوس کُن حالات میں بھی محوِ سفر رہی۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے



---

[1] شیرین قلم۔ جلد۔۱۔ شاخِ نبات۔ محمد یوسف ٹینگ، مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۷۸ء

برج پریمی

کشمیر...... برنیئر کی نظر میں

''......لیکن جب بادل بکھر گئے ہوں، گھبراہٹ گیا ہو اور کشمیر کی بہار یا خزاں نے اپنے اسرار کھول دیئے ہوں تب ایک سخت سے سخت جان سیاح کا دل بھی پگھل جاتا ہے اور وہ برنیئر بن جاتا ہے......''

• ——— ینگ ہسبنڈ ——— •

یہ کیسی مٹی ہے کہ جو اس قدر مشکبار ہے؟ یہ کیسی جگہ ہے کہ جس کے نیلے امبر میں من موہنے کا طلسم ہے؟ یہ کیسی سرزمین ہے کہ جس کی صبحوں اور شاموں میں روحانی اسرار ہیں؟ یہ کیسی وادی ہے کہ جس کے جنگلوں کے سناٹوں میں اپسراؤں کے نغموں کی گنگناہٹ ہے؟ یہ کیسی فضائیں ہیں کہ جن کی ہواؤں میں سورگ کا آنند ہے اور جس کے پربتوں میں حسن کی شراب برستی ہے۔

ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ تہذیب نے انگڑائی لی تو لوگ دور دور سے کارواں در کارواں یہاں آنے لگے۔ موسموں کے سرد و گرم سے بے پروا، بھیانک راستوں کی صعوبتوں سے بے نیاز......شاہ و گدا، صوفی اور سنت، سیاح اور لٹیرے، مورخ اور عالم، بوالہوس اور اہلِ دل۔ ماضی کو ایک پل پلٹ کر دیکھیں تو مشعلیں جلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک سے ایک اہلِ دل اور اہلِ دماغ، سیلانی اور آوارہ گرد، تحیّر اور استعجاب سے آنکھیں ملتے ہوئے یہ لوگ یہاں کی شادابیوں سے مسحور ہوئے اور دل

کے چراغ جلا کر واپس چلے گئے۔ ان میں کچھ اہلِ ہوس اور رہزن بھی تھے کہ اس مٹی کو اپنی ریا کاریوں سے تہہ تیغ کیا۔ شاعر بھی تھے کہ اُمرت برسایا، مورّخ بھی تھے کہ تاریخ کا نیا باب لکھا۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے...... ایسے ہی اَن گنت نامور اور بے نام لوگوں میں ایک فرانسیسی معالج بھی تھا۔ فرانسس برنیر جو یہیں اِسی مٹی کی مہک اور اس وادی کے رنگ و بو سے مسحور ہو کر "برنیر" بن گیا اور سرمستی کے عالم میں اُس کی زبان سے نکلا:

"میں کاشمر سے مسحور ہو چکا ہوں۔
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت حُسن و جمال کی ان تمام جلوہ سامانیوں سے بہت بُلند اور بہت بالا ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی کیا ہو[1]"

فرانکوئیس برنیر جون نام کے ایک فرانسیسی گاؤں میں ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین متوسط طبقہ کے کسان تھے۔ برنیر کی ابتدائی زندگی پردۂ اخفا میں لپٹی ہوئی ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پرورش کس طرح ہوئی۔ اس نے پروفیسر پیری گاسنڈی کے مشہور فرانسیسی فلسفی کے قدموں میں (Physiology) (عضویات) کی درسیات حاصل کیں۔ ۱۶۵۲ء میں اس نے سونٹ پیلسیر کی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس اور پھر اسی سال ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری بھی حاصل کی۔

برنیر کو غیر ممالک کی سیاحت کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس زمانے میں اہلِ یورپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں دریافتوں کا سلسلہ شروع کیا تھا تا کہ پسماندہ ممالک کو دریافت کر کے ان پر کسی طرح سے قبضہ جما لیا جائے۔ نو آبادیاتی راج کا تصوّر پیدا ہو چکا تھا اس لئے سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو نئی حیرت زا کہانیاں سنا سنا کر بہلایا جا رہا تھا۔ برنیر نے ایسی کئی کہانیاں سنی تھیں۔ دوسروں کے تجربات کی کہانیوں نے اسے بھی دُور دراز ممالک کی سیاحت پر اُکسایا۔ چنانچہ ابھی جب وہ زیرِ

---

1. FRANCOIS BERNIER: Travels in the Mughal Empire, Page 400

تعلیم ہی تھا کہ اس نے شمالی جرمنی پولینڈ اور سویز رلینڈ کی سیاحت کی۔ ۱۶۵۴ء میں وہ فلسطین اور شام کی سیاحت سے لوٹا تا کہ اپنے رہنما اور اُستاد پروفیسر گاسنڈی سے مل سکے جس کی زندگی کا سورج ڈوب رہا تھا۔ پروفیسر گاسنڈی نے ۱۶۵۵ء میں اپنے لائق اور ہونہار شاگرد کے بازوؤں میں جان دیدی۔ ۱۶۵۶ء میں فرانکوئیس نے پھر رختِ سفر باندھا۔ وہ مختلف مقامات میں سے گھومتے ہوئے ہندوستان کے ساحل پر پہنچا اور سورت کے مقام پر اُترا۔

برنیر ہندوستان میں اُس وقت پہنچا جب سیاسی لحاظ سے ہندوستان میں زبردست اتھل پتھل تھی۔ مغل تاجدار شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سارے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ اَورنگ زیب کے ہاتھوں اجمیر کے قریب دیورا کی جنگ میں شکست کھا کر احمد آباد کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات برنیر سے ہوئی۔ اس بدنصیب شہزادے کی بیگم کو اسی دوران سُرخ باد کا روگ لگا تھا۔ برنیر اس کا باقاعدہ علاج معالجہ کرنے لگا۔ شاہ جہاں قید ہو کر موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اَورنگ زیب حکومت سنبھال چکا تھا۔ احمد آباد کے صوبے دار نے اسی زمانہ میں اورنگ زیب سے وفاداری کا اعلان کیا۔ اس سے دارا اور بھی گھبرا گیا۔ اس کے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ اس لئے وہ سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ برنیر اس کا ہمرکاب تھا لیکن جھلسانے والی گرمی کے باعث بیل گاڑی جو برنیر کی سواری کے طور پر استعمال کی گئی ٹوٹ گئی۔ دارا برنیر کی سواری کا کوئی معقول انتظام نہ کر سکا اس لئے اسے ساتھ نہ لے جا سکا اور خود رات کی تاریکی میں چھپتا ہوا سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ برنیر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن ہر بار اُسے اپنے جودتِ ذہن نے بچالیا۔ کسی طرح سے وہ ایک امیر کی وساطت سے ۱۶۶۳ء میں دہلی پہنچا جہاں شاہ جہاں آباد کے صوبے دار دانش مند خان کی وساطت سے اُسے مغل دربار میں باریابی حاصل ہوئی لیکن اس کے اندر کا سیاح ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتا رہا اور تھوڑے ہی عرصے میں دہلی اور آگرہ کی درباری زندگی سے واقف

ہو گیا۔ اُس نے دربار میں اس قدر رسائی حاصل کی کہ شاید ہی کسی غیر ملکی کو مغل دربار کی اندرونی سازشوں اور مکروہ سیاست کا اتنا علم حاصل ہوا ہو جس قدر برنیؔر کو علم تھا۔ برنیر اپنے قیام کے بیشتر اوقات میں مغل دَربار کے ساتھ وابستہ رہا۔ برنیر کی اہمیت اس لئے نہیں کہ وہ مشہور شاہی معالج تھا بلکہ اس لئے ہے کہ وہ مغل دربار میں رہا اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ہندوستان کے کئی علاقوں میں گھوما اور اپنی سیاحت کے تاثرات پورے خلوص کے ساتھ قلمبند کرتا رہا۔ ہمارے لئے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ برنیؔر کشمیر آیا اور کشمیر کے بیشتر علاقوں میں بامقصد سیاحت کرتا رہا اور بہت سی ایسی تفاصیل فراہم کیں جن کی آج بڑی اہمیت ہے۔ برنیر آج سے تین سو سال پہلے ہمارے یہاں آیا تھا۔ اس کا سفرنامہ ہمیں تین سو سال قبل کے کشمیر میں واپس لے جاتا ہے اور ہم اس عینی گواہ کے تاثرات اور تاریخی حقائق پڑھ کر اس دُور کی زندگی معاشرے کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

اورنگ زیب کشمیر کی سیاحت کے لئے دہلی سے ۶ دسمبر ۱۶۶۴ء کو روانہ ہوا۔ برنیؔر اس شاہی قافلے کے ہمراہ تھا۔ یہ قافلہ ۲۵ فروری ۱۶۶۵ء کو لاہور پہنچا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کا قیام اس قافلے کے ساتھ چند ماہ رہا۔ وہ ۱۶۶۸ء کو فرانس واپس لوٹا جہاں اپنی کتاب ۱۶۶۹ء میں مکمل کرلی۔ فرانس میں ہی اس کا انتقال ۱۶۸۸ء کو ہوا۔

برنیؔر کا یہ سفرنامہ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہ کسی شاہی حکم کے تحت نہیں لکھا گیا۔ اس سفرنامے کا مقصد ذاتی شہرت حاصل کرنا تھا نہ مغل شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ یہ برنیر کے اپنے اندر کے سچّے سیّاح کی لگن تھی جو وہ مختلف مقامات کی سیر کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرتا تھا۔ ان بیانات کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ سفرنامہ ایک غیر ملکی نے لکھا ہے۔ اس لئے اس کا اپنا انداز ہے۔ اس کے سوچنے کا ڈھنگ مغربی ہے۔ وہ مغرب کے معیار سے یہاں کی روایات اور یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ بعض مقامات پر ہمارے اعتقادات

کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ اور کشمیریوں کی سادگی کو ہدفِ ملامت بناتا ہے۔ ہمیں ضعیف الاعتقاد کہتا ہے اور کئی جگہوں پر ایسی باتیں بیان کرتا ہے جن سے گماں گزرتا ہے کہ اس نے ہم سے زیادتی کی ہے لیکن اس بات کے باوجود اس مختصر سے سفرنامے کی افادیت کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کشمیر آنے کے راستوں اور گذرگاہوں کا ذکر کرتا ہے اور اس عہد کے کشمیر کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ یہاں کے حسنِ لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر بنتا ہے اور یہاں کی صناعی، ہنر مندی، فنکارانہ باریکی کو خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

اورنگ زیب اپنے شاہی کارواں کے ساتھ دہلی سے لاہور، لاہور سے بھمبر اور بھمبر سے کشمیر آیا جسے مغل ہندوستان کی جنّت (Paradise of India) کہتے تھے۔ برنیر نے یہ سفرنامہ مکاتیبی فارم میں لکھا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو مکاتیب لکھتا ہے جس میں اس حیرت زا سفر کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے۔ اپنا پہلا خط وہ دہلی سے میوسیو ڈیمر ویلسن کو ۱۴ دسمبر ۱۶۶۴ء کو لکھتا ہے۔ سفرنامے کی یہ روداد برنیر نے اپنے منفرد اور دلچسپ انداز میں اپنے گہرے مشاہدے اور تجربے کی بناء پر اپنی مشہور کتاب میں قلم بند کی ہے۔ جس کا عنوان ''ٹریولز اِن ہندوستان'' یا ''دی ہسٹری آف دی لیٹ ریولیوشن آف ڈومینیز آف گریٹ مغل''......۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۱ء ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ پہلی بار ہنری اولڈن برگ (Henrey Ouldin Burg) نے ۱۶۸۴ء میں کیا۔ دوسری بار اس کا ترجمہ ۱۸۹۱ء میں ''ٹریولز ان مغل ایمپائر (۱۶۵۶ء-تا-۱۶۶۸ء)'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ ترجمہ آرچ بالڈ کانسٹیبل (Archibald Constable) نے کیا تھا۔ اس مجموعے کے علاوہ دوسرے مباحث اور مضامین کے کل بارہ خطوط شامل ہیں جن میں نو مکاتیب میوسیو ڈیمر ویلسن کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان نو خطوط کا تعلق کشمیر کی سیاحت سے ہے۔ برنیر کے مطابق اورنگ زیب ۶ دسمبر ۱۶۶۴ء کو دہلی سے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ اپنی علالت کے بعد اورنگ زیب تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے صحت یاب ہونے پر لاہور

اور کشمیر جانا چاہتا تھا۔ جوتشیوں نے شبھ مہورت دیکھ لیا تھا۔ یہ بیان اورنگ زیب کی افتادِ طبع کے پیش نظر مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اورنگ زیب جیسے شہنشاہ نے جوتشیوں کو اس قدر درخورِ اعتنا سمجھا تھا کہ وہ سفر کے وقت بادشاہ کا مہورت دیکھتے تھے۔ شہنشاہ اپنے ساتھ ۲۵ ہزار رسالدار ذاتی محافظین کی حیثیت سے لے آتا تھا۔ اس کے علاوہ دس ہزار سے زاید پیادہ فوج اور توپ خانہ بھی تھا۔ یہ مغلئ جاہ وحشمت تھی۔ شہنشاہ کے ساتھ دو کیمپ ہوا کرتے تھے جن میں ایک کیمپ ''پیشِ خیمہ'' کہلاتا تھا۔ یہ کیمپ شہنشاہ کے پڑاو پر پہنچنے سے قبل شہنشاہ کے شایانِ شان استقبال کے لئے تیار رہتا تھا۔ ایسے کیمپوں کا سلسلہ اکبر کے زمانے سے جاری تھا۔ آئینِ اکبری کے مطابق ایسے کیمپوں کے لئے ۱۰۰/ ہاتھی، ۵۰۰/ اونٹ اور ۴۰۰/ بیل گاڑیاں اور ۱۰۰/ بار برداروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ برنیر کے زمانے میں یہ تعداد کچھ کم ہوگئی تھی اور صرف ۶۰/ ہاتھی، ۲۰۰/ اونٹ اور ایک سو خچر اور ۱۰۰/ بار بردار استعمال ہوتے تھے۔ یہ معمولی فرق ہے۔ اس سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر زیادہ جاہ وحشم کا قائل تھا۔ اس کا ایک سرسری اندازہ نیچے درج کئے گئے ایک خط کے اقتباس سے ہوگا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ لاہور پہنچنے پر بہر حال یہ شاہی قابلہ لگ بھگ دو ماہ رہا اور بڑے صبر اور اطمینان سے کشمیر کے پہاڑوں پر برف کے پگھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

برنیر نے اپنے ساتویں خط بتاریخ ۱۰/ مارچ ۱۶۶۵ء کو لاہور سے آخر کار کشمیر آنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کا انداز اگرچہ مکاتیبی ہے لیکن اس کا اسلوب شاعرانہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''سورج طلوع ہو رہا ہے لیکن گرمی کا اسلوب ناقابلِ برداشت ہے۔ آسمان پر بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا بھی نہیں۔ نہ ہی ہوا کی کوئی آہٹ سنائی دے رہی ہے...... میرے گھوڑے تکان سے چور ہیں...... لاہور سے چلنے کے بعد ان کو سرسبز گھاس کا ایک تنکا بھی دستیاب نہ ہوسکا۔ کل ہمارا

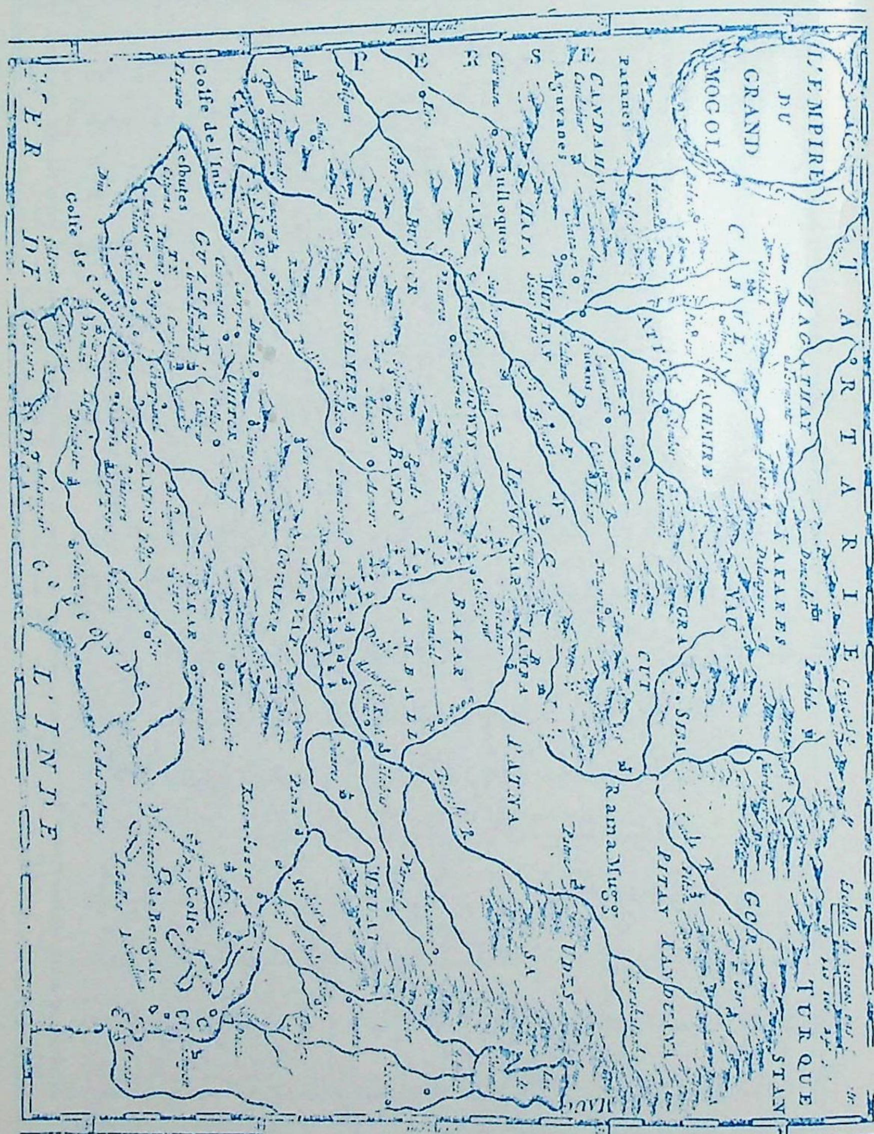
ایک بار بردار جس کے پاس خیمہ نہیں تھا رات بھر کھلے آسمان
کے نیچے رات گذارنے کے لئے پڑا رہا۔ ایک پیڑ کے نیچے
اس کی لاش ملی۔ میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ میں بھی خود
رات ڈھلنے سے پہلے ہی کہیں مر نہ جاؤں...... میری تمام
امیدیں اس محلول کے ساتھ وابستہ ہیں جس میں لیونا ڈ خشک
دہی اور گھلی ہوئی شکر ملی ہوئی ہے۔ جو میں ابھی پی چکا ہوں
اور مزید پینے جا رہا ہوں۔
روشنائی بھرے قلم کے نب میں سوکھتی جا رہی ہے اور قلم خود
بخود ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے"[1]۔

یہ سب اپنی جگہ لیکن برنیر کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مغل بادشاہوں کے مقابلے میں اورنگ زیب لوگوں کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ جس جاہ وحشمت کے سامان کے ساتھ وہ لاہور آیا تھا اس کا خاصا حصہ کشمیر میں داخل ہونے سے قبل واپس کر دیا تاکہ کشمیر میں اناج کی قلت پیدا نہ ہو۔ فوج کے ساتھ بیشتر امراء وعمائدین اور ان کے عملے کو واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ صرف اپنی چہیتی بہن روشن آراء اور اس کی چند ہم جلیس خواتین رکھ لی گئیں۔ ایک اعلیٰ افسر پہاڑی دّرے کے پاس تعینات کیا گیا تاکہ امراء اور منصب داروں کو وادی میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی۔ برنیر کا خیال ہے کہ تقریباً ۱۵ ہزار قلی پہلے سے ہی کشمیر میں جمع تھے جو صوبہ دار کشمیر کی مدد کے لئے پڑوس کے بادشاہوں نے بھیج دیئے ہوں گے یا از خود معاش کی تلاش میں آئے ہوں گے۔ ایک شاہی حکم کے مطابق ہر ۱۰۰ ر پونڈ وزن کے لئے ۱۰ ر کراؤن مقرر تھے اور گمان غالب ہے کہ اس طرح سے ۳۰ ر ہزار لوگوں کو روزگار مہیا ہوا ہوگا۔

کشمیر میں برنیر کا قیام تقریباً تین ماہ سے زیادہ رہا۔ یہاں پہنچ کر وہ صرف

---

1 FRANCOIS BERNIER: Travels in the Mughal Mughal Empire, page389



فرانکوئس برنیئر کا مغل سلطنت کا نقشہ فرانسیسی زبان میں

برنیئر کا ترتیب دیا ہوا کشمیر کا نقشہ

معالج کی حیثیت سے شاہی مریضوں کا علاج معالجہ نہیں کرتا بلکہ وہ کُھلی آنکھ سے قدرت کے جلوؤں کو دیکھتا ہے اور شاعر بنتا ہے۔ وہ اُن راستوں اور گذرگاہوں کی تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ جہاں سے شاہی کارواں گذرا، وہ کشمیریوں کے رہن سہن، ان کے اخلاق، ان کے آدابِ زندگی کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس کا مطالعہ زیادہ گہرا بھی نہیں اور نہ بالکل سطحی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے نقطۂ نظر سے خلوص ہی برتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی سوچ اور اس کا تفکّر مغربی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے نقطۂ نظر سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ ایک بات کو البتہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے نہ صرف لوگوں کے بارے میں اپنی رائے مرّتب کی بلکہ یہاں کی تاریخ اور یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں اور اپنے مکاتیب میں اس کا اظہار کیا۔ وہ حیدر ملک کی تاریخ کا ذکر کرتا ہے جو شاہجہاں کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ وہ اِسے فارسی سے فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ ستی سر کے پانی کی نکاسی کو کشپ ریشی کا معجزاتی کارنامہ تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اسے انسانی کارنامہ بھی قرار نہیں دیتا۔ اس کا اظہار خیال یوں کرتا ہے:

''میرا اِس کے برعکس یہ خیال ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے نیچے کسی غار میں ڈوب گیا اور بعد میں ایک زبردست بھونچال سے جو ایسے مما لک میں غیر ممکن نہیں ہے، ظاہر ہوا[1]''

کشمیر کے حدودِ اربعہ کو وہ تقریباً تیس لیگ لمبا اور دس سے بارہ لیگ[2] چوڑا بتاتا ہے۔ یہ ہندوستان کی سرحد پر لاہور کے شمال میں واقع ہے اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ گھیرا ڈالے ہوئے ان پہاڑوں پر گھنے جنگل اور وسیع مرگ ہیں جہاں لاتعداد بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی گھاس چرتے ہیں۔ یہاں جانوروں کی بھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ تیتر، خرگوش، ہرن اور مشک بار جانوروں کا ذکر کرتا

---

۱ FRANCOIS BERNIER: Travels in the Mughal Empire, page 394

۲ لیگ مسافت کا پیمانہ ہے جو تین میل کے برابر ہے۔ اسے فرسخ بھی کہا جاتا ہے۔

ہے۔ لیکن شیر، چیتے، ریچھ، زہریلے سانپ اور اس طرح کے موذی جانور عنقا پاتا ہے۔ وہ یہاں پہاڑوں پر دودھ اور شہد کی ندیاں بہنے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہاڑ بلند و بالا ہیں جن پر برف کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ چوٹیاں دھند اور بادل سے بہت اونچی اور نظروں سے اوجھل ہیں۔ برنیر جب اس بے پناہ حسن کے جلوؤں کو دیکھتا ہے تو بھر بھر کر اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے۔ وہ اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ اُس کا جذبہ و احساس پگھل کر شاعرانہ لہجہ اختیار کرتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

> ''ان تمام پہاڑوں کے اطراف سے اَن گنت چشمے اور ندیاں پھوٹتی ہیں جو بے شمار پہاڑیوں پر ندیوں اور جھرنوں کی شکل میں سفر کرتی ہیں اور پھر وادی میں پہنچ کر دھان کے وسیع کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ہزاروں جھرنوں اور نالوں کی شکل اختیار کر کے یہ صاف و شفاف پانی ہزاروں آبشاریں بناتا ہوا چلا جاتا ہے اور ایک بڑے دریا کی شکل اختیار کرتا ہے جس میں کشتی رانی ہوتی ہے[1]۔''

برنیر کی نظر بہت تیز ہے اور مشاہد عمیق۔ وہ یہاں کے پھلوں کو دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور سیب، آلوچے اور اخروٹ اور ناشپاتی کا ذکر بے محابا کرتا ہے۔ پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ دیکھ کر وہ مچل اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ پھول اور پھل یورپی ہیں لیکن ان پھلوں کی مٹھاس اور لطافت اُسے پسند نہیں۔ وہ انہیں اپنے ملک کے پھلوں سے کم تر درجہ دیتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ پھلوں کی جتنی قسمیں یورپ میں اُگتی ہیں اُس کے مقابلے یہاں کے پھل بہت کم تعداد میں اُگتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہاں کی زرخیز مٹی کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ اس کمی کو یہاں کے مالیوں اور باغبانوں کی جہالت اور ان کی کم علمی پر محمول کرتا ہے۔ یہ خیال اُسے پلک جھپکنے میں فرانس کے میوہ زاروں میں لے جاتا ہے جہاں کے

---

[1] FRANCOIS BERNIER: Travels in the Mughal Empire, page 396

مالیوں اور باغبانوں اور اس صنعت سے تعلق رکھنے والوں کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔

برنیر کشمیر کی راجدھانی کو بھی کاشمر کہتا ہے[1]۔ وہ ہندوستان کو اِندوستان کہتا ہے۔ اسے یہاں دنیا کے بعض ممالک کی طرح فصیلوں سے گھِرا ہوا شہر بھی نظر نہیں آتا[2]۔ اس کے مطابق شہر کی لمبائی ایک لیگ کے تین چوتھائی کے برابر ہے اور چوڑائی میں آدھا لیگ ہے۔ اس کے اطراف میں نصف دائرے کی شکل میں پہاڑوں نے گھیرا ڈالا ہے۔ یہ پہاڑ شہر سے صرف دو لیگ کی دوری پر ہیں۔ برنیر نے وتستا پر صرف دو پُل کھڑے دیکھے تھے۔ مکان دو یا تین منزلہ تھے جو پتھروں کے بنے تھے۔ اُس نے عمارتوں کی بھاری تعداد کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں بھی مندروں کے کھنڈرات خاصی تعداد میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

برنیر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شہر کا ہر کونہ دیکھا تھا۔ وہ ہاری پربت اور شنکر آچاریہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق شہر کے ایک سرے پر ایک پہاڑی ہے جس پر خوبصورت مکانات تعمیر ہیں۔ مکانوں کے ساتھ باغیچے ملحق ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک مسجد اور ایک مندر ہے۔ اس پہاڑی پر درختوں کی خاصی تعداد ہے۔ برنیر کے مطابق مقامی لوگ اِسے ہری پربت[3] کہتے ہیں۔ برنیر اس دوسری پہاڑی کا ذکر بھی کرتا ہے جو اس پہاڑی کے سامنے واقع ہے۔ اس پہاڑی پر بھی ایک پرانی عمارت ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ مندر رہو گا۔ برنیر لکھتا ہے:

---

[1] شری نگری کشمیر کی راجدھانی کا قدیم نام ہے جو مہاراجا اشوک نے اسے دیا تھا۔ اسلامی عہد میں یہ نام تبدیل ہو کر پھر کاشمر ہو گیا۔ سکھ عہد میں اسے پھر سری نگر کہا گیا۔

[2] حیرت ہے کہ برنیر کا ذہن ناگرنگر کی طرف کیوں نہیں جاتا جو ہاری پربت کے ایک طرف فصیل کے اندر آباد تھا۔

[3] برنیر ہاری پربت کو ہری پربت HARYPERBET یا شاداب پہاڑ کہتا ہے۔ ہاری پربت سے متعلق وہ کسی دیو مالائی تصور کا ذکر نہیں کرتا۔

''اس پہاڑی کے سامنے دوسری پہاڑی نظر آتی ہے جس پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجد سے ملحق ایک باغیچہ ہے، اس کے ساتھ ہی ایک بہت ہی قدیم عمارت بھی کھڑی ہے جسے اگرچہ تختِ سلیمان کہتے ہیں مگر آثار بتا رہے ہیں کہ یہ ایک مندر رہا ہوگا۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہ اس مشہور بادشاہ نے بنائی تھی جب وہ کشمیر تشریف لائے تھے۔ لیکن مجھے شُبہ ہے کہ وہ بھی یہ ثابت کر سکیں گے کہ یہ سرزمین ان کی موجودگی سے کبھی سرفراز ہو چکی ہے[1]۔

برنیر قدرت کے نظاروں کا عاشق تھا۔ پھل، پھول، پہاڑ، جھرنے، ندیاں، جھیلیں، باغ، سبزہ زار اُسے حد سے زیادہ پسند تھے۔ وہ مغل باغوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ باغوں کے بیان میں وہ سب سے زیادہ تعریف شالیمار کی کرتا ہے جسے وہ ''چاہ لمار'' کا نام دیتا ہے۔ برنیر کے مطابق یہ باغ بادشاہ کی ملکیت ہے۔ ڈل جھیل سے داخلے کی نہر کے دونوں اطراف میں شاداب سبزہ ہے اور پھر سفیدے کے درخت قطار اندر قطار۔ برنیر اس باغ کے ایک ایک قدم کو ناپتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اس کی بارہ دریوں، اس کے شاداب سبزے، اس کے پھولوں اور پھلوں، آبشاروں اور فواروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اَنجانی دنیاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ اتنی باریکی سے شاید ہی کسی سیاح نے شالہ مار کو دیکھا ہو۔

برنیر کا ذوقِ جمال دیکھئے کہ وہ بارہ دریوں، اس کی گیلریوں، اسکے بام و در کے ایک ایک حصّے کو بیان کرتا ہے۔ وہ اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت کرتا ہے کہ مغلوں نے یوں ہی جذباتی انداز میں کشمیر کو ''جنتِ ارضی'' نہیں کہا تھا۔ اکبر نے اسے دائمی طور اپنے قبضے میں رکھنا چاہا اور جہانگیر اس کے حُسن پر اِس قدر فریفتہ تھا کہ اس نے اسے اپنی سب سے محبوب آرام گاہ بنایا۔ اس نے کہا تھا کہ کاشمر کو اپنے پاس رکھنے

---

[1] BERNIER: Travels in the Mughal Empire, page 399

کے لئے وہ اپنی عظیم سلطنت کے کسی بھی صوبے کو قربان کرسکتا ہے[1]۔

برنیر نے جس جذبے اور مشاہدے اور جس گہرائی سے اس سرزمین کو دیکھا تھا اس کا ثبوت اس کے مختلف مطالعوں اور بیانات میں ملتا ہے۔ وہ کشمیری ذہن کی تعریف کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کشمیر کے کاریگر اور فن کار ہندوستان کے کاریگروں میں سب سے زیادہ خوش مذاق، ہنرمند اور اختراع پسند ہیں۔ اس کے مطابق کشمیری کاریگروں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں ہندوستان کے ہر حصے میں مقبول ہیں۔ وہ پیپر ماشی کے بارے میں کچھ نہیں کہتا مگر لکڑی پر کھدائی کے کام کو نظر تحسین سے دیکھتا ہے۔ وہ کشمیری شال بافی کی تعریف کرتا ہے۔ وہ شالوں کی لمبائی ۱-۱/۲ ایل (ELL) اور چوڑائی ۱-۲ ایل (ELL)[2] بتاتا ہے۔ شالوں پر کشیدہ کاری کے کام کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ برنیر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ شال نہ صرف مغلوں بلکہ بیشتر ہندوستانیوں کے زیر استعمال رہتے ہیں۔ وہ یہاں کے شالوں کو اسپینی شالوں سے زیادہ مہین پاتا ہے۔ وہ خاص طور پر توسہ شال کی بے پناہ تعریف کرتا ہے۔

برنیر نے کشمیر کے قیام کے دوران با مقصد سیاحت کی ہے۔ وہ جگہ جگہ گھوما ہے۔ وہ یہاں کے قدرتی مقامات کو دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا ہے اور جب حُسن کے اس لازوال خزانے کے بارے میں اظہار کرتا ہے جو اُسے جگہ جگہ کھلا

---

1. BERNIER: Travels in the Mughal Empire, page 401

کشمیر جہانگیر کی ایک بڑی کمزوری تھا۔ وہ اکثر اپنی عظیم سلطنت کی مصروفیات بھول کر کشمیر کی عطر بیز ہواؤں میں پناہ لیتا تھا۔ اس کا انتقال بھی کشمیر سے واپس لوٹتے ہوئے راجوزی کے قریب جھانکس سرائے میں ہوا تھا۔

2. لمبائی کا ایک ناپ جو بازو کی لمبائی سے لیا گیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گز۔

ہوا ملتا ہے تو اس کا لہجہ شاعرانہ آہنگ اختیار کرتا ہے[1]۔ طوالت کے خوف سے صرف چند جگہوں کے بارے میں اس کے اظہار کا اعجاز پیش ہے جن کو دیکھ کر اُس پر سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس اظہار میں اس کے جذبے اور احساس کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً اچھ بل کا ذکر یوں کرتا ہے:

"یہاں سب سے خوبصورت وہ چشمہ ہے جس کا پانی بکھر کر تقریباً ۱۰۰ اکنال زمین میں پھیل جاتا ہے۔ یہ چشمہ دھرتی کا سینہ چیرتا ہوا اس قدر شور مچاتا ہوا باہر نکل آتا ہے جیسے کسی کنویں سے پھوٹا ہو۔ پانی کی بہتات اس قدر ہے کہ اسے چشمے سے دریا کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا پانی برفاب ہے۔ یہاں چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ ہیں۔ چشمے میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ہیں۔ بیچ میں ایک شاندار آبشار گرتا ہے۔ راتوں کو دیواروں میں بند لاتعداد چراغ

---

[1] کشمیر کے حسن لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ شاعر بنتا ہے۔ لیکن جب یہاں کے ذہن، یہاں کی ہنرمندی اور صناعی کا ذکر آتا ہے۔ تو اس کی باریکیوں کو بیان کرتا ہے اور فن کاروں کو داد دیتا ہے جو اپنی روح کا درد اور آنکھوں کی بینائی ان شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کشمیری اپنی ذکاوت کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے لوگوں سے زیادہ ذہین سمجھے جاتے ہیں۔ شعروشاعری اور سائنسی علوم میں یہ ایرانیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ بڑے ہوشیار اور محنتی لوگ ہیں۔ ان کی کاریگری کا احساس ان پالکیوں، پلنگوں، قلمدانوں، چمچوں اور دوسری ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ یہ بڑی شاندار چیزیں ہیں اور ہندوستان کے طول وعرض میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز سے ان ملکوں کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور جس سے وہ مالا مال ہوتے ہیں۔ وہ ایسے گراں قدر شال ہیں جو وہ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔" (جلوۂ صدرنگ، از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۲۵)

پانی کی سطح کے نیچے سے روشن کیئے جاتے ہیں[1]۔"

وہ ویری ناگ کا ذکر کرتا ہے جس کی تعمیر کا ڈیزائن اس کے مطابق نورمحل نے بنایا تھا اور جسے جہانگیر کے حکم سے ۱۶۱۲-۱۶۱۹ء میں بنوایا گیا۔

برنیر کے مکاتیب میں بارہ مولہ کا ذکر بھی آتا ہے جسے وہ "بارہ موے" کہتا ہے۔اس کے پاس کی مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے جہاں ایک درویش قلندر کا مزار ہے۔ اور لوگوں کا اس پر بے پناہ اعتقاد ہے۔وہ اس مزار کے احاطے میں اُس پُراسرار پتھر کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جسے عام طور سے ایک آدمی اٹھا نہیں سکتا۔عام خیال ہے کہ اس بزرگ کا خیال دل میں رکھ کر گیارہ آدمی اس پتھر کو اپنی گیارہ انگلیوں کی پوروں سے اس طرح اٹھا سکتے ہیں جیسے گھاس کا تنکا اٹھا رہے ہوں[2]۔لیکن برنیر اس کو دھوکہ دہی پر محمول کرتا ہے۔اس کا ردِعمل ملاحظہ ہو:

"میں نے اسے آخرکار مناسب سمجھا اور دونوں انگلیوں اور انگوٹھے سے اس پتھر کو تھام لیا۔ بڑی مشکل سے ہم اسے اٹھانے میں کامیاب ہوئے۔ سب لوگ میری طرف کھا جانیوالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔میں اس خوف سے کہ کہیں مجھے سنگسار نہ کیا جائے، چلایا...... "کرامت"...... اور ایک روپیہ پھینکتے ہوئے ہجوم میں غائب ہوگیا[3]۔

برنیر نے جھیلوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور کئی جھیلوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اُسے سطح آب پر جنگلی ہنس اور دوسرے سرمائی پرندے بھی نظر آتے ہیں۔مغل

۱۔ F.BERNIER: Travels in the Mughal Empire

۲۔ برنیر غالباً "کاہ کاہ پل" نام کے پتھر (گیارھواں والا پتھر) کا ذکر کرتا ہے جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ جب ۱۱ آدمی اس پتھر کے چاروں اطراف کھڑے ہوکر اپنی گیاہ انگلیوں کی پوروں سے دبالیں اور گیارہ بار "گیارہ گیارہ" کے اعداد دہرائیں تب پتھر اپنی جگہ سے ہل کر اٹھایا جاسکتا ہے۔یہ پتھر حالیہ برسوں تک بجبہاڑہ کے ایک مندر میں موجود تھا۔معلوم نہیں برنیر کو یہ پتھر بارہ مولہ میں کیسے ملا۔

۳۔ F.BERNIER: Travels in the Mughal Empire, page 415

صوبے دار جاڑوں میں ان پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ ایک جھیل کے درمیان ایک مٹھ کا ذکر کرتا ہے جس کے بارے میں اس نے عام لوگوں کی زبان سے یہ سُن لیا تھا کہ مٹھ سطحِ آب پر تیرتا ہے اور اس مٹھ میں رہنے والا سنت کبھی باہر نہیں آتا۔

وہ بڈ شاہ کی تعمیر کروائی ہوئی مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے۔

برنیر اپنے مکاتیب میں کئی اور پُراسرار مقامات، جھیلوں، چشموں اور پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کشمیریوں کے جودتِ ذہن کی تعریف بھی کرتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی ضعیف الاعتقادی کا تمسخر بھی اُڑاتا ہے۔ اس نے کئی پُراسرار مقامات پر سے پردے سرکانے کی سعی کی ہے۔ کہیں کہیں اس کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی بعض محیرالعقل مقامات کے بارے میں وہ خاموش رہتا ہے۔ وہ اُس چشمے کا ذکر کرتا ہے جہاں پانی کے بلبلے زور سے اُبھرتے ہیں اور اپنے ساتھ ریت کے ذرات لے آتے ہیں۔ اور پھر اسی راستے نیچے اتر کر غائب ہو جاتے ہیں جس کے بعد پانی کی سطح بے حرکت ہو جاتی ہے۔ وہ گنگا بل کی جھیل کا ذکر کرتا ہے اور سنگِ سفید کا بھی کہ جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ لوگوں کا ہجوم بڑھ جانے سے وہاں کی ہواؤں میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور زوروں کی بارشیں آجاتی ہیں۔ اس مقام کے حوالے سے وہ شہنشاہ شاہجہاں کا ذکر کرتا ہے جو اپنے بعض مصاحبوں کے ساتھ اس جگہ سیر کے لئے آیا تھا اور شہنشاہ کی تنبیہ کے باوجود وہاں شوروغل بلند ہوا تھا اور اتنی بارشیں ہوئی تھیں کہ پوری پارٹی بال بال بچ گئی تھی۔ اس صورتِ حال کی کاٹ برنیر کے عقل و استدلال میں نہیں۔ وہ یہاں خاموشی سے کوئی رائے دیئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔

برنیر نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کئی جگہوں پر کشمیریوں کی ذہانت کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ ان کی تلاش و تحقیق کی صلاحیت سے مطمئن نظر نہیں آتا۔ وہ اس بات پر اظہارِ تاسف کرتا ہے کہ وہ اپنے مکتوب الیہ کو پوری معلومات فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ:

> ''اس موضوع نے میرے خیالات کو میری آمد کے وقت
> سے ہی محصور کر لیا ہے۔ لیکن مجھے کوئی موافق اور ہم مزاج



اورنگ زیب عالمگیر



مسجد مُلا آخون شاہ اور قلعہ ہاری پربت

بادام اندر بادام - کشمیری ساوار - کاریگری کا انمول نمونہ

نہیں ملا۔ کسی ایسے شخص سے بھی ملاقات نہ ہوئی کہ جس کا
ذہن مشاہدے اور تحقیق و تلاش کی صلاحیت سے بھرپور ہو۔
جسے ان معاملات کی واقفیت ہو کہ جن کے بارے میں مجھے
اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع فراہم ہوتا[1]۔

برنیر کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے جو شخص کشمیر کے تمام اہم مقامات کی سیر کر چکا ہو، مختلف النوع لوگوں سے مل چکا ہو، یہاں ایسے عالموں اور فاضلوں اور شاعروں کو پا چکا ہو جن کا کلام فارسی زبان کے بڑے بڑے شعراء سے کسی درجہ بھی کمتر نہ ہو اُسے کشمیر کی سیاحت کے دوران کوئی ایسا عالم اور مورّخ کیوں مل نہ سکا کہ جو اُس کے شکوک رفع کرتا۔

برنیر یہاں کے لوگوں کے حُسن و صورت کا بھی قائل ہے۔ وہ خاص طور پر نسوانی حُسن کی تعریف کرتا ہے۔ وہ مغل امراء کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ کشمیر آ کر رشتۂ ازدواج بھی قائم کرتے تھے تا کہ ان کی اولاد خاص مغل نسل جیسی معلوم ہو۔

فرانسس برنیر کے مکاتیب میں ایک جگہ اس کے مکتوب الیہ کے پانچ سوال درج ہیں۔ یہ سوال سفرناموں کے ایک فرانسیسی ناشر موسیو تھیوی ناٹ نے اپنے ایک دوست کی معرفت سے برنیر سے پوچھے تھے۔ ان مختلف النوع سوالات میں سے ایک سوال کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اس کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ یہ سوال یوں ہے:

''کیا یہ صحیح ہے کہ یہودی عرصۂ دراز تک سلطنتِ کشمیر میں رہے ہیں؟ کیا ان کے پاس مقدس الہامی کتابیں ہیں اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا ان کے اور ہمارے عہد نامہ قدیم (Old Testament) میں کوئی اختلاف ہے؟

برنیر اس خیال کو ہی رد کر دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے مشاہدات کی بنیاد پر یہودیت کے کئی آثار کا ذکر کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

(ا) پیر پنچال کو عبور کرنے کے بعد سرحدی دیہاتوں کو دیکھ کر مجھے

---

[1] BERNIER: Travels in Mughal Empire. page 414

محسوس ہوا کہ وہ یہودیوں سے مشابہہ ہیں۔ ان کی شبیہ اور طور طریقے ایسے تھے جو ایک قوم اور دوسری قوم میں خطِ فاصل ڈالتے ہیں۔

(ب) دوسرا ثبوت موسیٰ علیہ السلام کا نام ہے جو عام طور پر استعمال میں ہے۔ اگرچہ لوگ مسلمان ہیں۔

(ج) یہاں ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے پانی کے لئے بارہمولہ کے قریب پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ نکالا۔

(د) عام خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کشمیر میں وارد ہوئے تھے ان کا روضہ ایک لیگ کے فاصلے پر شہر میں ہے۔

(ر) ایک چھوٹی قدیم عمارت ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جسے حضرت سلیمانؑ نے بنوایا تھا۔ اس لئے آج تک یہ پہاڑی تخت سلیمان کہلاتی ہے[1]۔

اس سوال کے بیشتر حصوں کے امکانات پر برنیر ابتداء میں ہی غور کر چکا ہے اور خود ہی اس تصور کو رد کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

- ......ہوسکتا ہے کہ کچھ یہودی یہاں رہے ہوں لیکن یہاں کی آبادی مسلمانوں اور غیر مسلموں پر مشتمل ہے[2]۔
- ......مجھے شبہ ہے کہ کیا کوئی اس بات کو ثابت کرسکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے قدموں سے اس سرزمین کو کبھی فیض یاب کیا ہو[3]۔

بہر حال برنیر کا یہ سفر نامہ خاصا دلچسپ ہے اور کشمیر کی تاریخ، یہاں کے

---

1. FRANCOIS BERNIER: Travels in Mughal Empire. Page 431
2. IBID Page 439
3. F.BERNIER: Travels in Mughal Empire Page 399.

جغرافیہ، یہاں کے باشندوں، ان کے رہن سہن، ان کے آداب زندگی، یہاں کی صناعی اور کاریگری کے کئی دلچسپ رُخ بے نقاب کرتا ہے۔

برنیر کوئی مورخ نہیں تھا۔ وہ ایک معالج تھا لیکن اس کی آنکھ ایک نہایت ہی باریک بین مورخ اور محقق کی آنکھ تھی۔ اس کے سینے میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ شاہی مصاحبت میں اس کے شب و روز ذہنی عیاشیوں کی نذر نہیں ہوئے بلکہ اپنی بساط کے مطابق اور اپنے معیار کے حوالے سے پورے خلوص کے ساتھ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ کاغذ پر اُتارا اور ایک کارنامہ انجام دیا۔ برنیر کے یہ مکاتیب اس کے جذباتی ردعمل تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے ان مکاتیب میں اپنے مشاہدات کا رس نچوڑ لیا ہے اور بڑی جگر کاری سے ایک ایسا باب لکھا ہے جس سے ہمارے ذہن کے دریچوں میں ایک لمحے کے لئے 'ہی سہی' روشنی کی ایک نئی کرن دستک دیتی ہے۔ حیرت ہے کہ قلیل عرصے میں اس سمندر پار رہنے والے پردیسی نے اس قدر مواد کیسے سمیٹا اور صرف سمیٹا ہی نہیں اسے اپنے معیار اور نقطۂ نظر کے مطابق پرکھا اور آنے والی نسلوں کے لئے کاغذ پر محفوظ کرلیا۔ اگر تفصیل میں جانے کا یہاں محل نہیں پھر بھی کشمیر کی تاریخ کے اس دلچسپ باب کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ان نادر خطوط کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

سید رسول پونپر☆

ولیم مُور کرافٹ اور کشمیر

سیاحت اگر اکثر نہیں تو کبھی کبھی سیاست اور تجارت سے جُڑی ہوئی ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے قیام میں انکی کلیدی حیثیت بدلتی رہتی ہے اور اِنکا تاخیر و تقدم سے وقوع پذیر ہونا کوئی اَچنبھے کی بات نہیں ۔ مہم باز ہوں یا فطرت کے شیدائی، تہذیب شناس ہوں یا انسانی ثقافت و تمدّن کے بحرِ ذخّار کے غوطہ خور، ماہرِ لسانیات ہوں یا عمرانیات کے دلدادہ، معالج ہوں یا ماہرینِ تعلیم، اَدب شناس ہوں یا ہمہ جہت صاحبِ بصیرت اور اہلِ خرد انسان دوست، سبھی اپنا اپنا اہم سے اہم رول اپنے طور نبھاتے رہتے ہیں اور یوں انسانی تہذیب کے فروغ و بقاء کا سامان فراہم ہوتا رہتا ہے اور کبھی کبھار یہی سب کچھ جانے انجانے میں بھی ہوتا ہے۔ بقولِ فیض احمد فیض ؂

ہم پر ورشِ لوح و قلم کرتے رہینگے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہینگے

زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، مُسلسل دریافتگی، جستجو، عمل و اجتہاد ہی یہاں کا بنیادی دستور العمل ہے جس سے اگر تھوڑا سا انحراف سرزد ہو تو دِل لُبھانے والی طلسماتی زندگی کا سارا کھیل بگڑ جائیگا۔ اس لئے یہ ناتمام سفر سود و زیاں کے تاجرانہ تصوّر کئے بنا ہی جاری رکھنا پڑتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اس لئے کیا خوب فرما گئے ہیں ؂

مِٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گُل و گلزار ہوتا ہے

اور یہ بھی کہ ؂

☆55 سپکاپ روڈ بجبہاڑہ۔ کشمیر

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مَردوں کی شمشیریں

کچھ بھی ہو برطانوی سامراج ہندوستان میں ایک تاجر کی حیثیت غیر منقسم بھارت میں وارد اور ایک مشاق وسیاسی شاطر کے روپ میں اِس پر قابض ہو کر یہاں کے قضا وقدر کا مالک بنا۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ وسطِ ایشیاء کی تہذیب وثقافت ' اَدب وشاعری، لسانیات اور لوک ورثہ پر سب سے زیادہ تحقیقی کام یورپی مستشرقین ہی نے کیا ہے جسکے اَمِٹ نقوش ہمارے لاکھ مٹانے سے نہیں مٹ سکتے۔ انگریز نوآبادکاروں کی حیثیت سے جہاں بھی گئے انہوں نے وہاں کی جغرافیہ، تاریخ، لوگوں کے رہن سہن، عقائد، سماجی وسیاسی زندگی اور دیگر انسانی علوم وفنون کا بغور مطالعہ کیا ہے کہ وہ اپنی فرمانروائی کو مضبوطی سے قائم رکھ سکیں۔

ولیم مور کرافٹ (William Moorcroft) عزمِ صمیم کا مالک وہ پہلا یورپ نژاد معالجِ حیوانات ہے جس نے ۱۸۱۹ء میں رختِ سفر باندھ کر ۱۸۲۵ء تک لداخ، کشمیر، پشاور، کابل اور بخارا کا دورہ کیا۔ اس سے پہلے وہ ہمالیہ کی حدود کو پار کر کے بھارت کے دو اہم دریاؤں ستلج اور سندھ کے ہمالیائی اور دھار مک ماخذوں' راون اور مانسا (مانسروور) تک بھی پہنچا۔ اُسکا کھینچا اور تیار کیا ہوا خاکہ ایشیاٹک سوسائیٹی کلکتہ (کولکتا) کے حُسنِ اہتمام سے ۱۸۴۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُس نے شاہ توس (پشمینہ) لداخ سے کشمیر، کشمیر سے بھارت اور پھر بھارت سے برطانیہ کو برآمد کرنے کی تدابیر نکالیں۔

ولیم مور کرافٹ کے سفرِ سیاحت کا بنیادی مقصد ترکستان میں داخل ہو کر وہاں سے اُچھے (تازی) نسل کے گھوڑوں کا حصول تھا تاکہ بھارت لاکر اُنکی افزائشِ نسل کو شاہی اِصطبل کی خاطر بڑھاوا دیا جاسکے۔ وہ اِتنا مشکل اور کھٹنائیوں سے بھرپور سفر اختیار کرنے کا اِرادہ ایک بار ترک کرنے پر مجبور تو ہوا تھا لیکن مہم جوئی کو خیر باد نہیں کہا۔ اُس دہلی کے ایک عزیز اور ذہین دوست کو اپنے خرچے پر اس کام پہ روانہ کر دیا۔ اُس کا نام میر عزت اللہ تھا، وہ ۱۸۱۲ء کشمیر کیلئے دہلی سے روانہ ہوا جہاں سے وہ لیہہ لداخ پہنچ

گیا۔ لداخ سے وہ یارقند، کاشغر، سمرقند، بخارا سے ہوتے ہوئے بلخ اور بامیان کے راستے کابل اور پھر بھارت (ہندوستان) پہنچا۔ میر عزت اللہ نے اپنے سفر نامے کا حال فارسی زبان میں قلم بند کیا۔ مور کرافٹ اور جارج ٹربیک سے (Moorcroft and Trebeck) کے زیرِ نظر سفر ناموں کے مؤلف ڈاکٹر ہوریس ہے مین ولسن (Horace Hayman wilson) کے کہنے کے مطابق اُس نے اسکا انگریزی ترجمہ ۱۸۲۵ء کلکتہ سے چھاپا جس کے بعد اس کو فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں منتقل کیا گیا۔[۱] ہوریس رقمطراز ہے کہ یہ سفر نامہ اگر چہ اُجمالاً لکھا گیا ہے لیکن میر عزت اللہ کی ذہانت اور ذکاوت کا غماز ضرور ہے۔ مور کرافٹ اور ٹربیک دونوں اپنے سفر ناموں کو جیتے جی چھپتا نہ دیکھ سکے۔ اس لئے اُن کی وفات کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ممبر رائیل ایشیاٹک سوسائٹی پیرس، میونخ، ماسکو، برلن اور کلکتہ کی اِدارت اور مساعیٔ جمیلہ یہ سفر نامے ۱۸۳۷ء میں اشاعت پذیر ہوئے اور ساگر پبلیکیشنز نئی دہلی کے اہتمام سے ۱۹۷۱ء میں دوسری بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ ناچیز کی یہ کوشش انہی سفر ناموں کی مرہونِ منت ہے۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیئے کہ مور کرافٹ لازمی تعلیم و تربیت کی تکمیل پر انسانی معالج و جراح کا منصب سنبھالنے والا ہی تھا کہ حالات اُسے ویٹرنری سرجن بنا دیا۔ وہ لنکا شایر (Lancashire) کا باشندہ تھا اور لِور پُول (Liverpool) میں جراحی کی تربیت مکمل کر چکا تھا کہ اُنہی دنوں (سینگ والے) چوپائیوں (گائے بیل وغیرہ) میں ایک بھیانک بیماری پھیلی۔ اپنے ہم پیشہ اساتذہ کرام کی ہدایت پر مور کرافٹ کو وہاں جانا پڑا جسکے بعد وہ اسی پیشہ کا ہو لیا۔ چونکہ ویٹرنری سرجن ایک اچھے سماجی مرتبہ کا نہیں مانا جاتا تھا جس کے پیشِ نظر مور کرافٹ کے ذی عزت اساتذہ خاص کر جان ہنٹر (John Hunter) نے اُسے مشورہ دیا کہ ایک پیشہ ور وٹرنری سرجن بننے کیلئے وہ لازمی تربیت حاصل کرے۔[۲]

---

[۱] Calcutta Quarterly map and review Vol 111And Iv: 1825
[۲] Magasin Asiatique. Juillet : 1826: Ritter,s Geography of Asia-11

ابھی اُن دِنوں لندن میں وٹرنری سرجن تربیتی ادارہ موجود ہی نہیں تھا اسلئے اُسے اسکی خاص تربیت کیلئے فرانس جانا پڑا۔ کچھ ہی مدت کے بعد واپسی پر اُس نے کسی اور رفیقِ کار کے ساتھ ملکر لندن میں رہ کر وٹرنری سرجن کی حیثیت سے ساکھ بھی کمائی اور خاصی دولت بھی۔ ایک نرم مزاج انسان کے طور بھی اُسے کئی بار لوگوں کی بدمزاجی کا سامنا کرنا پڑا جسکے نتیجے میں اِس پیشہ سے بھی اُسکا جی بھر گیا۔ اس سے پہلے کمائی ہوئی خاصی دولت اُس نے گھوڑوں کیلئے لوہے کے نعل بنانے کی تجارت میں اُڑائی۔ یہ کاروبار بدنظمی کا شکار ہوا اسلئے اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) کی پیش کش قبول کی اور وہ مئی ۱۸۱۸ء کو فوجی اصطبل کے سپرانٹنڈنٹ کی حیثیت سے (Superintendent of Military stud) بحری بیڑے کے ساتھ شامل ہوا جو بھارت آنے والا تھا۔ ہوریس ہے مین وِلسن جو اُسی بحری بیڑے کے ساتھ سمندری سفر کر رہا تھا لکھتا ہے کہ اُس کے ساتھ کبھی کبھی بات کرتے کرتے یہ گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ اُسی کو اُسکا سوانح نگار بننا پڑیگا۔ مور کرافٹ نے تاجِ برطانیہ کے اصطبل میں سائنسی طور طریقہ سے سودیشی گھوڑوں کے نسل میں کافی سُدھار لایا۔ سرکار گھوڑ سوار فوج کیلئے عرب گھوڑوں پر تُرکی اور انگریزی نسل کے گھوڑوں کو ترجیح دیتی تھی لیکن مور کرافٹ کی نظریں بلخ و بخارا پر جمی تھیں جہاں سے وہ خود جا کر بہتر نسل کے نر گھوڑوں کو ہندوستان درآمد کرنا چاہتے تھے۔ یہی بنیادی مقصد تھا جسکے بظاہر حصول کیلئے وہ دوسری بار ہمالیائی خطے کی سیاحت پر چل نکلا۔ یہی مہم جوئی اُس کے پیشہ ورانہ منصوبوں اور خود اُسکی زندگی کیلئے فیصلہ کُن اور مہلک ثابت ہوئی۔ مور کرافٹ نے اس پیشہ ورانہ مہم میں تجارتی عُنصر شامل کر کے اپنی مشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔ انہی غیر ضروری اور غیر پیشہ ورانہ وفاداریوں کا جان لیوا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے اپنے یورپی ہم سفر جارج ٹربیک (George Trebeck) کی معیت میں ۱۸۱۹ء کے اواخر میں قافلہ کی اگوائی کرتے ہوئے چل نکلا۔ مور کرافٹ جواں سال ہم سفر ٹربیک کی گونا گوں صلاحیتوں کے گُن گاتے ہوئے

لکھتا ہے کہ وہ تیز فہم، ذہین، ہر حال میں خوش ثابت قدم اور ہر مصیبت کا سامنا خندہ پیشانی سے کرتا تھا۔ جغرافیائی نقشہ سازی، جارج ٹربیک کے ذمہ تو تھا ہی لیکن اُس نے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے بارے میں بھی اپنی گرانقدر آراء قلمبند کی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان یادداشتوں یا خود مورکرافٹ کے سفرنامے کی لکھی تفاصیل سب پر حکومتِ برطانیہ کا ہی حق ہوتا تھا کہ وہ اُسے کس حد تک منظور کرے یا چھاپے یا چھاپنے کی اجازت دے۔ مورکرافٹ کے اختیارات اور اُسکا منصب محدود تھا۔ یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ مورکرافٹ پہلا یورپی ہے جو کشمیر اور لداخ کی سیاحت پر آیا۔ مورکرافٹ سے دو سال پہلے پہلا عیسائی مشنری اندرادا (Andrada) ۱۶۲۴ء میں کشمیر آیا اور پھر لداخ پہنچا۔ اس کے بعد ۱۷۱۵ء میں ڈیسی ڈیری (Desideri) پیر پنچال کے راستے سے وارِدِ کشمیر اور لیہہ لداخ سے ہوتے ہوئے لہاسا (تبت) پہنچا۔ مورکرافٹ کا سفر جوشی مٹھ سے شروع ہو کر پہلے مرحلہ میں سرینگر کشمیر میں پیر پنچال کے راستہ سے انجام کو پہنچا۔ یہاں سے وہ لاہور گیا اور وہاں سے کٹوچ کلو، لاہول سپتی سے گذرتے ہوئے ۱۸۲۰ء کے ستمبر کے مہینہ لیہہ لداخ پہنچا جہاں اُس نے ستمبر ۱۸۲۲ء تک قیام کیا۔ اُسے رنجیت سنگھ کی لاہور میں انگریز نواز فرمانروائی میں تساہل، طوالت اور دہلی کے امیر اعلیٰ کی غیر ضروری آمرانہ روش کی وجہ سے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے اپنے محدود منصب و اختیارات کی پرَوانہ کرتے ہوئے رنجیت سنگھ کو لداخ کے مُکھیا (سردار) کے ساتھ دوستانہ روش سے کام لے کر باجگذاری میں نرمی برتتے جانے کو کہا تا کہ لداخ کا سلطنتِ برطانیہ میں شامل ہونے کا راستہ ہموار ہو سکے۔

مورکرافٹ اور اُس کا قافلہ تقریباً دس ماہ تک سرینگر کشمیر میں رُکا اور پھر یہاں سے بُخارا چل پڑا۔ ترکستان سے روانہ ہوتے ہوئے اُس کی خواہش تھی کہ وہ فوجی اصطبل کے لئے اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی ساتھ لے جائے۔ اللہ کو ایسا منظور نہیں تھا، وہ بیمار ہوا اور اپنے نخلِ مراد کو پائے بنا ہی موت کی آغوش میں چلا۔ میمنا اُس جگہ کا نام ہے

جہاں اُس نے آخری سانس لی۔ بلخ میں دفن ہے۔ اُس کا ایک اور ہم سفر کھتری نام کا ہندوستانی اُس کے پہلو میں آسودہ ہے۔

مورکرافٹ کا ایک اور معتبر اور معتمد ساتھی ٹریبک (Trebeck) بھی مزار کے مقام پر اللہ کو پیارا ہوا، وہیں پر دفن ہے۔ قافلے کی اگوائی کرنے والے یہ تینوں صحرانورد اگست ۱۸۲۵ء میں یکے بعد دیگر کابُل پہنچتے پہنچتے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور اُن کا سارا کارواں منزلِ مقصود کو پالینے سے پہلے ہی گھاس کے تنکوں کی مانند بکھر گیا۔ یہی کچھ زندگی کا مزاج ہے۔

میں اس خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کر دی

۔۔ پروین شاکر

حقیقی معنوں میں زندگی کا راز اس بات میں مضمر نہیں کہ ایک فرد بشر کتنی لمبی عمر جیا اور جی کر مرا بلکہ اِس اَمر میں پوشیدہ ہے اُس کی حیات صبر آزما، دقّت طلب اور مسلسل تابع منزل آزمائشوں سے عبارت رہی۔ یہاں صرف عقل وخرد کی فرمانروائی نہیں چلتی بلکہ منزل کو جا لینے کا شوقِ بے پایاں ہی کام آتا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

زندگی مسلسل تعمیر وتخریب سے عبارت ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء ایک تغیرِ عہد یا زمانہ کی تکمیل تھی جس کے پیش نظر کارل مارکس کو یہاں تک کہنا پڑا کہ اس تبدیلی سے ہندوستان کی باضابطہ تاریخ کا آغاز ہوا۔ اُسکا یہ قول بحث طلب ہے کہ ہندوستان کی اپنی کوئی تاریخ نہیں۔ سچ بھی تو یہی ہے۔ کہ ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد ہی نئے زمانہ کی برکتوں سے مالا مال ہوا۔ کشمیر کی تہذیب وتمدّن اور اَدب وثقافت پر اُنیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد تحقیق وجستجو کا کام شروع ہوا جب یورپی مشنری یہاں آکر طبّی سہولیات اور علم کے نُور کو عام کرنے کی شروعات کرتے ہیں۔ یہیں سے کشمیر شناسی

اور کشمیری تہذیب شناسی کی ابتداء بھی ہوتی ہے۔

مور کرافٹ کی سیاحت کا سب سے زیادہ فکر انگیز پہلو یہی ہے کہ وہ لداخ، کشمیر، لداخ اور وسط ایشیا کی سیاحت پر صرف چھ سال کی قلیل مدت سے بھی کم رہا وہ بھی برطانیہ کے سرکاری اور فوجی اصطبل کے نگراں کی حیثیت سے۔ وہ رائے بریلی سے اکتوبر ۱۸۱۹ء کے اختتام پر رختِ سفر باندھتا ہے اور اگست ۱۸۲۵ء کو گونا گوں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جانِ آفرین کو اپنی جان سپرد کرتا ہے۔ اسکی تفصیل اسی مضمون کے تمہیدی اور سوانحی حصے میں آچکی ہے۔

مور کرافٹ اُن اولین یورپی باشندوں میں سے ایک ہے جو تاجِ برطانیہ کیلئے مفوضہ منصبی ذمہ داریاں نبھانے کیلئے بھارت آکر اپنی فطری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ راجہ رنجیت سنگھ کا لاہور سے راج چلتا تھا اور دیوان موتی رام کشمیر کا صوبیدار تھا۔ کشمیری عوام گونا گوں عائد ٹیکسوں کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ ان سے حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ عام انسان کی کمائی، پیسہ جو بھی تھا مختلف اور اَن گنت ٹیکسوں کی نذر ہو ہی جاتا تھا۔ یہاں تک ایک طوائف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ اس سے زیادہ بداخلاقی، بے رحمی، ظلم واستبداد اور طوائف الملوکی کی نظیر اور کیا ہوسکتی ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب شہر سرینگر کی تاریخی یادگار جامع مسجد کے دَرواز سے عباداتِ الٰہی کیلئے بند تھے اور ان پر ظلم و بربریت کے تالے چڑھائے گئے تھے۔ بیگار، بے کاری، مفلسی، لاچاری، بے بسی اور جہالت نے کشمیریوں کو دبوچ لیا تھا۔ مور کرافٹ نے اسبات کا ذکر بھی اپنی سفری دستاویزات میں کیا ہے کہ ماہِ ستمبر کے اختتام کے ساتھ ہی لوگ گرم علاقوں کو ہجرت کرتے تھے تاکہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے عیال کا پیٹ پال سکیں۔ پیر پنچال کے دشوار گذار راستے کو پار کرتے ہوئے بہت سے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھوتے تھے۔ مور کرافٹ لکھتا ہے کہ اس نے اِس راستے سے گذرتے ہوئے ۴۵ کشمیری مزدوروں کی لاشیں خود دیکھی ہیں جن کا کوئی پُرسان نہیں تھا۔ ان وارداتوں کے پیچھے دو اہم وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ کھانے

کو بہت کم ملتا تھا۔ دوم یہ کہ تن ڈھانپنے اور ٹھٹھرتی سردیوں سے بچنے کیلئے اُنکے پاس کچھ پہناوا بھی نہیں ہوتا تھا۔ روزگار کیلئے جبری ہجرت کی اجازت بھی جب ہی دی جاتی جب اس جان لیوا سفر پر جانے والا کشمیری مزدور اربابِ اقتدار سے یہ سند ساتھ رکھتا کہ اُس نے سبھی جبری ٹیکس ادا کئے ہیں اور یہ کہ اُس کے ذمہ ریاستی سرکار کی کوئی بھی مفروضہ رقم واجب الادا نہیں۔ آج بھی کنڈی علاقوں کے مرد لوگ ہر سال اکتوبر مہینہ کے آخر کے ساتھ بھارت کے گرم میدانی علاقوں کا رُخ کرتے ہیں تاکہ ہر برس ماہِ اپریل تک فصلِ بہار آنے تک سردی سے بچ جائیں اور اپنے بال بچوں کا بھی پیٹ پال سکیں۔ فوق نے شاید اس لئے کہا ہے۔

خاکِ پاکِ خطۂ کشمیر ہے جنت مگر
قہر و دوزخ کا نمونہ ہے وہاں بیگار بھی

اور علامہ اقبال بھی برمحل کہہ چکے ہیں۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارسے

مورکرافٹ دوسرے یورپی سیاحوں اور حکومتِ برطانیہ کے وفادار و تابعدار ارکان کی طرح شاعری نہیں کرتا بلکہ نئے ماحول، یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، جانوروں، پرندوں، سبزیوں، پھلوں، مرغزاروں، درّوں، آنے جانے کے راستوں، لوگوں کے رہن سہن کو دیکھ کر حیرت پیکر نہیں ہو جاتا بلکہ ان سب کے ساتھ ایک ہو کر باریک سے باریک تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے۔ جیسے وہ وہیں کا (یا یہیں کا) جنما باشندہ ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کام مورکرافٹ کے قافلہ کے ساتھ شامل میر عزت اللہ جیسے معتبر و معتمد رفیق کی مدد کے بناء ممکن نہیں تھا، جو نہ صرف اُسکی مادری زبان یا علمی زبان جانتا ہو بلکہ یہاں (یا وہاں) کے اصلی اکثریتی یا ایک قبیلہ کی صورت میں اقلیتی زبان سے بھی پوری جانکاری رکھتا ہو۔ وبتھ (بہت یا وتستا) جو کشمیری تہذیب اور کشمیریوں کے شناخت کا درجہ رکھتی ہے کا ذکر کرتے ہوئے وہ چُوکتا نہیں۔

وبتھ کے دائیں بائیں کناروں پر آباد پرگنوں اور دیہات کے نام بھی یونہی انداز آ دِیئے گئے ہیں۔ اسی طرح کونسر ناگ کو بھی وبتھ کے ماخذوں کے کھاتے میں ڈالدیا گیا۔ یہ نہایت خوبصورت چشمہ پرگنہ شوپیان کے دہنو کنڈی مرگ کے پہاڑوں کی کوکھ سے نکلتا ہے اور دریائے ویشو کا منبع ہے۔ اسے (یعنی چشمہ کو) ویشنہ پاد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ دریائے ویشو کے ساتھ نیا ین کے قریب رمبی آرہ بھی جاملتا ہے۔ ایک ہو کر دونوں بجبہاڑہ سے سرینگر جاتے ہوئے پانچ کلومیٹر کی دوری پر سنگم کے مقام وبتھ سے ملتے ہیں۔ مورکرافٹ نے ویشو کا ذکر کیا ہے نہ سنگم کا۔ ایسی کوتاہیوں کا در آنا ایک فطری امر ہے، بالخصوص جب کشمیری زبان اُسکی مادری زبان تھی ہی نہیں۔ شاید فارسی زبان سے بھی وہ واقف نہیں تھا۔ نتیجتاً اُسے اپنے ترجمان (Interpreter) پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے یہاں کے موسم چار ہیں: موسمِ بہار، موسمِ گرما، موسمِ خزاں اور پھر موسمِ سرما۔ جبکہ مورکرافٹ مغالطے میں پڑکر یہاں کے فصلی سال کو صرف دو موسموں میں بانٹا ہے۔ سردی اور گرمی (Winter and Summer)۔ سرینگر کشمیر سے شمال مشرق، لداخ لہاسہ، (تبت) اور نتھولا (سکمِ)، لہاسہ (تبت) سے وسط ایشیا کو جانے والی شاہرائے ابریشم (Silk-Roads) اور شوپین، سہرپور (ہیرپورہ) تھنہ منڈی سے کھیوڑا (پاکستان) جانے والی شاہراہِ نمک کا ذکر بھی مورکرافٹ سے رہ گیا ہے۔

وہ بنیادی طور ایک انسانی معالج کے طور تربیّت یافتہ تھا، حالات نے اُسے وٹرنری سرجن بنادیا لیکن وہ لداخ میں بھی انسان دوستی کے جذبہ کے تحت نادار، لاچار اور بیمار لوگوں کا علاج کرتا رہا اور وہ بھی اُسے محبت و انسانیت کے جذبہ سے سرشار اگر نقد سے نہیں جنس سے اپنائیت کا اظہار کرتے رہے۔ مورکرافٹ کا سرینگر میں زیادہ تر قیام باغِ علی مردان خان میں رہا۔ اُس کا کہنا ہے کہ ایک بار میرے پاس تقریباً سات ہزار مریضوں کے نام علاج و معالجہ کیلئے درج کرائے گئے جو بہت ہی بھیانک بیماریوں میں مُبتلا تھے جن کے پیچھے فاقہ کشی، اچھی غذا کی کمی، انہتائی گندگی، تنگ

وتاریک مکانات اور اخلاقی بے راہ روی کارفرما تھی۔ حفیظؔ جالندھری نے اپنی نظموں میں ان باتوں کی طرف یوں صریح اشارے کئے ہیں۔

زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کیلئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کیلئے
اس گروہِ عام کا ہے ذوق کتنا بے بساط
یہ شکم کی پرورش یا اختلاطِ مرد و زن
جسکی محنت سے چمن میں روئے گُل پر خندہ ہے
اُسکا گھر تاریک، اُسکا اپنا منظر گندہ ہے
نقش ضاعی کا جسکے لوحِ دِل پر کندہ ہے
اُسکی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اُس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وہ کشمیری شعر و اَدب کی کسی بھی قسم کی موجودگی کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم کو یہاں کی یعنی کشمیر کی کلہن کی لکھی منظوم سنسکرت تاریخ، کشمیری اساطیر کی تاریخ نیل مت پوران اور برہت کتھاسب بوج پتر پر (Birch Bark) لکھے مسوّدات (مخطوطات) بہ نفسِ نفیس خود دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان مخطوطات کے مالک کسی بھی طرح اس گرانقدر ورثہ کو کسی بھی قیمت پر ہمیں مرحمت فرمانے کیلئے راضی نہ ہوئے۔ میں نے راج ترنگنی اور برہت کتھا دونوں کی ایک ایک کاپی تیار کروائی۔ نیل مت پوران کی ایک کاپی خریدی گئی۔ مورکرافٹ اور ٹربیک کے سفر ناموں کے مرتّب ہوریس ہیمین ولسن (Horace Hayman Wilson) کا کہنا ہے کہ راج ترنگنی کا سنسکرت مخطوطہ ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال کے خزینہ کی زینت ہے جبکہ برہت کتھا کبھی حاصل ہی نہیں ہوئی۔ نیل مت پُوران کی کاپی میرے پاس ہے لیکن مجھے اس کے مستند ہونے

میں تامُل ہے۔ راج ترنگنی کلکتہ (کولکتا) میں چھاپی گئ ہے اور کیپٹن ٹرویر (Captain Troyer) کا تیار کیا ہوا ترجمہ پیرس فرانس سے چھپنے والا ہے۔ بروک ہاوس (MR.Brockhaus) کا جزوی یا مکمل جرمنی زبان میں کیا ہوا ترجمہ بھی چھپ رہا ہے ان سفرناموں کے ساتھ کسی بھی قسم کا انڈکس نہیں دیا گیا ہے۔

مورکرافٹ کشمیری شالبافی، سوزن کاری، پیپر ماشی بندوق یا محدود اسلحہ سازی ودیگر دستکاریوں کے حوالہ سے کشمیریوں کی تردستی اور تردماغی کے بڑے گُن گاتا ہے یہاں تک کہ کشمیری شالبافی کی صنعت کو اُپنی فنّی باریکیوں کے ساتھ برطانیہ منتقل کرنے اور وہاں رائج کرنے میں اُسکا کلیدی رول رہا ہے۔ کشمیری بندوق سازی کے تمامتر مراحل کی جانکاری بھی اُسی کے ہاتھوں لندن پہنچی۔ مورکرافٹ کا کوئی بھی سیاسی یا سفارتی رُتبہ نہیں تھا وہ اُپنے اور پرائے آقاوں کے ہاتھوں اَن گنت حوصلہ شکن اور صبر آزما مصائب کا شکار رہا لیکن اُس نے ایک سچے محبّ وطن کے ذوق تجسّس میں کوئی بھی کمی آنے نہیں دی۔ وہ ہر حال میں ثابت قدم رہا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ ثابت قدمی ہی کامیاب زندگی کی دلیل ہے۔

اس مختصر سے مقالہ میں مورکرافٹ کی ساری سیاست کا تفصیلی تنقیدی جائزہ لینا اور باریک بینی سے مطالعہ کرنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اُس نے لداخ ہی میں زیادہ قیام کیا، جو اِس سرسری جائزے کے حدود سے باہر ہی تصوّر کیا جانا چاہیے۔

انسانی کردار میں خود غرضی، توہم پرستی، جہالت، بددیانتی، فریب کاری، جعلسازی، شکم پروری وتن آسانی، گداگری و ذہنی ناداری، غلامی اور ناعاقبت اندیشی کے پیچھے سیاسی، سماجی، اقتصادی وتواریخی، جغرافیائی ودیگر عوامل کی عدم موافقت کارفرمائی سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ مورکرافٹ کے کہنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ کشمیریوں کی بشری کوتاہیوں کیلئے اُسکے فطری مزاج کو نہیں بلکہ اُن ناموافق سیاسی حالات کو ذمہ دار گردانا جاسکتا ہے جس سے انہیں صدیوں کے دوران گزرنا پڑا۔ اسکے وجود کی کایا کلپ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ شرط یہ ہے کہ اُسے لارنس صاحب کے کہنے کے مطابق ایک منصفانہ اور ذمہ دار نظامِ حکومت میسّر ہو۔

**

منظور فاضلی☆
(مترجم: ظفرؔ مظفر)

کشمیر...... ہیوگل کی نظر میں

جرمن نژاد، بیرن سی ہیوگلؔ فطرت کا ایک سچّا مشاہد تھا جس نے عام لوگوں کے ذہنوں میں اُبھرنے والے اُس اہم سوال پر وضاحت سے روشنی ڈالنے کی غرض سے کشمیر اور کشمیریوں کا احوال بیان کیا کہ اُنیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں کشمیر اور کشمیریوں کا حال کیسا تھا۔ بیرونی سیّاح اگرچہ عام طور پر فطری مناظر بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، پھر بھی کشمیر کے لوگوں کے کردار کا اُس کا تجزیہ نہ مُتعصّبانہ اور نہ ہی طرفدارانہ ہے، اگرچہ کچھ لوگ بے شک کشمیریوں کے کردار کے بارے میں نہایت سخت ہیں۔

جب ہیوگلؔ واردِ کشمیر ہوا تو اپنے قیام کے ابتدائی ایّام میں ہی اُس نے محلوں کے کھنڈارت، پُرانے خستہ حال مکانات، ناپاکی سے بھری گلیاں اور اِن سب چیزوں سے جُڑے لوگوں کو دیکھا۔ اُس نے مچھلیاں پکڑنے والی بوڑھی عورتوں سے بھری ایک بڑی سی کشتی دیکھی جنہوں نے اُسے اپنی بے ہنگم آوازوں سے حواس باختہ کیا، جب وہ اپنے گیتوں سے اُس کا اِستقبال کرنیکی کوشش کر رہی تھیں۔ یُوں کشمیر میں اپنے قیام کے پہلے ہی روز اُسے غلط تاثر ملا۔ اُس نے سوچا کہ کشمیر کا فطری حُسن یہاں کی آبادی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ جو اُس وقت پسماندگی کا شکار تھا، بعد میں وہ آس پاس کے شاندار پہاڑی مناظر کے سامنے انسانی اعمال سے اپنی بدذِلی کا اعتراف کرتا ہے۔ کشمیر کے فطری حُسن کے بارے میں اُس کے اعتراف عیاں ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

☆ اُونہ گام، بانڈی پور۔ کشمیر

''اوپر کے شاندار پہاڑی مناظر اپنی برفیلی سفیدی والی ہزار چوٹیوں، حسین و جمیل خاکوں اور تمام رعنائیوں کے ساتھ خاموش حُسنِ ترتیب، پہاڑی وادی کو مُتعصف کرتے نظر آتے ہیں۔

کیا میں خدا کا کافی شکر گزار ہوں جسکے فضل سے میں اِس جگہ پہنچا ہوں؟ کتنا اچھا موقعہ ملا ہے مجھے شکر گزاری اور سنجیدہ غور و فکر کا! لو میں یہاں ہوں' اُس خطّۂ ارض میں 'جو رُوئے زمین کا حسین ترین مقام مانا جاتا' ہے، بلکہ اکثر لوگ اسے جنّتِ ارضی سمجھتے ہیں'۔

بیرن ہیوگلؔ کے دورے کے دوران، جی ٹی وینؔی بھی اتفاق سے کشمیر میں تھے۔ دونوں' گورنر مہاؔن سنگھ سے ملے تھے۔ جو ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۱ء تک سکھ دَورِ حکومت کے تحت کشمیر کے گورنر رہے۔ گورنر کے کِردار پر رائے زنی کرتے ہوئے بیرن ہیوگل لکھتا ہے کہ وہ نیک اور رحم دل تھا۔ رنجیت سنگھ کے یہ پوچھے جانے پر کہ کیا غریبوں میں تقسیم کرنے کیلئے دی گئی رقم کا گورنر کے ہاتھوں خُرد بُرد ہوتا ہے؟ ہیوگلؔ نے جواب دیا کہ اُس کی رائے میں نہیں۔

ڈل جھیل کے اُپنے دورے کے دوران، ہیوگلؔ واضح کرتا ہے کہ پتھروں کے اُستر والا ایک نالہ جھیل کو دریائے جہلم کے ساتھ مِلاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اُس وقت اس بڑے سے دریا کے بیچوں بیچ پتھروں سے بنی ایک سڑک شالیمار تک جاتی تھی۔ وہ اِسے یہ کہہ کر ایک اہم نشان تصوّر کرتا ہے کہ جس لمحے یہ زیرِ آب آجاتا ہے تو اُسی وقت یہ شہر کے باشندوں کیلئے خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ دریائے کے سِرے پر بنا فلڈ گیٹ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ سیلاب کی صورت میں یہ خود بخود بند ہوتا تھا۔ یہ گیٹ اُس کے اندازے کے مطابق باغِ دِلاور خان سے' جہاں وہ قیام پذیر تھا دو تین میل کی دوری پر تختِ سلیمان کے دامن میں تھا۔ وہ جھیل، اسکے گرد و نواح جس میں باغات اور بہتے باغات بھی آتے ہیں، کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے۔

مہان سنگھ کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہاں کوئی قابلِ غور شخص

تھا ہی نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ملک اتنا محکوم تھا کہ شالوں کا کاروبار کرنے والے چند اُفراد کو چھوڑ کر باقی عام لوگوں کا حال بھی بِھکاریوں سے بہتر نہیں تھا۔ اُس نے دریائے جہلم پر بنے سرینگر کے سات پُلوں کا معائینہ کرنے کی غرض سے ایک دن گزارا اور اُن سب کو خطرناک پایا۔ پُلوں میں استعمال شُدہ مواد کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ نہایت اَدانے درجے کا ہے۔ ان پُلوں کی کمزور حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ کوئی طوفان یا تیز آندھی بھی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اس قسم کی آفاتِ وادی کشمیر میں کبھی نہیں آتیں۔ ہیوگل سرینگر میں واقع زیارتِ شاہ ہمدان، نئی مسجد، بڈشاہ کے مقبرے، ہاری پربت اور درگاہ حضرت بل بھی گیا ہے جس سے اُس کی مہم جوئی کا عندیہ ملتا ہے۔ وہ شہنشاہ اکبر کی تعریفیں کرتا ہے جس نے مضبوط فصیلوں اور میناروں والا ناگرنگر کا شہر بسایا اگرچہ اُس کی آمد کے وقت یہ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اسے ایک ویران شہر کا نام دیتا ہے۔

وادی کی سِکھ محافظ فوج کے بارے میں بھی وہ کچھ تفصیلات فراہم کرتا ہے جو پیادہ فوجیوں کے دو دُستوں یا قریباً چودہ سو آدمیوں پر مشتمل تھی۔ لشکر کے اوزار کے بارے میں ہیوگل لکھتا ہے کہ یہ دو دَستے تمام مقاصد کے لئے کافی تھے۔ اُس کے مطابق کشمیری سب سے زیادہ غیر جارحانہ اور حلیم تھے۔ شمال سے مشرق تک کسی حملے کا کوئی اَندیشہ نہیں تھا وہ لکھتا ہے۔

> ''علاوہ ازیں، کشمیر اپنی ساری دلکشی اور حُسن و جمال کھو چکا ہے
> تاہم یہ صوبہ اَب بھی اپنی قدر و قیمت پا کر اہمیت حاصل کر سکتا ہے
> یہاں کا سارا مال و متاع ختم ہو گیا ہے اور وہ حملہ آور جِن کا حوالہ دیا گیا
> ہے، وہ نئی زرخیز سرحدوں کے بجائے دُھن دولت کو کھوجتے ہیں۔''

سرینگر میں گورنر کی اجازت سے اپنے قیام کے بعد بیرن ہیوگل نے اسلام آباد (اننت ناگ) کا رُخ کیا اور راستے میں پاندرتھن کے آس پاس کے علاقے میں اُس کے مطابق 70^{0} فارن ہائٹ کے درجہ حرات پر سب سے زیادہ گرمی تھی

اور اُسے لگا کہ کشمیر کا ہر کوئی مینڈک ۔ اِسی جگہ پہنچ چکا ہے ۔ اس جگہ سچ مچ مینڈکوں کا جمِ غفیر تھا ۔ وہ پانپور میں اُگائے جانے والے زعفران کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا ہے اور کشمیر کی قدیم راجدھانی اَونتی پورہ کے بارے میں لکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں اُسے اُن دو بودھ مندروں کی حالت دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی جو اَونتی پور کے کھنڈرات میں سے سب سے زیادہ دلچسپی کے حامل تھے ۔ کھنڈرات کے بیچ میں اُسے ایک لومڑی نظر آئی ، جس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اُس کا گھوڑا اُسے اُوپر پہاڑی پر لے گیا ۔ وہ ایک چھوٹے سے قطعۂ اراضی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا جسے کافی محنت کے بعد ہموار کر کے قابلِ پیداوار بنایا گیا تھا ۔ بہرحال ، اس قدیم دارالحکومت کو دیکھنے کے شوق کے باوجود اُسے پرانی عظمت کے کوئی آثار نہیں ملے ۔

اونتی ورمن کے شہر کے حوالے سے بیرن ہیوگل کا حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ یہ شہر ایک راجہ نے بنوایا تھا جو اُس وقت لوگوں میں وین کے نام سے مشہور تھا اور شہر کا نام وینی پور ۔ وہ بہت سے مقامی گیتوں اور قصے کہانیوں کا ہیرو تھا اور فطرتاً شریف النفس اور ایک فیض رساں بادشاہ تھا ۔ اس بادشاہ کے بارے میں بیرن ہیوگل بیان کردہ ایک روایت کے مطابق ، راج ترنگنی میں اُس کے نام کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ۔ ہیوگل پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے ایک خط کا ذکر کرتا ہے جو اُنہوں نے بادشاہ وین کو اسلام قبول کرنے کی دعوت کے طور پر لکھا تھا ۔ اس خط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چوتھی صدی ہجری میں وصول کیا گیا لیکن اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ طویل مُدت تک اسے کہاں چُھپایا گیا تھا ۔

ہیوگل لکھتا ہے :

> کہا جاتا ہے کہ شیوا کا سچا پجاری راجہ وین تبدیلیٔ مذہب کی اس درخواست پر اتنا برہم ہو گیا کہ وہ گگری بل جھیل پر واقع گپکار کی یاترا پر چلا گیا اور ....

اسلام آباد جاتے ہوئے بیرن ہیوگل نے ایک چور کو چرائی گئی اشیاء کے مالک

کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ ہیوگل کے پاس یہ معاملہ لائے جانے سے قبل سکھ سپاہی اُس راستے سے گزرے۔ سپاہیوں کو دیکھ کر چور اور مالک ایک دم دوست بن گئے اور آپس میں بغل گیر ہو گئے۔ اس سے دشمن کے خلاف کشمیریوں کے بھائی چارے کا احساس نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''ایک کشمیری اپنے سکھ مالکوں کی طرف سے دادرسی کے مقابلے میں کچھ بھی جھیلنے کو تیار ہوگا۔'' راستے میں اندھیری رات کے جوکھم اور مُستعد آدمیوں کی فروتنی وغیرہ کے بعد وہ بجبہاڑہ پہنچ گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کی خاص اہمیت کے لحاظ سے اگلے نمبر پر مانا جانے والا یہ قصبہ قدیم ترین دارالحکومت ہے جہاں ایک مشہور مندر بھی تھا جس کا نام بقول اُسکے ودھیا وہار (دانائی کا مندر) تھا۔ تاہم اس جگہ اُسے اِس قدیم ترین دارالخلافے کے کوئی آثار نہیں ملے۔ یہاں وہ اورنگ زیب کے بھائی دارا شکوہ کے تعمیر کردہ باغ کی بھی سیر کرتا ہے، جسے وہ بدبخت کہتا ہے۔ بجبہاڑہ سے وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اسلام آباد نام کے اُس کے ایک زرخیز میدان میں پہنچ جاتا ہے۔

بیرن ہیوگل اہم واقعات کی طرف قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ بدرالدین کے مطابق اننت ناگ کشمیر کے دوسرے بادشاہ جسے وہ کاساگھم کا نام دیتا ہے، نے ۳۲۰۰ ق م میں بسایا تھا۔ یوُں یہ شہر طوفانِ نوح کے قبل کے زمانے کا ہے۔ اُسکے مطابق کشمیری بزرگ پرست ہیں اور اسکے ثبوت میں وہ کئی کہانیاں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

> ''لگ بھگ چودہ سو سال قبل مسیح میں اشوک نے اپنی راجدھانی سرینگر کو تعمیر کیا۔ اشوک کے بعد کے بارھویں راجہ نر ایک روز رسم کے مطابق نہانے کے غرض سے وتست (جہلم) جارہا تھا کہ اُسے کچھ بھوکے برہمن مل گئے جنہوں نے اُس سے کھانا مانگا۔ نر نے نہانے کے بعد کھانا دینے کا دعویٰ کیا۔ وقت کی کمی کے باعث اپنی بھوک مٹانے

کی خاطر انہوں نے راجہ سے کہا کہ وہ وتست کو اُس کے قریب لائیں گے۔ چنانچہ دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا راجہ کے سامنے آ گیا لیکن یہ کرشمہ دیکھ کر راجہ مُتاثر نہ ہوا۔ برہمنوں نے اُسے شراپ دیا۔ شیوا نے اُسے فوراً ایک سانپ میں تبدیل کر دیا جو اَب بھی کشمیر میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اُس جگہ چٹان سے اب بھی ایک چشمہ جاری ہے، جو سب کو پوتر برہمنوں کی مانگیں پوری کرنے کی ترغیب ہے۔ چٹان کے کھوکھلے حصّے کے اوپر بعد میں ایک مندر بنایا گیا۔ اس چشمے کی مچھلیاں مُقدس مانی جاتی ہیں۔"

اسلام آباد کی روح کا جائزہ لینے کے بعد ہیوگل مٹن گیا، جہاں برہمن آباد تھے۔ اسکے نزدیک بھیک مانگنے کی بدعت سب سے زیادہ مندروں کے احاطوں میں دیکھی جاتی ہے۔ مندروں کے گردونواح میں ایسے لوگوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"خیرات مانگنے کا جو طریقہ یہاں اپنایا جاتا ہے وہ کبھی کبھی مایوسی اور پریشانی کے اُس درجے کو ظاہر کرتا ہے جو بھکاریوں کو دیا جانا چاہئے، کم از کم موجودہ معاملے میں میں نے اُس آدمی کو، جو ہو سکتا ہے مُستحق ہو، ایک روپے دے دیا۔ مگر اُس نے بُرا بھلا کہہ کر اس نذرانے کو لینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اُسے پچاس چاہئیں۔"

ہیوگل مٹن کے مندر اور آس پاس کی گپھاؤں سارا حال تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اپنے گائیڈ نے اُسے ان گپھاؤں، سرنگوں اور گھاٹیوں میں جانے سے منع کیا تھا جہاں انسان کبھی گئے نہیں تھے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے یہاں جن نام کی کوئی بدرُوح رہتی ہو۔ گائیڈ کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ گپھاؤں اور سُرنگوں میں داخل ہو گیا اور پہلی ہی غار میں اُس نے ایک ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۲ فٹ اُونچا کمرہ دیکھا۔ اسکے



گوجر دوشیزہ۔ اپنے روایتی لباس اور زیورات میں



کشمیر کی ایک اہم تہذیبی شناخت۔ گوجر۔ ملبوسات کا منفرد انداز



پاندرتھن کا قدیم شو مندر - کشمیری سنگ تراشی کا نمونہ



فتح کدل سرینگر (۱۹۲۶ء)

ایک یادگار کتبہ:

جون ۱۸۹۱ء میں میجر جنرل ڈی ۔ جے ۔ ایف ۔ نیول نے کشمیر کا دورہ کیا۔ اس دورے میں انہوں نے تسلیل کے قریب ایک درخت پر لٹکا ہوا ایک کتبہ دیکھا

THREE TRAVELLERS

BARON VON HUGEL, FROM JAMMU

JOHN HENDERSON, FROM LADAK

GOREY THES VIGNE, FROM SKARDO

WHO MET IN SRINAGAR ON 18TH NOV. 1835

HAVE CAUSED THE NAMES OF THESE EUROPEANS

WHO HAD PREVIOUSLY VISITED THE VALE OF KASHMIR

TO BE HAVE ON ENGRAVED.

BERNIER, 1663

FORESTER, 1786

MOORCRAFT, GUTHRIE TREBECK 1823

JACQUE, 1831

WALFT, 1832

OF THESE TWO MEN LIVED TO RETURN TO EUROPE.

یادگار کتبہ بہت پہلے تلف ہو چکا ہے۔ کیوں کہ بعد میں لکھی گئی کسی بھی کتاب میں اس کتبے کا ذکر نہیں ملتا۔۔۔

پیچھے اُسے چٹان کے اندر اُسے ایک مندر نظر آیا لیکن اس کا لکڑی کا بنا دروازہ بند تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں داخل ہونے اسکی کوششیں بے کار ہو گئیں۔ بعد میں حکام پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے وہ داخل تو ہو گیا لیکن اِسے بہت کم اہمیت کا حامل پایا۔

مٹن تیرتھ اور اسکے آس پاس کے علاقوں کے اپنے دورے کے بعد بیرن ہیوگل کو شونی بل اور کیرون کے ملحقہ پہاڑوں کو دیکھنے کا موقعہ مل گیا جہاں سے اُس نے میدانی علاقوں کا عمدہ نظارہ کیا۔ وہ عیشمقام کی زیارت گاہ اور پہاڑی کے دامن میں واقع ایک چھوٹے سے بودھ مندر میں بھی گیا۔ اُسکے مطابق کشمیری توہم پرست اور تقدیر پرست ہیں۔

اُپنے اِس سفر کے دوران اُس نے بہت سی ڈراؤنی کہانیوں کے بارے میں سنا لیکن ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ تاہم جب اُس نے پرندوں کی کہ چھ نئی اقسام کو دیکھا تو جوالی سنگھ کو ان پر گولی چلانے کو کہا۔ ایک کشمیری نے انہیں ایسا نہ کرنے کو کہا کیونکہ اُن کے مطابق وہ ایک مقدس جگہ تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ پرندوں کو مار دینے سے وہ لوگ مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ ہیوگل یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ جوالی سنگھ کی بندوق سے گولی نکل ہی نہیں پائی حالانکہ اُس نے اِسے چلانے کی بہت کوشش کی۔ بعد میں ہیوگل یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ!

"میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر
میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو وہ لوگ مجھے
ایک جادوگر مان لیتے۔"

بیرن ہیوگل نے کوروں اور پانڈوں کے قدیم آثار کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا جسکے لئے اُسے ایک گہری گھاٹی میں سے چلنا پڑا۔ وہ اس خاندان کی تاریخ کی تفصیل دیتا ہے جسکی جڑیں ۲ ہزار پانچ سو سال قبل مسیح پُرانی ہیں۔ اُس نے کوروں اور پانڈوں کی کہانیاں سُنی تھیں لیکن جب وہ اُس جگہ پہنچا تو وہاں اس نے ایک چھوٹا سا مکان اور ایک باغ دیکھا جو ایک فقیر کی ملکیت تھا۔ اُس وقت یہ ایک ویران اور غیر آباد جگہ تھی۔

مکان کسی زمانے میں زیارت کی جگہ تھا۔ اسلام آباد کے ملحقہ علاقوں سے واپسی پر اُس نے کچھ روز قصبے میں قیام کیا۔ قصبے کا کم وبیش جائزہ لینے کے بعد وہ کھنہ بل پہنچا جہاں سے اُس نے سرینگر واپسی کیلئے ایک کشتی لے لی، محض اسلئے کہ وہ اپنے کچھ انگریز دوستوں سے مل سکے۔ اپنے دو دوستوں کے سامنے اُس نے تجویز رکھی کہ اُن سے پہلے کشمیر آنے والے سیاحوں کے نام پر ایک یادگار جیسی تعمیر کرائی جائے۔ چنانچہ ایک کالے رنگ کے سنگ مرمر کی ایک چھوٹے سی سِل پر انہوں نے درج ذیل عبارت تراش کر چار چناری نامی جزیزے پر ایک چھوٹی سی عمارت میں نصب کرنے کا فیصلہ کیا:

"تین سیاحوں، جموں سے بیرن ہیوگل، اسکردو سے ٹی جی وینی اور لداخ سے جان ہینڈرسن نے کشمیر میں ۱۸ نومبر ۱۸۳۵ء کو اُن سے پہلے آنے والے تمام سیاحوں کے نام اس پتھر پر کندہ کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔

برنیر۔ ۱۶۶۳ء، فورسٹر ۱۷۳۶ء، مورکرافٹ، گتھری اور ٹربیک ۱۸۲۳ء، وکٹر جیک ماؤنٹ ۱۸۳۱ء جوزف وولف ۱۸۳۲ء۔

ان میں سے محض دو یعنی پہلا اور آخری سیاح اپنے آبائی ملک واپس چلے گئے۔



غلام نبی آتش☆

وِلیم ویکفیلڈ کا سفرنامۂ کشمیر

وِلیم ویکفیلڈ کینسنگٹن Kensington برطانیہ میں پیدا ہوا۔ایک ماہر معالج کی حیثیت سے ہندوستان میں کچھ مدت کے لئے فرنگی فوج میں کام کرنے کے دوران اُسے کشمیر کی جغرافیہ، تواریخ اور ثقافت جاننے کا شوق پیدا ہوا۔اصل میں اُس کا مقصد کشمیر کی سیاحت پر جانے والوں کو قبل اَز وقت وہاں کے حالات، راستوں، قابل دید مقامات، رسم ورواج، رہن سہن اور دلچسپ چیزوں کی جانکاری دینا تھا۔اُس نے کشمیر سے متعلق تواریخی کتب اور سفرناموں کا مطالعہ کیا، کشمیر آنے جانے والوں سے حالات معلوم کیے، اس طرح ایک مبسوط کتاب کا خاکہ تیار کیا۔آخر 1875 کے موسم گرما میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں ولیم ویکفیلڈ کشمیر آیا۔یہاں مختصر قیام اور سفر کے دوران اُس نے بقولِ خود یہاں کے لوگوں کے حالات، راستے، عجائبات، تواریخی جگہیں، رہن سہن، رسم و رواج، صحت افزا مقامات اور منادرو مساجد کا مشاہدہ کیا۔ کشمیر کی سیاحت کے دوران وہ اپنی کتاب میں ضروری تصحیح کرتا گیا، کچھ باتوں کی صحت کی تصدیق کی اور آخرکار جون 1879ء کو ولیم ویکفیلڈ نے کینسنگٹن سے اس کتاب کو شائع کیا کتاب کا نام ہے ''دی ہیپی ویلی ...... سکیچز آف کشمیر اینڈ دی کشمیریز''

☆لیکچرر ہائر سیکنڈری سکول۔بجبہارہ کشمیر۔

" The Happy Valley__________ Sketches of Kashmir and the Kashmiris" تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب بارہ اَبواب پر مشتمل ہے اور سرینگر سے گلشن پبلشرز نے 1989 میں شائع کی ہے۔

پہلے دوؔ اَبواب میں وادی کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے اِس کی وجہٗ تسمیہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ پہاڑی سلسلوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی سرحدوں کی اہمیت کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے، کشمیر جانے والے راستوں کا تفصیلی بیان دوسرے باب میں آیا ہے۔ آخر پر اہم راستوں کے گوشوارے پیش کئے گئے ہیں جو یہاں درج کئے جاتے ہیں:

راستہ نمبر "ا"

نمبر شمار	نام	فاصلہ	کیفیت
	گجرات سے،		
۱/	دولت نگر		
۲/	کوٹلہ		
۳/	بھمبر	28½ میل	پہلے تین پڑاؤ ڈولی میں یا گھوڑوں پر بہ آسانی طے کئے جاسکتے ہیں، بھمبر تک راستہ اچھا ہے۔
۴/	سیّد آباد	15 میل	راستہ اچھا ہے، یہاں ایک اچھا بنگلہ بھی ہے، کئی پایاب دریا پار کرنے ہیں۔
۵/	نوشہرہ	12½ میل	سلسلۂ کمان گوشی کو پار کرنا ہے، ندی کو بھی کئی بار پار کرنا پڑتا ہے، درّہ پار کرنے کے بعد راستہ اچھا ہے، یہاں ضرورت کی چیزوں کی بہتات بھی ہے اور ایک اچھا بنگلہ بھی ہے۔
۶/	چنگس	13½ میل	عمدہ نظارے، اچھا بنگلہ، آسان سفر۔

۷/	راجوری	14 میل	وادی توّی میں سے آسان راستہ، قصبے کے قریب توّی دریا کو پار کرنا پڑتا ہے، باغ میں ایک اچھی فرودگاہ اور ایک بنگلہ۔
۸/	تھنہ منڈی	14 میل	آسان راستہ، اچھا بنگلہ۔
۹/	بہرام گلہ	10½ میل	آٹھ ہزار دو سوفٹ بلند درۂ حاجی پیر کو عبور کرنا ہے، راستے کا کچھ حصہ خراب ہے، تاہم گاؤں تک کا راستہ قدرے اچھا ہے، یہاں ایک معمولی سا بنگلہ ہے۔
۱۰/	پوشیانہ	8 میل	راستے میں کئی آبشار دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں کوئی بنگلہ نہیں ہے، مٹی کا ایک جھونپڑا ہے۔
۱۱/	علی آباد سرائے	11 میل	آسان پہاڑی راستہ، دریا پار کرنے کے بعد نلان وادی آتی ہے، یہ سلسلۂ کوہ پیر پنچال کے اوپر ہے، درّہ گیارہ ہزار چھ سو فٹ اونچا ہے، راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا ہے، خوبصورت نظارے، سرائے میں کشادہ جگہ ہے۔
۱۲/	ہرپور	12 میل	راستہ وادی کشمیر تک جاتا ہے، یہاں کوئی بنگلہ نہیں البتہ ایک قدیم مغل سرائے موجود ہے۔
۱۳/	شوپیان	8 میل	ایک بڑا قصبہ، اچھا بنگلہ اور رسدات کی بہتات

۱۴/	راموہ	11 میل	میدانی راستہ، دریائے رُنبی آرہ کو پار کرنا پڑتا ہے، کریوہ شروع ہوجاتا ہے، پھر ایک جنگل میں سے گذرنا پڑتا ہے، پھر رامشو دریا آتا ہے، اچھا بنگلہ۔
۱۵/	سرینگر	18 میل	ایک لمبا راستہ، واہتھورہ سے گذرتے ہوئے سری نگر تک اچھا راستہ ہے، راستے کے دونوں طرف سفیدے کے درختوں کی قطاریں کھڑی ہیں، سرینگر پہنچ کر دریا کے دائیں کنارے پر بنگلے اور فرودگاہیں ہیں۔

راستہ نمبر "۲"

نمبر شمار	نام	فاصلہ	کیفیت
۱/ ۲/ ۳/	بارہ کو ٹریٹ مری	13½ میل 12 میل 14½ میل	اچھا راستہ، پہلے تین پڑاو بہ آسانی ڈولی میں یا گھوڑوں پر یا Stage Cart کے ذریعے طے کیے جاسکتے ہیں۔
۴/	دیال	10 میل	پہاڑی پر سے اُترائی والا سفر، اچھا بنگلہ، رسدات کی فراوانی۔
۵/	کوہالہ	11 میل	راستہ دریائے جہلم کے کِنارے کنارے، دریا کے قریب اچھا ڈاک بنگلہ۔
۶/	چھتر کلاس	11½ میل	دریائے جہلم بذریعہ پُل اُمید و بیم کی حالت میں پار کرنا پڑتا ہے، پھر کنارے کنارے چلنا پڑتا ہے، یہاں ایک چھوٹا پُراچھا سا بنگلہ ہے۔

۷/	راراہ	12 میل	یہاں رُسدات کی فراوانی ہے اور بہت اچھا بنگلہ ہے۔
۸/	ثنالی	12 میل	خوبصورت منظر اور پیارا پیارا سفر، کہیں کہیں راستے میں پتھر اور تودے گرے ہیں، تاہم راستہ چلنے کے قابل ہے، دریا کے قریب ایک اچھا سا بنگلہ ہے۔
۹/	گری	10 میل	آسان راستہ اور اچھا بنگلہ۔
۱۰/	ہٹی	12 میل	پہاڑی راستہ، راستے میں تودے بھی ہیں، عمدہ نظارے اور اچھا بنگلہ۔
۱۱/	چکوٹی	15 میل	اچھا اور کشادہ راستہ لیکن پہاڑوں پر سے گزرتا ہے اور کئی جگہوں پر راستے میں پہاڑی تودے بھی گرے ہیں، بہت ندیاں پار کرنا پڑتی ہیں، لیکن ہر ندی پر پُل ہے، چھوٹا لیکن اچھا سا بنگلہ۔
۱۲/	اُوڑی	16 میل	اچھے راستے پر لمبا سفر، سارے راستے پر درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ پھر بھی سارے راستے میں آٹھ تنگ گھاٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، کئی ندیاں بھی پار کرنا پڑتی ہیں، ندیوں پر پُل بنے ہوئے ہیں۔ ایک سطح مرتفع پر شاندار بنگلہ ہے، جو اُونچے پہاڑوں سے گھیرا ہوا ہے۔
۱۳/	اُورمبو	11 میل	وسیع جنگلات کے درمیاں سے اچھا راستہ' سارے راستے پر درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت نظارے، اچھا بنگلہ۔

۱۴/	بارہمولہ	15 میل	اچھا راستہ نوشہرہ سے جاتے ہوئے جہلم پار کر کے قصبے میں پہنچا جا سکتا ہے۔ قصبے میں اُچھا سا دو منزلہ بنگلہ ہے رسدات کی فراوانی ہے کشتیوں کے ذریعے آبی راستے سے بیس گھنٹوں میں سرینگر پہنچا جا سکتا ہے، دریائے جہلم اور جھیل ولر کی سیر مسرور کن ہے۔
۱۵/	پٹن	14 میل	اچھا راستہ۔
۱۶/	سرینگر	17 میل	اچھا راستہ، کھیتوں میں سے گزر کر چھتہ بل جاتا ہے، پھر مہاراجہ کے محل تک اور ازاں بعد امیرا کدل تک، جہاں سیاحوں کے لئے فرودگاہیں اور بنگلے ہیں۔

راستہ نمبر "۳"

درہ پیر پنچال پر گجرات اور پونچھ سے جب راستہ نمبر "۱" بھاری برف باری کی وجہ سے بند ہو جائے تو تھنہ منڈی سے متبادل راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے، گجرات سے تھنہ منڈی تک کے راستے کی کیفیت راستہ نمبر "۱" میں دی گئی ہے۔ تھنہ منڈی سے اُوڑی تک صرف چھ پڑاو ہیں، اُوڑی سے آگے راستے کی کیفیت راستہ نمبر "۲" میں درج ہے۔

نمبر شمار	نام	فاصلہ	کیفیت
۱/	سورن	16 میل	یہ راستہ درۂ حاجی پیر کے اُوپر سے گزرتا ہے یہاں ایک اچھا سا بنگلہ ہے۔

۲/	پُونچھ	14 میل	راستہ دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہے اور آخر پر کھیتوں میں سے ہوگزرتا ہے۔ پونچھ بڑا قصبہ ہے، یہاں کا راجا اسی قصبے میں رہتا ہے، یہاں اچھا بنگلہ ہے اور رَسدات کی بہتات۔
۳/	کھوتہ	9 میل	راستہ شمال کی طرف وادیٔ بہترہ تک جاتا ہے، یہاں ایک معمولی بنگلہ ہے۔
۴/	علی آباد	8 میل	ایک تنگ اور لمبی وادی میں ناخوشگوار سفر، معمولی بنگلہ۔
۵/	حیدرآباد	7 میل	مختصر مگر مشکل سفر، ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند دَرۂ حاجی پیر پار کرنا ہے، پھر پہاڑی سفر ہے، یہاں ایک معمولی بنگلہ ہے۔
۶/	اُوڑی	10 میل	پہاڑی راستہ، عمدہ آبشار راستے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں معمولی بنگلہ ہے۔

راستہ نمبر "۴"

راولپنڈی/ایبٹ آباد سے

نمبر شمار	نام	فاصلہ	کیفیت
۱/	مرّی	40 میل	راولپنڈی سے مری تک تین پڑاو ہیں، بارہ کو، ٹریٹ اور مری۔ یہ سفر ایک دن میں Stage cart کے ذریعے طے کیا جاتا ہے۔

۲/	خیرہ گلی	9 میل	مری سے ایبٹ آباد تک سارا راستہ پہاڑی ہے اور اچھا ہے۔ سفر ایک دن میں پورا کیا جاسکتا ہے، گھوڑوں پر سوار ہوکر یا بذریعہ Dhooly Dak، ضرورت پڑے تو کسی پڑاو پر مسافر ٹھہر سکتا ہے۔ ایبٹ آباد ایک بڑا پڑاو ہے جہاں رسدات کی فراوانی بھی ہے اور ایک اچھا بنگلہ بھی۔
۳/	دونگا گلی	11 میل	
۴/	بارہ گلی	8 میل	
۵/	ایبٹ آباد	14 میل	
۶/	منسیراہ	13½ میل	آسان میدانی راستہ، اچھا بنگلہ۔
۷/	گری	19 میل	لمبے سفر کا پہلا حصہ میدانی راستے سے، دوسرا نصف حصہ جنگلوں میں سے۔
۸/	مظفر آباد	9 میل	راستہ پہاڑی سلسلے سے گزرتا ہوا دریائے کشن گنگا کو عبور کر کے مظفر آباد جاتا ہے، مظفر آباد تک پہنچنے سے قبل مسافر کو دوبالی درہ سے گزرنا پڑتا ہے، وادئ کشن گنگا تک جانے کے لئے تنگ گھاٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔ مظفر آباد بڑا قصبہ ہے۔
۹/	ہٹیاں	17 میل	دریائے جہلم کے دائیں کنارے مشکل اور لمبا سفر۔ اچھا بنگلہ۔
۱۰/	کانڈا	11 میل	سفر آسان، راستے میں کئی نشیب و فراز۔ اچھا بنگلہ۔
۱۱/	کتھاہلی	12 میل	کھردرا راستہ، اکثر مقامات پر کھڑی چٹانیں ہیں۔

۱۲ر	شاہدرہ	12 میل	مشکل سفر، اکثر جگہوں پر گہری گھاٹیاں ہیں، انکو پار کر کے ایک اچھا بنگلہ نظر آتا ہے۔
۱۳ر	کِنگل	14 میل	ہموار راستہ اور اچھا سفر۔
۱۴ر	بارہمولہ	18 میل	ایک لمبا مگر آسان اور خوش کُن سفر۔

بارہمولہ سے آگے سرینگر تک کے راستے کے بارے میں راستہ نمبر ۲ر میں تفصیل دی گئی ہے۔



بیعہ نامہ امرتسر:-

ویکفیلڈ نے تین سو صفحات پر مشتمل اپنے سفرنامے میں کسی بھی محبِ وطن اور قوم پرست فرنگی کی طرح اکثر مقامات پر قومی مفادات کے نکتہ نظر کے مطابق خامہ فرسائی کی ہے، وہ کشمیر کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتے کرتے اپنے قلم سے گل فشانی تو کرتا ہے مگر اس خوبصورت وادی کے باشندوں کے بارے میں کئی بار ہتک آمیز اور مبنی بر دَروغ باتیں بھی لکھتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کی تواریخی اور ثقافتی عظمت کو بھلا کر کچھ سُنی سُنائی باتیں بھی تحریر کر گیا ہے۔ اصل میں اُس نے یہاں کی تواریخ اور ثقافت کا غیر جانبدارانہ اور سنجیدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ سرسری طور پر وہی پڑھا جو عجلت میں ملا اور وہی لِکھا جو وادی کے سفر کے دوران اِکا دُکا لوگوں سے سُنا۔ شاید اُسے اُن خیالات اور حالات کی تحقیق کا کافی موقعہ نہیں ملا تھا جو مختلف ذرائع سے اُسکے ذہن میں اکٹھا ہوئے تھے۔

اس نے لکھا ہے کہ کشمیر کی آب و ہوا اچھی ہے۔ زمین زرخیز ہے، یہاں پانی کی فراوانی ہے، اس خوبصورت اور پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کو ایشیا کے وسط میں ''چھوٹا انگلستان'' بنایا جاسکتا تھا جو کہ جنگ و جدل کے دوران مضبوط قلعے کا کام دے سکتا تھا۔ لیکن بے ایمان پھیری والوں کی جیسی سپرٹ (Spirit) اکثر بار ہماری قومی پالیسی میں سرایت کر جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ نپولین اعظم نے فرنگیوں کو ''دکانداروں کی قوم'' کہہ کر پکارا۔ ایسا ہی کشمیر کے معاملے میں کیا گیا۔ جب ہماری

سپریم گورنمنٹ نے تمام قومی مفادات کو چھوڑ کر اس ملک کو صرف پچھتر لاکھ نانک شاہی روپے کی حقیر رقم کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس سودا بازی دستاویز کو معاہدۂ امرتسر (بیعہ نامہ امرتسر) کہا جاتا ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''والیٔ جموں، گلاب سنگھ اور سرکار برطانیہ کے درمیان معاہدہ، جو کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے فریڈرک کیوری صاحب اور میجر ہینری منٹگمری لارینس نے، ہندوستان کے گورنر جنرل اور ملکۂ برطانیہ کے معزز پریوی کونسل عزت مآب سر ہنری ہارڈنگ کے احکامات کے تحت طے کیا۔

دفعہ نمبر ''۱'': سرکارِ برطانیہ وہ تمام پہاڑی علاقہ جات جو دریائے سندھ کے مشرق میں اور دریائے راوی کے مغرب میں معہ اس کے تابع علاقے اور چمبہ سوائے لاہول، مہاراجہ گلاب سنگھ کو ہمیشہ کے لئے منتقل کرتی ہے۔ یہ سب علاقہ، جس کی سرحد کا ایک حصہ لاہول ہے، ۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو معاہدہ لاہور کے مطابق حکومت برطانیہ کو سونپ دیا گیا تھا، پوری طرح گلاب سنگھ اور اسکے ورثاء کے قبضے میں رہے گا۔

دفعہ نمبر ۲: دفعہ نمبر ا کے تحت جو مشرقی علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو منتقل کیا گیا اُس کی سرحد متعین کرنے کے لئے سرکار برطانیہ اور گلاب سنگھ کی طرف سے کمشنر تعینات کئے جائیں گے اس کی وضاحت ایک علیحدہ معاہدے میں کی جائیگی۔

دفعہ نمبر ۳: فعہ ۱ اور دفعہ ۲ کے تحت مہارجہ گلاب سنگھ اور اُس کے ورثاء کے نام علاقہ جات کی منتقلی کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ سرکار برطاینہ کو 7500000-00 نانک شاہی روپے ادا کرے گا۔ اس معاہدے کے تسلیم وتقدیق کے وقت 5000000-00 اور سال رواں یعنی 1846ء کے اکتوبر کی پہلی تاریخ کو یا اس سے پہلے

200000-00 نک شاہی روپے اُدا کرے گا۔

دفعہ نمبر۴: سرکار برطانیہ کی مرضی و منظوری کے بغیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقہ جات کی سرحدوں میں کوئی پھیر بدل نہیں کیا جائیگا۔

دفعہ نمبر۵: کسی بھی وقت لاہور سرکار کے ساتھ یا کسی ہمسایہ ملک کے ساتھ کوئی تنازعہ، سوال، کوئی مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں مہاراجہ گلاب سنگھ سرکارِ برطانیہ سے ثالثی کرائیگا اور سرکارِ برطانیہ کے فیصلے پر عمل پیرا ہو کر کاربند رہے گا۔

دفعہ نمبر٦: مہاراجہ گلاب سنگھ اپنے نام اور اُپنے ورثاء کے نام پر معاہدہ کرتا ہے کہ جب سرکارِ برطانیہ فوج پہاڑوں پر یا مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقے سے ملحقہ سرحدوں میں تعینات کی جائیگی تو مہاراجہ معہ اُپنی اُفواج کے برطانوی افواج میں شامل ہو جائیگا۔

دفعہ نمبر۷: مہاراجہ گلاب سنگھ، سرکارِ برطانیہ کی اجازت کے بغیر کبھی بھی کسی برطانوی، یورپی اور امریکی باشندے کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھے گا۔

دفعہ نمبر۸: مہاراجہ گلاب سنگھ، اُن سرحدوں سے متعلق، جو اُس کو منتقل کی گئی، اس معاہدے کی دفعہ ۵، دفعہ ٦ اور دفعہ ۷ پر اُن علیحدہ معاہدوں کے مطابق عمل کرے گا جو لاہور دربار اور حکومت برطانیہ کے مابین ۱۱ مارچ ۱۸۴٦ء کو طے پائے ہیں۔

دفعہ نمبر۹: سرکارِ برطانیہ، مہاراجہ گلاب سنگھ کو بیرونی دشمنوں سے اُپنی سرحدوں کو بچانے کیلئے امداد فراہم کرے گی۔

دفعہ ۱۰: مہاراجہ گلاب سنگھ سرکارِ برطانیہ کے تفوّق اور اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرنے کے ثبوت کے طور پر مہاراجہ گلاب سنگھ ہر سال سرکار برطانیہ کو ایک گھوڑا، پشمینہ دینے والی اعلیٰ نسل کی بارہ بکریاں (٦ نر اور ٦ مادہ) اور کشمیری شال کے تین

جوڑے پیش کرتا رہے گا۔

یہ معاہدہ جو دس دفعات پر مشتمل ہے، آج کے دن طے پایا۔ حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان حکومتِ برطانیہ کی طرف سے فریڈک کیوری صاحب اور میجر ہنری منٹگمری نے گورنر جنرل عزت مآب سرہنری ہارڈنگ کے احکامات کے مطابق معاہدہ کیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ بہ نفسِ نفیس خود موجود تھے۔

یہ معاہدہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء مطابق ۷ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ طے پایا اور اس کی تصدیق کی گئی۔

صفائی کا فقدان:۔

وِلیم ویکفیلڈ سرینگر پہنچ کر یہاں کی قریب قریب ہر چیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا گیا۔ سرینگر کی سیر کرنے کے بعد وہ وادی کے دیگر اہم مقامات دیکھنے گیا تھا۔ سرینگر کا مختصر اور سرسر تواریخی پسِ منظر بیان کر کے اس شہر کو جائے وقوع اور فطری خوبصورتی کی بناپر Venice of the East کا درجہ دیتے ہوئے اُس نے لکھا ہے کہ دریائے جہلم، جس میں اور بھی کئی ندیاں ملتی ہیں اس شہر کی خوبصورتی میں اہم اضافہ کرتا ہے۔ شہر میں گندی، تنگ اور معمولی طور ہموار گلیاں ہیں، مناسب گلی کوچے نظر نہیں آتے۔ لوگ پہیوں والی گاڑیوں سے آشنا نہیں ہیں۔ رسل ورسائل اور باربرداری کے لئے زیادہ تر دریائی راستے استعمال کئے جاتے ہیں۔ دریا کے کناروں پر گھنے مکانات ہیں۔ لوگ دریا کے کناروں پر اکٹھا ہو کر گھریلو مشغلوں اور گپ شپ میں مصروف رہتے ہیں، گھاٹوں پر عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ عورتیں بار بار برتنوں میں پانی بھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ پانی اُن کے گھروں میں کھانا پکانے کے کام آتا ہے۔ اس پانی کو وہ نہانے کے لئے استعمال نہیں کرتی ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ، جن کے گھروں کے دروازوں کی سیڑھیوں سے لگ کر اس بڑے دریا کا پانی بہتا رہتا ہے، ذاتی صفائی کیلئے نہانا جانتے ہی نہیں۔ بچپن سے بڑھاپے تک نہانے کے

عادی نہیں ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ یہاں لوگ عادتاً گندے رہتے ہیں۔ ذاتی صفائی کیلئے پانی کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے جس طرح ہندوستان کے لوگ پانی سے صفائی کی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔

دریائے جہلم شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ مختلف جگہوں پر اس دریا کے اوپر سات پُل بنائے گئے ہیں جو سب کے سب لکڑی کے بنے ہیں، تاہم ریت اور پتھر بھی استعمال میں لائے گئے ہیں۔ مکانات کی ساخت اور ڈھلوان چھتیں بہت دلچسپ ہیں۔ بیالیس لاکھ بیس نفوس پر مشتمل آبادی والے اس ملک کے سرینگر شہر میں ڈیڑھ لاکھ لوگ رہتے ہیں۔ کشمیریوں کی اصل، آریائی نسل سے ہے مرد دراز قامت اور مضبوط ساخت والے ہیں، اُن کی پیشانیاں بُلند اور سر خوش شکل ہیں۔ ان کے جسمانی خدو خال بڑے نمایاں ہیں۔ یہ لوگ افغانوں جیسا حلیہ اور یہودیوں جیسا کریکٹر Character رکھتے ہیں۔ اکثریت مسلمانوں کی ہے، ہندوؤں کی آبادی کل آبادی کا ساتواں حصّہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جسمانی ساخت اور خوبصورتی کے لحاظ سے نمایاں فرق ہے۔ اِٹلی کے باشندوں کی طرح عام طور پر مسلمان زیتونی رنگ کے ہیں جبکہ ہندو سرخ و سفید رنگوں کے گالوں والے خوبصورت لوگ ہیں۔ کشمیری عورتوں کی خوبصورتی کا قدیم زمانے سے خوب چرچا ہے۔ اس ملک کی عورتوں میں عام طور پر جسم کے اُبھار اور خدو خال مخفی رکھنے کا رواج نہیں، صرف اونچے طبقوں کی عورتیں ایسا کرتی ہیں۔ میں نے سرینگر اور وادی کے دیگر علاقوں میں خاص عمر کی بدصورت عورتیں دیکھی ہیں جو زندگی بھر جانفشانی سے جسمانی محنت کرتی رہتی ہیں لیکن ہندوؤں کی اونچی ذات کی اس عمر کی عورتیں، جو عام طور پر ناقابلِ رسائی ہیں، بہت خوبصورت ہیں۔ اُن میں دُبلا پن نہیں ہے، وہ دراز قد اور صحت مند ہیں۔ اُن کے گال ہلکے گلابی اور سفید ہیں، جسم کے خدو خال مغربی عورتوں کی طرح سانولے رنگ کے ہیں۔ نچلے طبقے کی عورتوں کے چہرے بادامی اور سُرخ ہیں، وہ جسمانی محنت و مشقت کی عادی ہیں۔ کشمیری خواتین کے بڑے بڑے سفید دانت، بادام جیسی

سُرخی مایل بڑی بڑی آنکھیں اور سیاہ مژگان اُن کی خوبصورت تصویر کی تکمیل کرتے ہیں۔غریبی، مُفلِسی اور جسمانی گندگی کی وجہ سے کشمیری عورتوں کو بدصورتی نے لپیٹ لیا ہے۔اسی لئے میں بڑی حد تک اُن کے حسین وجمیل ہونے کے دعویٰ کو وثوق سے نہیں مان سکتا، پھر بھی ایک انگریز مصنّف نے لکھا کہ...... "کشمیری عورت دیکھ کر اُسے وہ قدیم مجسّے یاد آگئے جو صدیوں سے زمین میں مٹی تلے دبے ہوئے ہیں اور ابھی زمین سے نکال کر صاف نہیں کئے گئے، اگر ایسا ہو جائے تو کشمیری عورت فطرت کے حُسن وجمال کی بہترین مثال ہوگی۔"

پہناوے:۔

کشمیریوں کی پوشاک بہت بدنما ہے، اُن کا پہناوا اُن کو کوئی قدر ومنزلت اور خوبصورتی عطا نہیں کرتا۔قدیم زمانے میں اُن کا ایک مخصوص لباس تھا جس کے استعمال پر اکبر بادشاہ نے اس ملک کو فتح کرنے کے بعد روک لگادی۔اَب مرد ایک دراز زیر جامہ، ڈھیلا اور لمبا کُرتا پہنتے ہیں، یہ ڈھیلا لبادہ گردن سے ٹخنوں تک لمبا ہے، سر پر پگڑی یا تنگ ٹوپی پہنتے ہیں۔اگر پاؤں میں جوتے ہوں تو وہ کھُردرے اور بِلا دُباغت کئے ہوئے ہیں، ورنہ عام طور پر لوگ گھاس اور گھاس سے بٹی ہوئی رسیوں سے بنا ہوا جوتا پہنتے ہیں۔گرمیوں کے موسم میں سُوتی اور سردیوں میں اُونی کپڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔لباس عام طور پر سفید رنگ کا ہوتا ہے، جو کبھی دھویا نہیں جاتا، مَردوں کے لباس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔کچھ امیر ہندوؤں کا لباس ویسا ہے جیسا ہندوستان کے ہندوؤں کا ہوتا ہے۔عورتوں کا لباس بھی مَردوں کے لباس جیسا ہوتا ہے۔اَلبتہ عورتوں کے لباس مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں مثلاً سبز رنگ کے، نیلے رنگ کے سُرخ رنگ کے، اُن کے سروں پر چھوٹی ٹوپیاں[1] ہوتی ہیں، ٹوپی کے گرد سُرخ کپڑے کی سنگار پٹی بندھی ہوتی ہے۔امیر گھروں کی عورتیں چادر یا شال اوڑھتی ہیں۔مشرقی ممالک میں اکثر عورتیں جسم اور چہرے کے خدوخال چھُپانے کیلئے ایسی

---

[1] اسے کشمیری میں کسابہ کہتے ہیں۔

چادریں اُوڑھتی ہیں مگر کشمیر کی عام عورتوں میں اس کا رواج نہیں ہے۔ ہندو عورتیں ایک مُڑا ہوا سفید کپڑا اپنی کمر کے اِرد گرد لپیٹتی ہیں۔ اس سارے ملک میں پنڈتانیاں شاید زیادہ صاف ستھری رہتی ہیں، بہترین پوشاک پہنتی ہیں، سامانِ آرائش کا استعمال کرتی ہیں، کانوں اور ناکوں میں بالیاں لٹکاتی ہیں، چوڑیاں پہنتی ہیں اور شاید سب سے زیادہ حسین ہیں۔ کشمیری عورتوں کے گھنے کالے بال چمکدار ہوتے ہیں، یہ عورتیں عجیب طرح سے بال گوندھتی ہیں، سب بال سر کے پیچھے کی طرف موڑ لئے جاتے ہیں اور اُن کے بٹے ہوئے نازک ڈورِیوں سے چھوٹے چھوٹے پھندے والے جھالر بنائے جاتے ہیں، جو کمر تک لٹکے رہتے ہیں اور اُن کے سر سے پر زیبائش کیلئے خوبصورت جھالر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔

پیداوار اور خوراک:۔

کشمیر میں کھانے پینے کی چیزیں سستی بھی ہیں اور فراواں بھی۔ہم ان چیزوں کی قیمتیں دیکھ کر حیران اور خوش ہوگئے۔ چاول کشمیریوں کی خاص خوراک ہے، شالی کے علاوہ یہاں گندم، مکئی، جَو اور دیگر فصلیں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ چاول، کشمیریوں کا اہم کھانا ہونے کے علاوہ سرکاری آمدنی کا بہت بڑا وسیلہ ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کی یہاں متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں جن کی قیمتیں Covent Garden کے دکانداروں کو حیرت میں ڈال دیں گی۔ بند گوبھی، شلجم، کھیرے اور سلاد میں کام آنے والی دیگر سبزیوں کی بہتات ہے، لوگ خوب سبزیاں کھاتے ہیں، غیر ملکیوں کو یہاں کے میوے زیادہ حیران کر دیتے ہیں۔ یہاں اُخروٹ، توت، خوبانی، گلاس، اَنار، سیب اور ناشپاتی وغیرہ پائے جاتے ہیں، ہمارے جزیرے میں بھی ان میں سے بہت سے میوے اُگتے ہیں لیکن کشمیر میں ان پھلوں کی کاشت اچھی طرح سے نہیں کی جاتی..... یہاں فطرت خود باغبانی کا کام کرتی ہے۔ لوگ اِن پھل دار درختوں کی دیکھ بال کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں اُٹھارہ قسم کے انگور ملتے ہیں۔ ایک آنے میں کئی پونڈ انگور ملتے ہیں۔ خوبانی، جو بہت عمدہ ہے، بھی ایک آنے (چار پیسے) میں کئی

درجن خریدے جاسکتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں انگوروں سے شراب بنائی جاتی تھی، اُب شراب نہیں بنائی جاتی۔ اگر مناسب انتظام کیا جائے تو کشمیر میں سیبوں سے بہترین مشروبات بنائے جاسکتے ہیں۔ گنے کی کاشت کیلئے ماحول ٹھیک نہیں تاہم اچھی قسم کی کپاس اُگائی جاسکتی ہے۔ کپاس کی کاشت کیلئے زمین عام طور پر وُڈروں (کریوہا) پر موجود ہے، اس فُصل کو آبپاشی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں Hops کی کاشت حال میں ہی متعارف کرائی گئی ہے، میں نے مُری میں اس کی کاشت دیکھی۔ کشمیر میں پہاڑوں پر صنوبر کے درختوں کی کئی اقسام ملتی ہیں۔ یہاں دیودار کے درختوں کی بہتات ہے۔ چنار، سفیدے اور بید کے درخت وافر تعداد میں ہیں لیکن چنار یہاں کا درخت نہیں ہے۔ مغل گورنر علی مردان خاں نے یہ درخت یہاں لگوایا تھا۔ چنار ایک شاندار درخت ہے۔ کشمیر میں مشروبات بنانے کیلئے بھی پودے ہیں اور پھولوں کے پودے بھی۔ اکثر پھول خودُ رو ہیں، یہاں کا زعفران بہت مشہور ہے۔

کشمیر میں گھوڑے، گائیں اور بیل چھوٹی جسامت کے ہیں تاہم بھیڑیں خوبصورت بھی ہیں اور اچھی جسامت والی بھی۔ ایک بھیڑ کی قیمت ایک روپے سے لیکر چار روپے تک ہے۔ گائے ہندوؤں اور سکھوں کے یہاں مقدس مانی جاتی ہے، یہاں گاؤ کُشی پر سخت پابندی ہے۔ سیاحوں کو پرندوں، مرغوں اور بطخوں کا گوشت دیا جاتا ہے، ایک پرندہ ایک آنے میں ملتا ہے۔ دُودھ، اَنڈے، مچھلیاں اور شہد بھی ملتا ہے۔ یہاں کئی قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں مچھلیاں غریبوں کی خوراک کا ایک اہم حصہ مہیا کرتی ہیں۔ قحط اور خشک سالی کے زمانے میں سبزیاں، میوے اور مچھلیاں کشمیریوں کو زندہ رکھنے میں مدد کرتی ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی وفات کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کو بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ کی روح ایک ٹراؤٹ مچھلی میں داخل ہوگئی ہے، وہ مچھلی مہاراجہ گلاب سنگھ کی شاندار کامیابیوں کے جائے وقوع کے قریب پانی میں تیرتی رہتی ہے، گلاب سنگھ کی روح کو بے حرمتی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے مہاراجہ نے ایک حکم کے

ذریعے مچھلیاں پکڑنے پر روک لگادی لیکن بہت جلد یہ بات منکشف ہوگئی کہ اس حکم پر عمل پیرا رہنے سے روح کو سخت تکلیف ہوگی، اس لئے حکم کو واپس لیا گیا۔

زبان اور ادب:

پہناوے کی طرح کشمیریوں کی زبان بھی عجیب ہے۔ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں سے بالکل مختلف اس زبان کے تلفّظ میں الھڑپن اور سختی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اُن کی زبان میں کوئی ادبی کام ہوا بھی ہے یا نہیں۔ کشمیریوں کے پاس فخر کرنے کے لائق بہت کم ادبی اور تواریخی سرمایہ ہے، تاہم راج ترنگنی، نیل مت پوران اور کچھ ڈرامے ہیں جو سنسکرت میں لکھے گئے ہیں۔ فارسی میں بھی کچھ چیزیں ہیں، میں نے خود نہیں دیکھیں بلکہ مجھے بتایا گیا کہ کچھ مسوّدات ایک خاص درخت کی چھال پر لکھے گئے ہیں جن کو قدیم آثار کے طور پر بہت اہمیت حاصل ہے۔

سیرت اور کردار:

ویکفیلڈ کہتا ہے کہ یہاں کے لوگوں میں کچھ اچھے اوصاف ہیں لیکن اُن پر اُن کی ناکامیوں اور کوتاہیوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ وہ دروغ گو ہیں اور ایسا دِکھتا ہے کہ یہاں کے باشندے دروغ گوئی کو ماں کے دودھ کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ کشمیری ہمیشہ تُو تُو میں میں اور غل غپاڑے کیلئے تیار رہتے ہیں لیکن وقت پر لڑنے سے گریز کرتے ہیں، اُن کو ڈرایا دھمکایا جائے تو خوب چلاتے ہیں وہ جسمانی خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے ایستادہ نہیں ہو سکتے۔ وہ مصدقہ طور پر چالاک، خوش تدبیر، باتونی اور اُفتادِ طبع میں شادماں لوگ ہیں۔ ان کی لاعلمی اور دروغ گوئی دوسرے ملکوں کے لوگوں کو سخت باتیں کہنے کا موقعہ فراہم کرتی ہیں۔

شہر باشوں اور دیہہ باشوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بلا امتیاز پیشہ ''پنڈت'' کہا جاتا ہے، وہ اپنے مذہبی علوم میں خاص مہارت رکھتے ہیں، آج کل سب ہندو عالِم نہیں ہیں، کچھ ادیب ہیں، کچھ درزی، کچھ کپڑا فروش۔ پھر بھی اُن کی ایک اچھی تعداد مذہبی تعلیم دینے میں اور قدیم اَدب کے بارے میں کام کرنے میں

خوب مشقت اُٹھاتی ہے۔ موجودہ مہاراجہ اس سلسلے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ یہ لوگ بڑا اثر ورسوخ رکھتے ہیں، سرکار کی طرف سے مراعات اور نوازش پانے والے لوگ ہیں۔ باقی سب لوگ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے متعدد قبیلے ہیں۔ چک ایک جنگجو قبیلہ تھا، اب اُن کی نسل کے لوگوں کو گلہ وان کہتے ہیں جو پہاڑوں پر گھوڑے چَراتے رہتے ہیں۔ کشمیر کا ایک جاذب نظر قبیلہ کشتی بانوں کا ہے جنکو ہانجی کہتے ہیں۔ وہ کشتیوں میں بودو باش کرتے ہیں۔ ہر وقت انگریز سیاحوں کی خدمت کیلئے تیار رہتے ہیں۔ ہانجی بامُروت اور مددگار ہوتے ہیں۔ ''واتل'' پست ذات کے لوگ ہیں جو موسیقار اور رقاصائیں مہیا کراتے ہیں۔ اس ذات کے لوگ خانہ بدوش ہیں حتیٰ کہ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں تک بھی پہنچتے رہتے ہیں۔

صنعت وحرفت اور دستکاریاں:

چوب کاری، سوزن کاری، مٹی کے برتن بنانا، دھات کا کام، طِلا کاری، پیپر ماشی، چمڑے کا کام، عطر سازی، زیورات بنانا، کندہ کاری اور ریشی صنعت میں کشمیریوں نے نام کمایا ہے۔ شال بافی کیلئے کشمیری کاری گر دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ وِلیم ویکفیلڈ نے ان سب کاموں کے بارے میں لکھا ہے اور زیادہ تفصیلات صنعتِ اَبریشم اور شال بافی کے بارے میں فراہم کی ہیں۔ اُس نے سرینگر اور سرینگر کے باہر ان کاموں کا بہ چشمِ خود مشاہدہ کیا ہے اس نے لکھا ہے کہ ایک بار سرینگر سے بہت دُور ایک گاؤں میں طوفانی بارش سے بچنے کیلئے میں اور میرا ساتھی ایک دیہاتی کے گھر میں گھُس گئے، وہاں اندر گاؤخانہ تھا اور گاؤخانے کے ایک طرف گندی جگہ پر کرگھے پر گھر کے سب لوگ کام کر رہے تھے۔ شال بافی سرکار کیلئے بڑا ذریعہ آمدن ہے۔ وقت پر شال تیار نہ کرنے پر کاریگر پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ شال 'پشمینہ سے بُنے جاتے ہیں، پشمینہ لداخ اور تبت میں پائی جانے والی خاص قسم کی بکریوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

لاء اینڈ آرڈر اور مہاراجہ کی فوج:۔

قدیم زمانے میں کشمیر کو انتظامی معاملات چلانے کیلئے دو حصوں میں تقسیم

کیا گیا تھا جو چھتیس پرگنوں میں بانٹ لئے گئے تھے لیکن گذشتہ چند سالوں کے دوران سارے کشمیر کو نئے منصوبے کے تحت چھ وزارتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک وزارت کا انتظام وزیرِ وزارت یا گورنر چلاتا ہے۔ ہر ایک وزیرِ وزارت کے پاس جوابدہ ہے اور گورنر مہاراجہ سے ہدایات و احکامات حاصل کرتا ہے۔ ایسا نظامِ حکومت لوگوں کو راس آتا دکھتا ہے۔ اگرچہ قحط سالی اور غریبی جو لوگوں کے حصے میں آئی ہے، کسی حد تک وہ اس غریبی کے مقروض بھی ہیں کیونکہ آرام طلبی اُن کا امتیازی وصف ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ اُن کو اپنی جائیداد بڑھانے کیلئے بہت کم لالچ دیا جاتا ہے۔ زمین مہاراجہ کی پراپرٹی ہے اور وہ فصلوں کا 2/3 حصہ وصول کرتا ہے اور اُگانے والے کے پاس بہت کم اناج رہتا ہے۔ ملک کی آمدنی کے خاص وسائل پیداوار کا یہ حصہ، شال اور دیگر چیزوں پر عائد شدہ ٹیکس ہیں، گزشتہ زمانے میں یہ ایک خطیر رقم ہوا کرتی تھی اب گھٹ کر صرف پانچ لاکھ روپے رہ گئی ہے۔ ملک میں ہندوؤں کے قوانین کا چلن ہے، عوامی ربط وضبط اور لا اینڈ آرڈر کی صورت حال اطمینان بخش ہے، بڑے جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا...... سیاحوں کے مال و جان پوری طرح محفوظ ہیں۔ مقامی باشندے چاہے امیر ہوں یا غریب، ہر وقت خوشی خوشی سیاحوں کی مدد کرنے اور اُن پر توجہ دینے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔

مہاراجہ کی فوج وادی کیلئے کافی لیکن لداخ، گلگت اور دوسرے زیرِ نگین علاقوں کی حفاظت کیلئے فوج کافی نہیں ہے۔ بندوق بردار فوج کے پاس صرف تیس بندوقیں ہیں، رسالہ فوج میں بھی کچھ زیادہ فوجی نہیں ہیں، البتہ پیادہ فوج میں پندرہ ہزار سپاہی ہیں۔ فوجیوں کو اچھی تنخواہ ملتی ہے اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اُن کی وردی بھی اچھی ہے، برطانوی فوجیوں کے طریقے پر اُن سے ڈرل DRILL کرائی جاتی ہے، اُفسران انگریزی زبان میں احکامات دیتے ہیں۔ مہاراجہ کی فوج میں زیادہ تر سپاہی جموں، گلگت اور دیگر علاقوں کے ہیں وادی کے لوگوں کو کبھی کبھار ہی فوج میں شامل کیا جاتا ہے۔

ویکفیلڈ سرینگر میں :۔

ویکفیلڈ نے سرینگر میں دلچسپی کی ہر جگہ اور ہر چیز دیکھ کر اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ سرینگر کے بازاروں، گلی کوچوں، عمارات، کشتیوں، ندیوں اور لوگوں کے بارے میں اُس نے ممکنہ معلومات فراہم کی ہیں، شیر گڈھی، نالہ مار، کٹہ کول ...؛ ژوٗنٹھی کول حبہ کدل، فتح کدل، مسجدِ شاہمدانؒ، باغِ دلاور خان، زینہ کدل، ضراب خانۂ کشمیر، جامع مسجد، عالی کدل، بُلبل لنکر، نوا کدل، صفا کدل، عید گاہ، تیرتے باغات، حضرت بل، نشاط باغ، شالیمار باغ، قلعۂ ہاری پربت، بندوق بنانے کا کارخانہ، رام باغ، پولو گراؤنڈ اور دیگر عمارت ومنادر، مساجد کو بہ چشمِ خود دیکھا ہے۔ سرینگر سے شمال مغرب کی طرف کے علاقے کے سفر کے دوران جو کچھ اس نے دیکھا ہے اسکی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ سرینگر سے شادی پورہ، گاندربل، سندھ وادی، وانگت، لداخ روڈ، کوہِ ہرموکھ، سونہ مرگ تک کا سفر کیا ہے، بانڈی پورہ بھی دیکھا ہے اور کریوۂ حضرت بابا شکور الدّین سے بھی، وُلر کا نظارہ کیا ہے اور حاجن، سوپور وغیرہ بھی دیکھا ہے۔

دو یادگار واقعات :۔

ویکفیلڈ نے شمال مغربی علاقے کے سفر کے دوران پیش آئے دو دلچسپ واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مانسبل کے قریب وہ اپنی خاتون ہم سفر کے ساتھ ایک آبی وادی سے گذرے جہاں سبزیوں کی بہتات تھی، یہ سبزیاں ہمارے سفر میں رکاوٹ بنتی تھیں، یہاں مچھروں کے دَل کے دَل ہم پر حملہ آور ہو گئے، مچھر بادلوں کی طرح چھا گئے، ہمارے جسم، جن پر نازک کپڑے تھے مچھروں کے کاٹنے سے لہولہان ہو گئے، بار بار بھگانے سے بھی وہ نہیں بھاگے بلکہ کاٹ کر لہو پینے میں ایسے مست ہو گئے کہ بھاگنے پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ میری خاتون ساتھی کے چہرے پر، بازوں پر وَرم آ گیا۔ مچھروں کے زہریلے نیش ہمارے لئے مصیبت بن گئے، ہمارے نوکر بھی بچاو کیلئے کچھ نہ کر پائے۔ آخر ہم نے گیلی لکڑی جلا کر مچھروں کو

بھگانے کی کوشش کی لیکن کڑوا کیسلا دُھواں ہمارے لئے ایک اور عذاب بن گیا۔ آخر ہم نے دریا میں چھلانگ ماری۔ مچھروں کا یہ حملہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ دوسرا واقعہ ایک ہندو فقیر کے بارے میں درج کیا گیا ہے۔ ویکفیلڈ رقم طراز ہے کہ اسی مانسبل علاقے میں ہم نے ایک خدا رسیدہ ہندو فقیر کو دیکھا جو کئی برسوں سے اُونچے پہاڑ پر اپنی قیام گاہ کے عقب میں ایک بھاری چٹان کے اندر اپنے لئے قبر کھوتا رہا ہے۔ اس تیاگی فقیر نے خوشی خوشی اس محراب دار غار کے اندر کھودی ہوئی قبر تک ہم کو پہنچا دیا۔ یہ گپھا پچاس فٹ لمبی ہے اور ایک وقت میں اس کے اندر دو آدمی ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ قبر تیار رکھ کر اسے مرنے کا ڈر نہیں تھا، وہ ہشاش بشاش تھا کہ اُس کے مرقد کو تقدیس ملے گی، لوگ یہاں آکر پوجا پاٹ کریں گے۔ چٹان میں کھودی ہوئی قبر دِکھانے کے بعد اس نے ہم کو آشیرواد دیا اور بخشش کا مطالبہ کیا۔ ویسے بھی وہ خود انگور اور خوبانی کے درختوں کی دیکھ بال کر کے پیٹ پالا کرتا تھا۔

سٹیم بوٹ ڈل میں:۔

ولیم ویکفیلڈ نے دیگر متعدد انگریز سیاحوں کے ساتھ اُس تقریب خاص میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی جو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جشن کی صورت میں منعقد کرائی تھی۔ اس جشن میں اُمرا، وُزرا، سیاحانِ یورپ اور حکامِ وقت کے علاوہ عوام کی کثیر تعداد بُلائی گئی تھی۔ جشن ڈل جھیل میں پہلی بار اسٹیم بوٹ چلانے کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔ تقریب کا مشاہدہ کرنے کیلئے مہاراجہ بھی تشریف فرما تھے، بدقسمتی سے تیکنیکی خرابی کی وجہ سے یا ماہر کی غیر موجودگی کی بنا پر اُس وقت اسٹیم بوٹ چل نہ سکا۔ خرابی دُور کر کے اُسے دوسرے روز چالو کیا گیا۔ انگریز سیاحوں کو شالیمار باغ میں دعوت کھلائی گئی، باغ میں چراغاں کیا گیا تھا، ویکفیلڈ نے اس واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اس واقعے کو اہم ترین تواریخی واقعہ قرار دیا ہے۔ اس تقریب کے دوران سیاحوں نے ناچ گانے اور رقص و سرور کا لطف بھی اُٹھایا تھا۔

سرینگر سے لولاب:۔

وادیٔ لولاب تک پہنچنے کے دوران ویکفیلڈ نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو سمیٹ کر تحریر کیا ہے۔لال پورہ سے لولاب کا سفر اس کیلئے انتہائی دلچسپ رہا ہے۔ لولاب کی خوبصورتی کے علاوہ وہاں کے مکانات، حیوانات، پرندوں اور درندوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ریچھ نہ صرف وادیٔ لولاب میں بڑی تعداد میں موجود ہیں بلکہ سارے کشمیر میں ریچھ دیکھے جاسکتے ہیں۔لولاب میں ایک بار رات کے وقت ایک ریچھ اُس کے بیڈ (Bed) کے نیچے گھس گیا،نوکروں نے جُوں توں کر کے اسے بھگایا اور دور تک تعاقب کیا۔اس نے لکھا ہے کہ لولاب وادی میں بندر اور خرگوش موجود نہیں ہیں۔لولاب میں توت کے درختوں کی بہتات ہے۔

گلمرگ کی سیر:۔

ویکفیلڈ اگست کی چھ تاریخ کو گلمرگ پہنچ گیا تھا۔سوپور سے بارہ کوترہ ہوئے ہوئے بابا ریشی کے مقام پر ُستانے کے بعد گلمرگ پہنچ گیا تھا۔گلمرگ کی خوبصورتی کا حال لکھتے ہوئے اس نے یہاں کے پھولوں کی فراوانی، آب وہوا اور اَمن وسکون کے بارے میں تفصیلاً اپنے مشاہدارت بیان کئے ہیں۔گھنے جنگلوں سے گھری ہوئی اس چھوٹی مگر دلفریب وادی میں اس کو پہلے دو ہفتوں کے دوران زوردار بارشوں نے پریشان کر دیا تھا جس مکان میں وہ اپنے ساتھی سمیت قیام پذیر تھا اُسکی چھت دو ہفتوں تک لگاتار ٹپکتی رہی۔اصل میں وہاں غیر ملکی سیاحوں کے رہنے کیلئے بنگلے نہیں تھے، ان کو خیمے گاڑ کر دن گذارنا پڑتے تھے یا مقامی ترکھان معمولی اُجرت کے عوض دستیاب لکڑی سے ایک منزلہ ایک کمرہ والا معمولی ہٹ (Hut) تعمیر کر کے دیتا تھا جو کہ کم مدت میں زمین بوس ہو جاتا تھا۔ایسے ہی ایک ہٹ میں جو کہ ایک انگریز سیاح نے اُس دن مکانیت کی تنگی کی وجہ سے خالی کر دیا تھا، ویکفیلڈ رہنے لگا برستی بارش میں خود اس کی مرمت کرنے کے باوجود بھی اُس کے اندر بارش ٹپکتی رہی۔دو ہفتوں تک یہ عذاب برداشت کرنے کے بعد جب دھوپ نکل آئی تو سیاح خوشی خوشی گلمرک کے نظاروں کا لطف اُٹھانے لگے گلمرگ میں انگریزوں کیلئے ایک چھوٹا چرچ بھی تھا۔گلمرگ

میں کرکٹ کھیلنے کا میدان بھی تھا۔گھوڑا سواری کا مقابلہ کرنے کا انتظام تھا۔جولائی اوراگست کے دوران گلمرگ انگریزوں کی ایک چھوٹی سی کالونی بن جاتی تھی۔ ویکفیلڈ نے کھلن مرگ جاکر وہاں کی سیر کا حال بھی لکھا ہے اورگلہ وانوں کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ یورپی سیاحوں کے علاوہ کشمیر کا رزیڈنٹ Resident بھی گرمیوں کا موسم گلمرگ میں گذارتا تھا۔ ویکفیلڈ حاجی بل، گھنئی پورہ اور دیگر دیہات سے ہوتے ہوئے پٹن اور پھر سرینگر واپس چلا جاتا ہے۔

ویکفیلڈ جنوبی کشمیر میں:۔

ویکفیلڈ نے جنوبی کشمیر میں تقریباً تمام اہم مقامات دیکھے ہیں۔وادی لدر اور برنگ وادی میں آنے والی سیاحوں کی دلچسپی کی جگہوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔سرینگر سے اسلام آباد تک بذریعہ ڈونگہ سفر کرنے کے دوران پاندریٹھن ، پانپور، شار ، تودو، کھنہ بل اور دیگر مقامات دیکھے ہیں۔پاندریٹھن کی تواریخی اہمیت بیان کی ہے اور پانپور میں زعفران کی کاشت کے بارے میں تفصیلات تحریر کئے ہیں۔ اسلام آباد سے بھون اور بمہ زوہ جاتے ہوئے کچھ تواریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں بھون کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہندووں کیلئے بہت مقدس ہے۔بمہ زو میں موجود غاروں کا خصوصی تذکرہ بھی کیا ہے۔ ویکفیلڈ نے اُمرناتھ گپھا اور شولنگ کے بارے میں دوسرے مصنفوں اور سیاحوں کی کتابیں پڑھ کر کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں تاہم لکھا ہے کہ ہم نے اُمرناتھ گپھا تک سفر نہیں کیا۔نوبوگ وادی، واڑونوادی، کشتواڑ، شوپیان، رزلووادی، ویری ناگ چشمۂ اچھ بل، چشمہ کوکر ناگ اور ندی نالوں کے بارے میں بھی ویکفیلڈ کی معلومات بہت دلچسپ ہیں۔

سیاحوں، سفر کرنے والوں اور افسروں کے لئے ہدایات:۔

کشمیر میں یہ خوش کن رواج ہے کہ سیاح کے یہاں پہنچنے کے ایک دن بعد مقامی ایجنٹ مع اپنے نوکروں کے پہلی بار مہاراجہ کی طرف سے حاضر ہوکر سیاح کو خوراک ، میوے، ایک بھیڑ یا ایک بکری پیش کرتا ہے اور خوشامدید کہتا ہے۔اس

ملک کے حکمران کی یہ نوازش صرف زندہ سیاحوں کیلیئے ہی نہیں ہے بلکہ اگر کسی سیاح کی موت واقع ہو جائے تو دفنانے سے پہلے مہاراجہ کی طرف سے اس کیلیئے ایک شال بھیجا جاتا ہے جس میں مُردے کو لپیٹ لیا جاتا ہے۔ انگریز سیاحوں کیلیئے ایک میڈیکل آفیسر بھی ہے، عبادت کیلیئے چرچ بھی' تاہم آفیسروں اور سفر کرنے والوں کیلیئے رہنمانہ اصول وضع کیئے گئے ہیں۔ یہ اصول اور ہدایات حکومت پنجاب نے مہاراجہ کی حکومت کیساتھ مشاورت کے بعد جاری کیئے ہیں جن کا اطلاق مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زیرِ قبضہ علاقہ جات میں سختی سے کیا جاتا ہے۔ یہ ہدایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱/ یورپی سیاحوں کو صرف چار راستوں سے کشمیر جانے کا اختیار ہے۔ شُملہ سے کشمیر جانے کیلیئے سیاحوں کو، پہاڑیوں کے اُوپر جانے والے راستے کیلیئے، حکومتِ پنجاب سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ باقی تمام راستوں سے جانا منع ہے۔ جموں سے بانہال روٹ کے ذریعے کشمیر جانے پر سپریم گورنمنٹ نے، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خصوصی عرضداشت کی وجہ سے روک لگائی ہے۔ جو راستہ راجوری سے اکھنور اور اکھنور سے کشمیر جاتا ہے، وہ مہاراجہ کے اہل وعیال اور اُس کی افواج کیلیئے مخصوص ہے اس لئے اس راستے سے جانا بھی منع ہے۔

۲/ ہر ایک آفیسر یا مسافر کو، جو کشمیر جانے والا ہو، چاہیئے کہ وہ سفر شروع کرنے سے پہلے سامان ڈھونے کیلیئے کافی تعداد میں ٹٹوؤں اور خچروں کا انتظام کرے۔

۳/ مزدوروں کے ساتھ روزانہ معاملہ طے کرنا چاہیئے جس طرح ہمارے اپنے صوبوں میں کیا جاتا ہے، ایک مزدور کا بوجھ پچیس سیر سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ پہاڑیوں میں خچروں اور ٹٹوؤں کا بوجھ دو من سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مزدور موقعے پر دستیاب نہیں رہتے ہیں، انکو دور دراز دیہات سے اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مسافر کو ایک پڑاؤ پر پہنچ کر اپنی ضروریات کا نوٹس اگلے پڑاو پر بھیجوانا چاہیئے۔ یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ ضرورت کی

چیزیں ایک لمحے میں مہیا ہو سکیں گی۔ اطلاع کی پیشگی فراہمی اُن مسافروں کیلئے زیادہ ضروری ہے جو اپنی رخصت Lave بچانا چاہتے ہوں اور کبھی کبھی اُن کو دو دو پڑاو طے کرنا ہوں گے، ایسے معاملات میں لازماً دُوگنا کرایہ ادا کرنا چاہیئے۔

۵/ کشمیر سے واپس چلے جانے پر مزدوروں اور خچروں کو اپنے ساتھ مہاراجہ کے ملک کی سرحدوں سے پرے نہیں لے جانا چاہیئے۔

۶/ آفسروں کو مقررہ جگہوں پَر پڑاو ڈالنا چاہیئے ورنہ سپلائی نہیں آئے گی، گاؤں کے اندر داخل ہونے یا وہاں خیمے نصب کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔

۷/ سپلائیز، مزدوروں، سامان ڈھونے والے حیوانوں سے متعلق مقامی حکام کے نام مناسب خدام کے ذریعے اطلاع بھیجنی چاہیئے لیکن کرایہ اور قیمت خود خدام کی حاضری میں ادا کرنی چاہیئے۔

۸/ کارداروں، تھانیداروں اور کوتوالوں دیگر ملازمین یا مہاراجہ کے نوکروں کے کام میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے، خاص مجبوری کے مواقع کے بغیر اُن کو بُلانا نہیں چاہیئے۔ چیزوں کی جو قیمتیں مانگی جائیں اُدا کرنی چاہیں۔ نرخ اگر بہت زیادہ ہوں، بعد میں سرینگر پہنچ کر اس کی رپورٹ اس آفیسر کو دی جائے جو اِس کام کیلئے مقرر ہے۔

۹/ ہر ایک پڑاو پر مسافروں کے سامنے ایک کتاب پیش کی جائے گی، مسافروں کو اس کتاب پر اپنا نام، عہدہ، مقام اور آمد کی تاریخ کا اندراج کرنا ہوگا۔

۱۰/ شکار پر جاتے وقت سامان اور سپلائی ساتھ لینا ضروری ہے، مقامی لوگوں کو شکار ہانکنے کے کام پر لگانے کیلئے دباو نہیں ڈالنا چاہیئے۔

۱۱/ مشکلات اور جھگڑوں کی صورت میں حکام، سپاہیوں اور مہاراجہ کے ملازموں کے ساتھ اُلجھنے سے گُریز کرنا چاہیئے۔ مقامی نوکروں پر مکمل اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اکثر انہیں اپنے مقاصد کے تکمیل کی پرواہ ہوتی ہے۔

۱۲/ اگر افسروں کے ساتھ بد سلوکی کی جائے یا کوئی اُن کے منہ لگ جائے تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے موقعہ پر موجود حاکم کے پاس شکایت درج

کرنی چاہئے اور فوراً معاملہ سرینگر میں موجود آفیسر کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے۔

۱۳/ آفیسروں کو مہاراجہ کے دربار میں یا اس کے ڈیلیگیٹوں کی عدالتوں میں اُس کے ایجنٹوں کے پاس سیدھے شکایت نہیں کرنی چاہئے۔

۱۴/ آفیسروں کو یاد رکھنا چاہئے وہ ایک دُور دراز مطلق العنان اور آزاد سلطنت کے دُور دراز Dominion میں محض سیلانی ہیں، وہ مہاراجہ کے متعلقین کے ساتھ عزت اور شرافت کے ساتھ پیش آئیں، مقامی قوانین اور رواج کے مطابق چلیں۔

۱۵/ آفیسروں کو مہاراجہ کی اجازت کے بغیر اُس کی رعایا میں سے کسی کو اپنی خدمت میں رکھنے، اپنے ساتھ لے جانے یا اپنے کمپوں میں رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ اجازت اور پاسپورٹ مہاراجہ کے تعینات کردہ حکام کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۱۶/ کشمیر سے چلے جانے سے پہلے تمام بقایاجات ادا کردینے چاہئیں۔

۱۷/ آفیسروں کو چاہے کہ کسی قسم کا تحفہ قبول نہ کریں۔ قیمت ادا کیے بغیر رسید اور سپلائی وغیرہ حاصل کرنا منع ہے۔

۱۸/ آفیسروں کو چاہئے کہ اپنی چیزوں کے ساتھ مقامی کاریگروں کی چیزیں ملا کر کسٹم ڈیوٹی سے بچنے کی کوشش نہ کریں، ایسا کام کرنے والوں کیخلاف قانونی طور سزا ملے گی، سیول یا ملٹری سروس والے لوگوں کی شکایت سپریم گورنمنٹ کے سامنے رکھی جائے گی۔

۱۹/ کبھی کبھی اگر مہاراجہ کی دعوت قبول کی جائے تو دعوت میں بے تکلفانہ لباس پہن کر یا شب خوابی والے لباس میں نہجانا چاہئے

۲۰/ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی آفیسر یا سیاح کی رپورٹ حکومت پنجاب کو پیش کرے جو اِن قوانین اور اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہو۔

۲۱/ اگر کسی آفیسر کو اصولِ آداب، شائستگی، مقامی قوانین اور رسوم کی خلاف

ورزی کا مرتکب پایا جائے یا کوئی بداخلاقی کرتا پایا گیا، سرینگر میں آفیسر آن سپیشل ڈوٹی کو اختیارات دئے گئے ہیں کہ وہ اس آفیسر کو بلا کر مہاراجہ کی سلطنت کے حدود سے چلنے جانے کا حکم دے، سپیشل آفیسر کے حکم پر پوری طرح عمل کیا جانا چاہئے۔ تین تجربہ کار آفیسروں پر مشتمل عدالت میں جو کہ سپیشل آفیسر ہی قائم کرے گا، پہلا جرم کرنے والے کو اپیل کرنے کی اجازت ہوگی، ان افسروں کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ دوسرے جرم کے ارتکاب پر سول آفیسر کے حکم کیخلاف اپیل کی جا سکے گی۔

ٹی ایچ تھورن ٹون

سکریٹری، حکومت پنجاب

سیاحوں کیلئے مقامی رہنمایانہ اصول:۔

سیلانیوں کیلئے یہ رہنمایانہ اصول حکومتِ پنجاب کی منظوری کے بعد شائع کئے جاتے ہیں۔

ا۔ جو سیاح قلعہ اور محل خانہ دیکھنے کی خواہش رکھتے ہوں اُن کو اپنے ارادے کی اطلاع اُس بابُو کو قبل از وقت دینی چاہئے جو یورپی سیاحوں کی دیکھ ریکھ کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔

۲۔ اندرون ملک جانے کے خواہشمند سیاحوں کے تین گھنٹے قبل بابُو کو اطلاع دینی چاہئے، ایسا نہ کرنے کی صورت میں بابُو بوجھ ڈھونے کا انتظام کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

۳۔ عزت مآب مہاراجہ کے ملک کی حدود کے اندر گائے اور بیل ذبح کرنے کی کسی بھی حالت میں اجازت نہیں ہوگی۔

۴۔ قصبے میں، باغِ دلاور خان میں، نشاط باغ میں شالیمار باغ میں اور چشمہ شاہی کے مقام پر کسی بھی سیاح کو قیام پذیر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ سرینگر میں سیاحوں کے قیام کیلئے مندرجہ ذیل جگہیں مقرر ہیں: نسیم باغ، رام منشی باغ، ہری سنگھ باغ اور چنار باغ۔

۵/ سیاحوں کے نوکروں کو اگر رات گئے اندھیرے میں پایا گیا یا شام کے بعد اگر کوئی نوکر روشنی ساتھ لئے بغیر پایا گیا تو پولیس اس کو گرفتار کرے گی۔ اصل میں شام کی توپ داغے جانے کے بعد سیاحوں کے نوکروں کو آوارہ پھرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶/ سیاحوں کے نوکر اگر مقرر شدہ بیت الخلا چھوڑ کر دوسری جگہوں پر حاجت بشری کیلئے جائیں، انہیں سزا دی جائے گی۔

۷/ گھاس کاٹنے والوں کو اُن باغات میں یا اُن باغات کی ہمسائیگی میں گھاس کاٹنے کی جازت نہیں ہے جن میں سیاح قیام پذیر ہوں۔

۸/ تمام کشتیاں دریا کے بائیں کنارے لنگر انداز ہوں گی، کسی بھی کشتی بان کو رات کے وقت دریا کے دائیں کنارے ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۹/ ڈل کا دروازہ بند ہونے کے بعد کوئی سیاح دروازے کی رُکاوٹ کو دُور کرنے کی بندھ کے اوپر سے اور جھیل میں سے کشتیاں اُٹھانے کی کوشش نہیں کریگا۔

۱۰/ جھیل کے ساتھ ساتھ تختِ سلیمان سے شالیمار باغ تک سیاحوں کو شکار کھیلنے کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ یہ علاقے صرف مہاراجہ کیلئے مخصوص ہیں۔ مندرجہ ذیل پرائیویٹ علاقہ جات میں بھی شکار کھیلنے کی جازت نہیں ہے:۔

دوباتہ، گُسکی والا، مچھی پورہ، دانا چکر، اوڑی اور بونیار۔

۱۱/ بگلوں کا شکار کرنے کی کسی سیاح کو اجازت نہیں ہوگی۔

۱۲/ مندرجہ ذیل جگہوں پر کسی سیاح کو مچھلیاں پکڑنے کی اجازت نہیں ہے:
سرینگر میں پہلے پُل تک، مارتنڈ، ویری ناگ، اننت ناگ، کھیر بوانی۔

۱۳/ سیاحوں کے قیام کیلئے مہاراجہ نے مکانات بنوائے ہیں؛ شادی شُدہ سیاحوں کے لئے مُنشی باغ میں اور غیر شادی شُدہ سیاحوں کے لئے ہری سنگھ باغ میں، مہاراجہ کیلئے اُس کے پرائیویٹ مہمانوں کیلئے سِول سرجن، ڈسپنسری اور لائبریری کیلئے مخصوص مکانات کو چھوڑ کر باقی مکانات بابُو کے ذریعے سیاحوں کو الاٹ کئے

جاتے ہیں۔

۱۴ار سیاحوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ مقامی اصول وقوانین اور مروجہ رواجوں پر پوری طرح عمل کریں۔

ڈبلیو، ہینڈرسن
آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی، کشمیر

ویکفیلڈ نے کشمیریوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سب کے ساتھ آسانی کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے، سیرت وکردار اور جسمانی صفائی یا پہناوے کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ بھول جاتا ہے کہ وہ یہ ریمارکس ایک غلام قوم کے بارے میں تحریر کررہا ہے، غلامی کا خاصہ ہے کہ وہ کسی قوم کے افراد کو بزدِل، بے غیرت اور نہ جانے کیا کیا بناتی ہے، انگریز سیاح کو پوری طرح تواریخِ کشمیر پر نظر نہیں تھی۔ اسی لئے للتادت۔ اُونتی ورمن، اننت دیو، مبارک خان بیہقی، کاجی چک، یوسف شاہ چک، یعقوب چک وغیرہ بہاروں اور اُن کے جاں نثار فوجیوں کا تذکرہ نہیں کرسکا ہے جنھوں نے ہر موقعے پر دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ تعجب ہے کہ علم وادب کے بارے میں ویکفیلڈ نے لکھا ہے کہ کشمیریوں کے پاس فخر کرنے کے لائق کچھ نہیں۔ یہ اس موضوع سے متعلق اس کی کم علمی کی بولتی تصویر ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اسلام کشمیر میں بزورِ بازو پھیلایا گیا، لکھ کر اس نے تواریخی حقائق سے لاعلمی کا ثبوت دیا ہے۔

☆☆☆

ارجن دیو مجبورؔ ☆

''کشمیر''---ینگ ہسبنڈ

کشمیر کی جادوئی خوبصورتی، لاکھوں سال پُرانے پہاڑوں کی کشش، یہاں کے قدرتی مناظر کا بے پناہ حُسن، یہاں کے لوگ، طرزِ تعمیر، فنونِ لطیفہ اور نہ جانے کیا کیا بیرونِ ملک کے سیاحوں کو صدیوں سے دعوتِ دید دیتا آیا ہے۔

برنیر پہلا یوروپین عالم اور سیاح تھا جو ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا۔ اُنہوں نے یہاں کے علم، فلسفے اور ثقافت پر کافی کام کیا۔ مورکرافٹ پہلا انگریز سیاح تھا جو ۱۸۲۳ء میں کشمیر آیا اور یہاں کی جغرافیہ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھا۔ ۱۸۸۷ء میں ینگ ہسبنڈ (Young Husband) نے کشمیر کا دورہ کیا۔ وہ یوروپ کے رہنے والے تھے اور بے شمار تکالیف برداشت کرتے ہوئے کشمیر پہنچے۔ وہ اس بارے میں اپنی کتاب ''کشمیر'' میں رقمطراز ہیں:-

''اس سے قبل کہ میں کشمیر پہنچا سبھی کپڑے اور جُوتے پھٹ چکے تھے۔ میں ایک وسطِ ایشیائی پہناوا پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اُونچے مقامی جوتے پہنے تھے۔ میں اس وقت تک پیکینگ (چین) سے چار ہزار میل کا سفر طے کر چکا تھا۔ میں نے ۱۹ ہزار فٹ اونچے ''مست گاہ'' درّے کو عبُور کر لیا تھا اور اسطرح اس درّے کو پار کرنے والا میں پہلا یوروپین تھا۔ یہ درّہ منجمد برف کی ڈھلان اور پتھریلی چٹانوں سے پُر تھا۔ میں اور میرے

267/12-تالاب سیلیاں- اُدھمپور

ساتھ پانچ نوکر اور قلیوں نے پگڑیوں اور لمبے چغوں کی مدد سے اپنے آپ کو لُڑھکا کر سفر طے کر لیا۔ درّے کے دوسری طرف آ کر میرے پاس معمولی سفری سامان بچا تھا۔ ان میں ایک بستر اور ایک چائے کی کیتلی تھی۔ ان سب چیزوں کو میں نے درّے کے دوسری طرف دھکیل دیا تھا۔ کھلی جگہوں پر سوتا رہا اور میرے پاس اب کوئی نقدی بھی نہیں تھی۔ جب میں کشمیر کی حدود میں داخل ہوا تو مجھے بلتستان کے گورنر پنڈت رادھا کرشن کول سے پیسہ اُدھار لینا پڑا۔ کول ایک ہر دلعزیز اور ذی عزت افسر تھے۔ جو اَب بھی مہاراج (پرتاپ سنگھ) کے تحت بحیثیتِ چیف جج کام کر رہے ہیں۔''

ینگ ہسبنڈ کو بعد میں ۹۱۔ ۱۸۹۰ء میں چین، تُرکستان اور پامیر کے ایک سیاسی مشن پر بھیجا گیا تھا۔

راولپنڈی کا راستہ

ینگ ہسبنڈ کا کہنا ہے کہ راولپنڈی ریلوے سٹیشن سے سرینگر تک ۱۹۶ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ ایک کارٹ روڈ تھی۔ مسافر ٹانگے سے یہ سفر دو سے چار دن میں طے کرتا تھا۔ جو ٹانگہ انگریزی ڈاک (English Mail) لینے پر مامور تھا وہ صرف ۳۶ گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کرتا تھا۔ بیل گاڑیاں یہ سفر ۱۴ دن میں طے کرتی تھیں۔ جہاں تک اِکّے کا تعلق ہے اس میں بستر وغیرہ اور نوکروں کو ۶ سے ۸ دن تک سرینگر پہنچایا جا سکتا تھا۔ راستہ بے حد خراب تھا اور جب بارشیں ہوتی تھیں تو پسیاں گر آنے کی وجہ سے سڑک کے کچھ حصے کٹ کر رہ جاتے تھے۔ ہر ۱۴ میل کے بعد ایک ڈاک بنگلہ قائم تھا اور سجے سجائے کمرے کا یومیہ کرایہ صرف ایک روپیہ تھا۔

راستے کے بیچ جو اہم پڑاؤ تھے اُنکے نام یہ ہیں:-

سنی بینک (یہ جگہ پہلگام جیسی ہے، یہاں برف گرتی ہے اور کئی انگریز سیاح یہاں آ کر لطف اندوز ہوتے تھے)۔

کوہالہ (یہ وہ جگہ ہے جہاں دریائے جہلم سمٹ کر دو پہاڑوں کے بیچ سے

گذرتا ہے اور یہاں ایک بڑے پتھر کی مدد سے پُل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں دریائے جہلم کی چوڑائی دس بارہ گز سے زیادہ نہیں۔ کناروں پر چائے خانے اور چھوٹے ہوٹل موجود تھے)۔

اسکے بعد ڈُلائی، دومیل، گڑھی، چکوٹی، اوڑی، رام پور، بارہمولہ اور پٹن کے بعد سرینگر پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ راستہ جنوری، فروری اور مارچ کے چند روز برف کی وجہ سے بند رہتا تھا اور سال کے دیگر مہینوں میں کُھلا رہتا تھا۔ اگر مری کا راستہ برف کی وجہ سے بند ہوتا تو اِیبٹ آباد کا راستہ استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔ بارہمولہ سے سرینگر کا سفر دو سے تین دِن میں بذریعہ کشتی طے کیا جاتا تھا۔

سرینگر میں ٹھہرنے کے بارے میں ینگ ہسبنڈ لکھتے ہیں کہ یہاں کوئی ڈاک بنگلہ نہیں، البتہ "نیڈوز ہوٹل" میں ٹھہرا جاسکتا ہے۔ ہاوس بوٹوں میں ٹھہرنے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ۷۰ سے ۱۰۰ روپے تک ایک ماہ کے لئے ہاوس بوٹ میں ٹھہرنے کا بندوبست ہے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ہاؤس بوٹ آج سے (۱۸۸۷ء) بیس سال قبل مسٹر ایم ۔ٹی ۔ کینارڈ (M.T. Kennard) نے یہاں رائج کیا۔

باہر کی ایجنسیوں کی بہتات نہیں، فقط کوکس اینڈ کو (Cox & Co) پنجاب بینکنگ کمپنی اور "کاک برنز ایجنسی" (Cockburns Agency) یہاں کام کرتی ہیں۔

تفریح کے مقامات

سیاحت کے لئے جو مقامات اہم سمجھے جاتے ہیں اُن میں سرینگر کے علاوہ اُچھ بل، ویری ناگ، لِدرویلی، پہلگام، کولہائی گلیشر، اُمرناتھ گپھا، اننت ناگ، بجبہاڑہ، شادی پور، وانگت کے کھنڈرات، گاندربل لیک، وادی سندھ میں سونہ مرگ، ڈلرجھیل، بانڈی پور اور تراگ بل اہم ہیں۔ تراگ بل درّے سے، جو بارہ ہزار چھ سوفٹ بلند ہے، نانگا پربت کا جو چھبیس ہزار (26,000) فٹ بلند ہے،

نہایت دِل کش منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ تراگ بل سے گلگت اور ہونزا کو راستہ جاتا ہے۔ سونہ مرگ سے زوجیلا درّہ پار کر کے بلتستان پہنچا جاسکتا ہے۔

سرینگر

اگر چہ سرینگر شری نگری سے بنا ہے اور وِتستا کا ایک نام شری بھی ہے، ینگ ہسبنڈ سرینگر کو سورج کا شہر (City of sun) کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق اس شہر کی آبادی صرف ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ اس شہر کے بارے میں اُنکی خواہش ہے کہ کاش یہ شہر ہاس پور کے کریوے پر یا پامپور کے مغرب میں ہوتا۔ لیکن پھر بھی جہلم کے دونوں کناروں پر آباد یہ شہر بے حد خوبصورت لگتا ہے۔ دریا سے نہریں اور آبی راستے مختلف جگہوں پر شہر کے اندر تک جاتے ہیں۔

شہر کی خوبصورتی اور دریائی جلوس کا ذِکر اس طرح کیا گیا ہے۔ ''شہر کے دونوں طرف لکڑی سے تعمیر کئے گئے مکانات، جن میں کچھ اونچے اور کچھ کم اونچائی کے ہیں، ایک دوسرے سے مختلف طرز کے ہیں۔ لیکن جب دریائی جلوس نکلا تو اِن مکانوں کے ڈالان ٹھساٹھس بھر گئے اور مکانوں کی کھڑکیوں سے مرد، عورت بچے سب جلوس کا منظر دیکھنے میں منہمک ہوگئے۔ شاہی جلوس کے وقت کئی مکانوں سے خوبصورت شال لٹک رہے تھے۔ شہر کا بے حد خوبصورت منظر موسم بہار میں دکھائی دیتا جب کہ مکانوں کی چھتیں ہرے گھاس، نازُک پھولوں اور گُل لالہ سے چمچما اُٹھیں''۔

شہر کے پُل

''ساتویں پُل کے قریب یارقند سرائے، تاتاری نقوش کے یارقندی باشندوں سے پُر تھی۔ میں اکیس برس قبل ایسی ہی پوشاک پہنے سرینگر پہنچا تھا۔ چھٹا اور دیگر پُل عام طور پر بڑے شہتیروں کو عمومی صورت میں ایک دوسرے سے جوڑ کر تعمیر کئے گئے تھے۔

تیسرے پُل کے قریب شاہ ہمدان کی مسجد ہے جو قریب قریب ناروے کے طرزِ تعمیر سے میل کھاتی ہے۔ اِس کے چار کونوں پر (لکڑی کے) زیورات سے

لٹک رہے ہیں۔

تیسرے پُل کے پرے ہندوؤں کا اہم مندر ہے اس کی طرزِ تعمیر بالکل مختلف ہے اور پتھر کا بنا ہے اور اس کی بنیاد میں دریا کی طرف ہندوؤں کے پُرانے مندروں کے پتھر ڈالے گئے ہیں۔

یوروپی بستیوں میں نیڈو، ریذیڈنسی، ڈاکٹر نیلو ہاسپٹل، مُنشی باغ شامل ہیں۔ شنکر آچاریہ کا مندر شِو سے منسوب ہے۔ کبھی یہ سمجھا جاتا تھا یہ مندر ۲۲۰ برس قبل مسیح کا ہے لیکن اب یقین کیا جاتا ہے۔ یہ مضبوط بنیادوں پر بنا ہوا ہے اور اس تک جانے والی سیڑھیوں میں، بقولِ آرل سٹائن گوپادتیہ کے تعمیر کے پتھر لگائے گئے ہیں۔ موجودہ تعمیر بعد کی ہوسکتی ہے۔ یہ مندر مکمل ہندو طرزِ تعمیر پر بنا ہے۔ مندر چکور اور کونوں پر کھلی جگہیں بنی ہیں۔ یہ دیگر سب ہندوں مندروں کی طرح بڑے بڑے تراشے لمبے پتھروں سے بن رہا ہے۔

ڈل جھیل

''ڈل کے کنارے ایسے باغات ہیں جن میں بازار بنے ہیں۔ مقامی کشتیوں میں جن میں مختلف پیداوری اشیاء ہوتی ہیں، اِس جھیل کے بیچ سے اکثر گذرتی ہیں۔ کشتی کے پچھلے کنارے پر کوئی ہانجی یا اُسکی بیوی یا کوئی اور عورت بیٹھ کر کشتی کو نہایت ہنرمندی کے ساتھ آگے بڑھانے اور ڈائیریکشن دکھانے کا کام کرتی ہے۔

کئی طرح کے چھوٹے رنگیلے پرندے (King fisher) پانی کو چھو کر اُڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاندار سُنہری پوشنول (Coriol) ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر اُچھلتے کودتے دیکھے جاسکتے ہیں ۔ کشمیری چیلٹ (Chalet) مکانات کناروں پر ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں اور آئینے کی طرح چمکتے ڈل کے پانی میں لٹکے سے دکھائی دیتے ہیں۔ میوہ باغات میں پیڑوں پر گلابی اور سفید پھولوں کی بہار ہے۔ ان کے قرب وجوار میں پیلے پیلے تلہن کے کھیت قطار

درقطار کھڑے ہیں۔ گائیں، اُنکے بچھڑے، بھیڑ اور اُنکے میمنے تازہ ہری گھاس چر رہے ہیں اور خوبصورت لیکن گندھے بچے، ''گل ہنس'' اور بطخ و بطخیں پانی میں ڈُبکیاں لگا رہے ہیں۔

ڈل جھیل کا پانی ساکن اور اتنا صاف وشفاف ہے کہ اردگرد کے پہاڑ اِس میں اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی بڑا آئینہ ہو۔ پانی کی تہہ میں خودرو پودے، رنگ برنگی مچھلیاں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ دُور ڈل کے کنارے پر نشاط اور شالامار کے شاہی باغات ڈل کے پانی سے بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاندار کشتیاں آہستہ آہستہ ڈل کی شیشے نُما سطح پر چل رہی ہیں۔ اِن میں کچھ بیچی جانے والی اشیاء سے مُزیّن ہیں، کچھ میں مچھیرے بیٹھے ہیں اور کچھ میں چھٹیوں کا لُطف لینے والے سیر بین گیت سنگیت کے ذریعے اپنی خوشی کا اِظہار کر رہے ہیں۔

جولائی اور اگست کے مہینے میں دو ہاتھ سے جُڑے ہوئے کنول کے رنگین اور نازک پُھول، کِھل پتروں کے بیچ جھیل کی خوبصورتی کو دُوبالا کرتے ہیں اور انہیں دیکھنے شہر سے لوگ جوق در جوق ڈل کی سیر کو آتے ہیں۔

ڈل گیٹ سے نسیم باغ تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ یہ جگہ ایک کیمپنگ گراونڈ (Camping ground) کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور یہاں سے قدرت کے بے نظیر نظارے دیکھے جاسکتے ہیں۔

ینگ ہسبنڈ مغل باغات کو دیکھ کر مغلوں کے ذوقِ انتخاب کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اَچھا باغ وہی ہوتا ہے جو قدرت کی رنگینیوں، پہاڑوں، جنگلوں اور کھیتوں کے بیچ دِلکش کا موجب ہے۔

نشاط باغ

'' اِسے جہانگیر نے تعمیر کیا تھا یہ کوئی ۶۰۰ گز لمبا ہے اور سات چورس ٹیریسز (Terraces) میں بٹا ہے جو ایک دوسرے کے اُوپر موزوں ڈھنگ سے بنائی گئی ہیں۔ باغ کے بیچوں بیچ پانی کی ایک نہر بہتی ہے جس کے بیچ آبشاریں اور

فوارے بنائے گئے ہیں۔ باغ چناروں سے مزیّن ہے جو سرسبز جگہ پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ داخل ہونے والی ڈیوڑھی نئے طرز کی بنی ہوئی ہے لیکن یہ اتنی خوبصورت نہیں ہے۔''

یہاں پر ینگ ہسبنڈ کہتے ہیں کہ ہزار افسوس کی بات ہے اس بے حد خوبصورت جگہ کو شالامار باغ کی طرح محرابدار تعمیروں (Pakilion) سے سجایا نہیں گیا ہے۔ یہ جگہ پارٹیوں اور سیر و تفریح کے لئے ایک مثالی جگہ ہے۔

ریذیڈنسی گارڈن [1]

اس باغ میں عمدہ انگریزی پھول اُگے ہوئے ہیں۔ چوڑے اور وسیع گھاس کی پٹیاں (Lawn) اتنی صاف اور ہموار ہیں جتنے انگریزی لان (Lawn) ہوتے ہیں۔ سبھی انگریزی پھل جیسے ناشپاتی، سیب، آڑو، چیری (گلاس)، اخروٹ، توٗت، رس بھری شتابری وغیرہ یہاں موجود ہیں۔ چناروں پر بے شمار پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کو ایک خاص دلکشی عطا کرتے ہیں۔ آگے چل کر وہ بے شمار پھولوں کے انگریز نام گِناتے ہیں اور کہتے ہیں ''۲۱ اور ۳۱ اپریل کو بھی میں نے یہاں برف گِرتے دیکھی ہے۔ پوشنول (Coriol) کو ۲۶ مئی کے روز آتے دیکھا ہے اور چناروں پر ہاتھ کی شکل کے پتے مئی کے پہلے ہفتے میں نمودار ہوتے ہیں۔''

آیئے اب اہم سرینگر کی دُنیا سے نِکل کر پہاڑوں اور جنگلوں کے بیچ عالمی شہرت کے مقامات کے بارے میں اُس زمانے کا منظر دیکھیں جو ینگ ہسبنڈ کی دُوربین آنکھوں نے آج سے ایک صدی سے زیادہ پہلے دیکھا تھا۔

گُلمرگ

اس مشہورِ عالم، قابلِ دید برفانی کھیلوں کے مقام کے بارے میں وہ کہتے ہیں:- ''گلمرگ (پھولوں کے لمبے میدانوں کی جگہ) جس کا اصلی نام ''گوری مرگ'' ہے اور جو سرینگر سے ۶۲ میل کی دوری پر واقع ہے، ایک دن سارے ہندوستان کا کھیل کا میدان ہوگا۔ (آج یہاں نہ صرف ہند کے سیلانی آتے ہیں

[1] موجودہ ایمپوریم گارڈن (ا-د-م)

بلکہ بیرونی سیاح یہاں برف پر پھسلنے کے کھیلوں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں)۔ کشمیریوں کے موٗجب اور میری نگاہ میں بھی گلمرگ آج ویسی سیر گاہ نہیں رہی ہے جیسی یہ کافی پہلے رہی ہوگی۔ کبھی بھی گلمرگ میں دو دِن کے منظر ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر روز ایک نیا ماحول، ایک نئی خوبصورتی اور وسعت آنکھوں کو دعوت دیتی ہے۔ اگر چہ جنگل میں یہاں کئی راستے بنے ہوئے ہیں لیکن نظریں جا کر دامنِ کوہ تک پہنچ ہی جاتی ہیں اور پہاڑوں کے دامن، دریا، جنگل کے چھوٹے خطوں، دیہات کے جُھنڈوں، جن میں توت، اخروٹ اور ناشپاتی کے پیڑوں کے ساتھ مکی اور دھان کے کھیت اُبھرتے ہیں اور دُور بارہمولہ سے وُلر جھیل کے نیلے پانیوں سے بھرے ماحول کو نانگا پربت کی اُونچائیوں تک لے جاتی ہیں۔ اس میں دریائے جہلم کا روپہلا پانی وُلر میں داخل ہوتے بل کھاتے ہوئے دِکھائی دیتا ہے۔ ایک وسیع نیلا سمندر آسمان کی نیلاہٹوں سے مِل کر دیودار کے پیڑوں تلے کھڑے مجھے اپنی گرفت میں لے بہتا ہے۔

گلمرگ میں سب سے اچھا وقت ماہ ستمبر ہوتا ہے جب کہ بارشیں ختم ہوگئی ہوتی ہے اور خزاں کی بھینی بھینی ہوا کے جھونکے محسوس کئے جا سکتے ہیں''۔

سندھ وادی

دریائے سندھ بہت پُرانے دریاؤں میں شامل ہے اور یہ مانسرو ور سے نکلتا ہے۔ اسکی ایک شاخ سونہ مرگ کے راستے وادی میں داخل ہوتی ہے۔ اس دریا کا ذِکر ویدوں، پُرانوں اور کئی تواریخوں میں آتا ہے۔ سندھ کی اس چھوٹی وادی میں سونہ مرگ جیسا صحت افزا مقام آتا ہے۔ جیسے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ ایک سونے (Gold) کا میدان ہے، اس کی دید سے آنکھیں چمکتی ہیں اور ہواؤں سے بقولِ شاعر ؎

اگر مُرغ سوختہ جانے کہ در کشمیر آید
گر مرغِ کباب است با بال وپَر آید

سونہ مرگ سے بال تل کے راستے اُمرناتھ کی گپھا تک جانے راستہ پہلگام والے راستے سے کم فاصلے کا ہے لیکن یہاں سے جو چڑھائی شروع ہوتی ہے وہ مُشکل بھی ہے اور عمودی بھی۔

سونہ مرگ سے کوئی پندرہ میل چل کر زوجیلا پہاڑ آتا ہے اور اسکو پار کر کے لداخ اور بلتستان پہنچا جاسکتا ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جس سے ۱۸۸۷ء میں ینگ ہسبنڈ وارِد کشمیر ہوئے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں"سرینگر سے ۱۴ میل کی دوری پر گاندربل کی جھیل آتی ہے اور یہ ہرمکھ پہاڑ کے دامن میں بے حد خوبصورت جھیل ہے۔لولاب کشمیر کی وادی کا مغربی سرا ہے اور یہ جگہ دِلکش اور خوشگوار جنگلوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں سوپور سے آگے پہرو دریا تک کشتی سے جایا جاسکتا ہے۔ یہاں سے کشتی میں دو دِن کے اندر'اُوت گُل' (Awatkula) پہنچا جاسکتا ہے۔ وہاں سے کپواڑہ کو راستہ جاتا ہے جو آٹھ میل لمبا ہے اور یہاں سے ایک اور خاص مقام لال پور بارہ میل کی دوری پر واقع ہے۔"

وادیٔ لِدر (Lidar valley)

"اسلام آباد سے ڈیڑھ میل کی دوری پر (فاصلہ پانچ کلومیٹر کا ہے) بھَون (مٹن) کا قصبہ آتا ہے۔ یہاں ایک بڑا چشمہ ہے اور قرب وجوار میں چنار کے درخت ہیں۔ یہ چشمہ وِشنو کا پوِتر مقام ہے اور یہاں کے براہمنوں کے قبضے میں ہے۔ اُن کے پاس کتابیں ہیں (بہی کھاتے) جن پر ۱۸۷۲ء سے سیاحوں کا حسب ونسب درج ہے۔

'لِدروَٹ' ایک پُرکشش کیمپنگ گراونڈ ہے جس کے اِرد گرد درختوں کے حلقے ہیں۔امرناتھ کی گپھا پہلگام سے کوئی ۴۱ میل کی دوری پر ہے۔ یہ سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ گپھا جپسم (Jypsum) کی بنی ہے اور یہ دہانے پر ۵۰گز چوڑی اور ۵۰ گز لمبی ہے بیچ میں گپھا کی چوڑائی ولمبائی ۳۰ فٹ ہے۔"

آیئے اَب یہ دیکھیں کہ کشمیر کے لوگوں کے بارے میں ینگ ہسبنڈ کیا کہتے ہیں:-



کشمیری پنڈت خاتون اپنے مخصوص لباس میں



''ساری ریاست کی آبادی (اُس وقت) اُنتیس لاکھ پانچ ہزار پانچ سو اُٹھتھر (2905,578) ہے اس میں سے صوبہ کشمیر کی آبادی ۱۱لاکھ ۵۷ ہزار تین سو چُرانوے(11,57,394) ہے۔ ہندوؤں کی آبادی 81017 ہے۔ کشمیر صوبے میں مسلمانوں کی آبادی %93اور ساری ریاست میں %74 ہے۔''

کشمیری پنڈت

''کشمیر میں مقامی ہندوؤں کو کشمیری پنڈت کہتے ہیں۔ کشمیر کے پنڈت اپنی ذہانت، دانائی، صداقت پسندی اور ہوشیاری کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ برہمن کا کام، علمی وادبی تحقیق اور ''مُنشی گری'' کا پیشہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن زندگی جینے کیلئے انہیں دِماغ کے بدلے ہاتھ یعنی محنت مشقت کے کام کرنا پڑتے ہیں۔ اسطرح وہ زراعت، باورچی، نانبائی، حلوائی، درزی یا کوئی بھی تجارت وغیرہ کا کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر چہ پنڈت شہر میں رہتے ہیں لیکن ان کی نصف آبادی مختلف دیہات میں سکونت پذیر ہے جو پیشے کشمیری پنڈت اختیار نہیں کرتے وہ ہیں:-

موچی کا کام، ترکھان، مستری، میوہ فروش، بڑبھونجے کا کام، ہانجی اور کُمہار کا پیشہ''۔

عام کشمیریوں کو ینگ ہسبنڈ اگر چہ باہمت نہیں مانتے لیکن وہ اُن کا تعلق اسرائیل سے جوڑتے ہیں۔ یہ اُنکی اپنی رائے ہے لیکن کشمیریوں کے اچھے اوصاف کے بارے میں وہ کہتے ہیں:-

''ان کی اچھی عادتوں میں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ وہ عقلمند ہیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے کئی اشیاء کی تخلیق کرتے ہیں۔ (اُنکا اِشارہ کشمیر کی مختلف صنعتوں اور دستکاریوں کی طرف ہے۔) آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ بقولِ لارنس کشمیری بہترین کاشتکار ہیں، خاص کر اُس وقت جب وہ اپنے لئے کام کر رہے ہوں۔ ایک کشمیری خاص پٹو بُن سکتا ہے، اعلیٰ درجے کی ٹوکریاں بنا سکتا ہے، اپنے لئے مکان بنا سکتا ہے، اپنے چپل خود بنا سکتا ہے، رسیاں بُٹ سکتا ہے اور خرید وفروخت میں ماہر ہے۔ کشمیری اپنی بیوی بچوں پر مہربان رہتا ہے اور طلاق

کے جھگڑے، خاص طور پر دیہات میں عنقا ہی سُنے جا سکتے ہیں۔"

کشمیر کی تواریخ

کشمیر کا یونان سے مقابلہ کرتے ہوئے ینگ ہسبنڈ کہتے ہیں:-

"خوبصورت یونان، سُرخ پہاڑیوں، سمندری ساحل، ناچتے ساگروں اور صاف وشفاف نیلے آسمان کے بیچ یونانیوں نے آباد کیا۔ لیکن کشمیر' یونان سے زیادہ خوبصورت ہے میرے لئے، جس نے دونوں مُلکوں کو دیکھا ہے، کشمیر اپنے بے پناہ مناظر اور قدرتی حُسن کی وجہ سے ایک پوری نسل کو متاثر کر رہا ہے۔ اور ساتھ ہی وہ سوال کرتے ہیں کیا کشمیر نے خود یہ تاثر دیا ہے؟

کشمیر کے طرزِ تعمیر پر بات کرتے ہوئے وہ آگے کہتے ہیں کشمیر کی وادی میں منادر کے کھنڈرات موجود ہیں جو مضبوطی، سادگی اور دیر پائی کے لئے مصری طرز تعمیر کے قریب ہیں۔ اس کے بعد کننگھم (cunningham) کے حوالے سے وہ اِس طرز تعمیر کو شان، صفائی، ان کے خطوط اور خاکے، ان کے حصوں کی وُسعت، تراشیدہ پتھر کے ستونوں، وسیع کھمبوں کی قطاروں، عمارتوں کے آگے تِکونی چھجوں اور چمکتے محرابوں کی وجہ سے مخصوص کشمیری طرزِ تعمیر سے منسوب کرتے ہیں۔

قراقرم پہاڑ اور دیگر اہم چوٹیوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "مست گاہ درّے" کا مطلب ہے برفانی پہاڑ کا درہ۔ اور قراقرم کا مطلب ہے کالی بجری کا پہاڑ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں ہی وہ یوروپین ہوں جس نے اِن دونوں پہاڑوں کو عبُور کیا ہے۔ قراقرم کی چوٹیوں میں چار چوٹیوں K-1، K-2، K-3 اور K-4 کا ذِکر کرتے ہیں۔ ان میں سے 2-k, 28250 فٹ اونچا ہے۔ کنچن چنگا، کنچن سنسکرت ہے جسکا مطلب سونا (gold) ہوتا ہے۔ اس چوٹی کی اونچائی 28146 فٹ ہے۔ مونٹ ایوریسٹ کی اونچائی 29002 فٹ، مکالو (Makalu) کی اونچائی 27790 فٹ، ٹی -45 کی اونچائی 26867 فٹ، دھول گری (Dhaula Giri) کی 26795 اور نانگا پربت کی اونچائی 26620 فٹ ہے۔ اس طرح قراقرم کی

2-K (کے ۔۲) "چوٹی مونٹ ایورسٹ سے دوسرے درجے پر آتی ہے۔"

مارتنڈ کے کھنڈرات

مارتنڈ کے کھنڈرات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ وُسعت اور مضبوطی میں ان کا مقابلہ صِرف مصری تعمیریں کرسکتی ہیں اور صفائی، شان اور پائیداری میں یونانی۔ یہ جگہ پہاڑ پر ہے اور برفانی پہاڑوں کی قطاریں یہاں سے کافی دور ہیں۔ اگر چہ یہ اب بالکل کھنڈر بن چُکا ہے لیکن اسکے یونانی تعمیر جیسے پتھر کے بڑے ستون اِس بات کا خلاصہ کرتے ہیں کہ اُن پرانے کشمیریوں کے بارے میں جانکاری حاصل کی جائے جنہوں نے اوّل اس خاص جگہ کا انتخاب کیا اور دوئم اس وسیع پیمانے پر پتھر کی تعمیر عمل میں لانے کا منصوبہ بنایا۔ آج کل کے کشمیریوں نے اس طرح کی کوئی بڑی تعمیر عمل میں نہیں لائی ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ کافی مذہب پرست تھے کیونکہ اُنہوں نے اس طرح کا کوئی محل یا شاہی تعمیر نہ بنا کر ایک مندر (رصدگاہ) کو ترجیح دی۔

پانڈرتھن (پُرانا ادھسٹھان)

ینگ ہسبنڈ کے مطابق اشوک نے بدھ مت کو ریاستی (State) سطح پر منظّم کیا۔ اُس نے بدھ مت کو جوش و خروش سے دُور دُور کے ممالک تک پھیلایا۔ اور کشمیر میں اُس نے "ستوپا" اور وِہار قائم کئے۔ اور اُس نے سرینگر کی بنیاد ڈالی (حالانکہ سرینگر کو پرورسین دوئم نے بسایا۔ راج ترنگنی)۔ اشوک نے شہر سے دُور کوئی تین میل کے فاصلے پر پاندرتھن کا انتخاب کیا۔ اشوک نے یونانیوں اور مصر سے تعلقات قائم کئے اور اسی سے پتھر کی تعمیروں اور مورت سازی کا دور شروع ہوا۔ پنجاب میں "یونانی، بودھ" آرٹ کا بول بالا ہوا اور یونان کا کشمیر کی تاریخ پر گہرا اثر پڑا۔"

(نوٹ) یہاں یہ بتانا ضروری معلوم پڑتا ہے کہ اگر چہ کشمیر سے متعدد مورتیاں جو بودھ مورتی سازی کے اعلیٰ نمونے ہیں دستیاب ہوئے ہیں اور

یہ نمونے بڑے ممالک کے عجائب گھروں میں موجود ہیں لیکن جہاں تک بودھ عبادت گاہوں کا تعلق ہے، کشمیر میں یہ عبادت گاہیں اس لئے قائم نہ رہ پائیں کہ ان کی تعمیر میں پتھر کی بجائے اینٹ اور لکڑی کام میں لائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ پتھروں کا استعمال کشمیر میں بودھ دَور سے قبل شروع ہوا تھا۔ ہاں چینی، گاندھار اور ہندوستانی طرزِ تعمیر کے اثرات کشمیر تعمیروں میں آج تک نمایاں ہیں۔ (ا۔د۔م)

کنشک، ناگارجن (جس نے بودھ کتب کو پالی سے سنسکرت میں ترجمہ کیا اور جو ہاروَن کے قریب رہتے تھے) مہر گل (جسکی موت وحشی حملوں میں ہوئی) اور للتادتیہ کے بعد اونتی ورمن کا ذِکر سفرنامے میں اس طرح آتا ہے:-

''اونتی ورمن نے ملک کو مضبوطی بنیادوں پر کھڑا کیا۔ اس دور میں جرائم بہت کم تھے اور شراب نوشی عنقا تھی۔ پچاس ہزار روپے تعلیم اور پچاس ہزار سڑکوں کی تعمیر پر خرچ ہوتے تھے۔

1870ء میں 80 سے 100 پونڈ چاول کی قیمت ایک روپیہ اور اِسی ایک روپے میں 12 پونڈ گوشت یا 60 پونڈ دودھ خریدا جاسکتا تھا۔

پیداوار

ینگ ہبنڈ کے مطابق اُنیسویں صدی کے اواخر میں ریشم، زعفران، کاغذ، تمباکو، شراب اور نمک وغیرہ پر سٹیٹ کی اجارہ داری تھی۔ اَناج کی خرید و فروخت بھی سرکار ہی کرتی تھی۔ اناج کی پرائیوٹ تجارت کُھلے عام نہیں ہوتی تھی۔ سرکاری تحویل سے باہر شال کی تجارت پر پابندی تھی۔ اُون، اونی اشیاء پر ٹیکس (Tax) لیا جاتا تھا۔ قصابوں، نانبائیوں، ترکھانوں، کشتی بانوں یہاں تک کہ عصمت فروشی پر بھی ٹیکس عاید تھا۔

سرکار

''اگر چہ ساری ریاست پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکمرانی تھی لیکن کشمیر پر

انگریز گورنر حکومت کرتا تھا۔ مہاراجہ کے ماتحت تین وزیر اور ایک وزیر اعلیٰ کام کرتے تھے اور ایک ہائی کورٹ جج بھی سرکار میں شامل تھا۔ یہ سبھی حاکم انگریز سرکار کے ہوتے تھے اور ان میں سے کوئی کشمیری نہ تھا۔ مندرجہ بالا حاکموں کی تنخواہ 1200 (بارہ سو) سے پندرہ سو (1500) روپے ماہانہ تک ہوتی تھی۔ ان وزیروں کے ماتحت جموں اور کشمیر کے لئے الگ الگ گورنر ہوتے تھے۔ لداخ (معہ بلتستان) اور گلگت کے لئے وزیر وزارت مقرر تھے۔ محکموں میں یوروپی اور امریکن سپیشلسٹ (S-pecialist) وزیروں کے ماتحت کام پر مامور تھے۔ کشمیریوں کی بہت کم تعداد ملازم تھی۔ بہت کم مسلمانوں کو اونچے عہدوں پر رکھا جاتا تھا۔ گورنر کے ماتحت تحصیلدار، نائب تحصیلدار اور نمبردار مقرر تھے۔ قصبوں میں عدالتوں میں منصف تعینات تھے۔ ریاست کی کل آمدنی (مالیہ) ایک کروڑ روپے تھی اور اس میں سے ۴۸ لاکھ سے زیادہ آمدن زمین کے مالیہ سے حاصل ہوتی تھی۔

سر والٹر لارنس کو کمشنر بندوبست مقرر کیا گیا اور اُنہوں نے ریاستی بندوبست کا کام کئی برسوں میں مکمل کیا۔ زمین کی تین اقسام اُنہوں نے مقرر کیں۔ (کہا جاتا ہے کہ وہ تھوڑی سی مٹی چکھ کر اُس زمین کی پیداواری صلاحیت کا اندازہ لگاتے تھے)۔

ابھی تک سارا مُلک نوکر شاہی کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ افسر جہالت اور تباہی والے دور کے باقیات تھے جب کہ خاندان، ادارے اور خود زندگی ہر روز خطرے میں تھی۔ جب کوئی بھی چیز مستحکم اور منظم نہ تھی، جب کہ سب کچھ بدلنے والا تھا اور آدمی سے جو کچھ ہو سکتا تھا، جب بھی ہو سکتا تھا، کرنا پڑتا تھا۔ اس سب کے نتیجے کے طور پر ایک دیانتدار اور عوامی لگن والے شخص کے لئے اُسی طرح بچنے کی صورت نہ تھی جس طرح ایک جنگ میں ایک شیر خوار بچے کی''۔

ینگ ہسبنڈ نے ہر پہلو سے کشمیر کو دیکھا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ کشمیر میں 1877ء سے 1880ء تک ایک خطرناک قحط پڑا جس کے نتیجے کے طور پر آبادی کا ۲/۳ حصہ ختم ہوا اور آدھا سرینگر تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد سرکار نے جو قدم اُٹھائے

وہ اس طرح کے تھے:-

۱) زمین کے مالیے کا اَز سرِ نو جائیزہ لیا گیا۔

۲) وادی میں کارٹ روڈ لانے کا فیصلہ لیا گیا (شاید یہ بانہال کارٹ روڈ کی طرف سے اشارہ ہے)

۳) تجارت پر بھاری ٹیکسوں کو کم کیا گیا۔

۴) تعلیم کی طرف خاص دھیان دیا گیا۔

۵) ریاست میں (جموں سے) ریل رابطہ قائم کرنے کے لئے سروے کی گئی۔ (یہاں یہ کہنا مناسب رہے گا کہ تقریباً 123 برس بعد یہ منصوبہ اب ریاست میں شروع ہورہا ہے)۔

٦) سیلاب سے بچاؤ کے لئے اقدامات کئے گئے۔

پیداواری درآمد برآمد

اس زمانے میں کشمیر کی پیداوار تھی:-

۱) اناج :-شالی (فی ایکڑ 17 من پیداوار) اب یہ پیداوار فی ایکڑ قریب 64 من پہنچ گئی ہے۔

۲) مکی :-(فی ایکڑ یعنی آٹھ کنال میں 11 من کی پیداوار ہوتی تھی اور یہی پیداوار کنڈی کے خشک علاقوں میں فی ایکڑ 8 من تھی)

۳) جو:-اچھی کوالٹی ناپید تھی۔

۴) دالیں:-مونگ،موٹھی اور راجماش۔

۵) تِلھن :-(کشمیری گھی کا استعمال نہیں کرتے) ریپ سیڈ، تِل اور سرسوں۔

٦) اس کے علاوہ کپاس ، تمباکو ، زعفران ، ہاپس (Hops) اکرنتھ (ایک نہ سوکھنے والا پھول)۔

ہاپس (Hops) کی کاشت سوپور کے قریب سرکاری تحویل میں ہوتی تھی۔ شالامار باغ کے پاس ایک فارم جس کا ہند کے گورنر جنرل لارڈ منٹو نے 1906ء

میں افتتاح کیا تھا ''پرتاپ ماڈل فارم'' کے نام سے قائم کیا گیا تھا، جس میں بیج کے مختلف اقسام اور پیداوار بڑھانے کے لئے نئے تجربے ہوتے تھے۔

جنگلات و میوہ دار درخت

۱) دیودار (اس لکڑی کے سلیپر (Sleeper) جہلم کے راستے پنجاب بھیجے جاتے تھے۔ یہ ایک بے حد خوبصورت درخت ہے اور یہ لبنان کے دیودار (Cedar) کی ایک قسم ہے۔ (۲) چیڑ (Pine) (۳) کایرو (Silver fir) (۴) ہارس چسٹ نٹ (Horse chestnut)۔ (۵) میپل (ایک سایہ دار درخت)۔ (۶) بید، سفیدہ، اخروٹ، سیب، بادام وغیرہ۔

چنار کاٹنے کی سخت ممانعت تھی ("اب تو آزادی ہے"؟) چنار کے بارے میں ینگ ہسبنڈ بے حد جذباتی ہوکر کہتے ہیں کہ موسم خزاں آتے ہی اس درخت کے پتے زرد اور سُرخ ہوجاتے ہیں اور جب نیلے آکاش تلے چنار کے پیڑوں کا عکس ڈل جھیل یا جہلم دریا میں پڑتا ہے تو ایک ایسی تصویر اُبھرتی ہے جو سوائے کشمیر کے کہیں ممکن نہیں۔

برآمدی اشیاء

۱) شال:- کشمیر سرکار کو انگریزی سرکار سے ایک معاہدے کے تحت ہر سال چھ جوڑے شال کے برٹش سرکار کو دینے پڑتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید یہ صنعت ہی ختم ہوتی۔ 78-1877 کے قحط نے کئی شالبافوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایم ڈاورن M.Dauveren کئی سال تک اس صنعت سے وابستہ رہے۔ کشمیر شال کی تاریخ مغل بادشاہ بابر کے زمانے تک جاتی رہی۔ (اس سے قبل بھی اس صنعت کا ذکر آتا ہے) ینگ ہسبنڈ کے مطابق پہلا شال جو یورپ پہنچا وہ نپولین نے اپنی ملکہ جوسفائن (Josephine) کو پیش کیا تھا۔

پشم شال

پشمینہ اون سے تیار کئے جانے والے شال بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ پشم

لداخ، تبت، چینی، ترکستان اور اُش ٹرفان (Ush turfan) کے آس پاس سے کشمیر میں برآمد ہوتا ہے۔ 1862ء سے 1870ء تک 25 سے 28 لاکھ روپے کی قیمت کے شالوں کی فروخت فی سال ہوتی رہی۔ جب یہ صنعت عروج پر تھی تو اس سے 25 سے 28 ہزار افراد وابستہ تھے۔ کچھ بہترین شال (پرانے) سرینگر کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ لیکن جاپانی اور چینی شالوں کے مقابلے میں ان شالوں میں اتنی نزاکت اور صفائی و مضبوطی نظر نہیں آتی۔

قالین

شالوں کے مقابلے میں قالین کافی اہمیت پا گئے ہیں۔

ریشم

ریاست میں سرینگر میں دُنیا کا سب سے بڑا ریشم کا کارخانہ ہے اس میں 3300 آدمی کام کرتے ہیں۔ گذشتہ برس (سن نہیں دیا گیا ہے) 19 لاکھ ایک ہزار پونڈ ریشم کی پیداوار ہوئی اور اس برس یہ پیداوار 23 لاکھ 9 سو اُنتالیس (230939) پونڈ تک پہنچ گئی۔

اس کے علاوہ پیپر ماشی، لکڑی پر نقاشی کا کام، ریشم پر کڑھائی، اونی پٹو، ٹوپیاں اور ٹوکریوں کی دست کاری ہوتی ہے۔

سودیشی تحریک کی وجہ سے ایک شکاری سوٹ کی قیمت آٹھ سے بارہ روپے ہوگئی ہے۔

برآمدی تجارت (سن نہیں دیا گیا ہے)

۱) سیب اور ناشپاتی، ہر سال نوے ہزار من برآمد۔

۲) دیگر میوے:- دس ہزار سے بیس ہزار من

۳) اناج:- اس برس (سن نہیں دیا گیا ہے) برطانوی صوبوں میں اناج کی کمی کی وجہ سے دس ہزار سے بیس ہزار من

۴) گھی:- 720 ٹن - کھالیں 350 ٹن۔

۵) تِلہن :- عام طور سے ۱/۵ حصہ تِلہن کی پیداوار برآمد کی جاتی ہے۔اس برس (سن نہیں دیا گیا ہے) 1740 ٹن کی پیداوار ہوئی جس کی قیمت دو لاکھ اکسٹھ ہزار روپے تھی۔

۶) اُون اور اُونی کپڑے :- دو لاکھ روپے کی قیمت کے برآمد کئے گئے۔

۷) ریشم :- 18 لاکھ 44 ہزار دو سو پانچ روپے کی برآمد ہوگی۔

۸) عمارتی لکڑی :- دس سے بارہ لاکھ کی۔

۹) زندہ بھیڑیں :- چار ہزار۔

کشمیر میں درآمدی اشیاء

۱) روئی :- 895 ٹن سے دس سو ستر (1070) ٹن، جسکی قیمت 15 سے 19 لاکھ روپے ہوتی ہے ہر سال درآمد کی جاتی ہے۔ کچھ خام مال مانچسٹر (انگلینڈ) سے درآمد ہوتا ہے اور سرینگر اور دیگر قصبوں کے لوگ اِسے بُنتے ہیں۔

۲) نمک :- گذشتہ تین برسوں میں 112,710 روپے، 119,803 روپے اور 20,451 روپے کا نمک پنجاب سے درآمد کیا گیا۔

۳) چائے (نمکین وقہوہ چائے) سوا ملین پونڈ چائے بقیمت ساڑھے سات لاکھ روپے۔

۴) کھانڈ :- گذشتہ تین برسوں میں 97,931 روپے 62,907 روپے اور 75817 روپے کی کھانڈ درآمد ہوئی۔

۵) دھاتیں :- ہر سال بیس ہزار من بقیمت تین لاکھ روپے

۶) سلے کپڑے دھاگا وغیرہ :- تین لاکھ، فی سال

۷) دوائیاں :- صرف پچاس ہزار روپے ایک برس میں

۸) ہلدی، بوریاں، چمڑا اور شراب :- پچاس ہزار روپے سال میں (اس میں پٹرول اور بیج بھی شامل ہے)

۹) ریشم اور مصالہ جات :- 3/4 لاکھ روپے

۱۰) سٹیشنری، تمباکو، کچی لکری:- تین لاکھ روپے

بجلی

پانی سے بھی حاصل کرنے کی سروے کینڈا میں جنمے میجر ڈی لاٹ بنیر (Major de Lotbinier) نے کی اور اُس نے رام پور کو پاور ہاوس قائم کرنے کیلئے چُنا۔ اُس کا کہنا ہے کہ جہلم کے اُسی پانی کو مختلف مقامات پر پاور حاصل کرنے کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ رام پور تک پانی لے جانے کیلئے ساڑھے چھ میل میل لمبی نہر بنائی گئی۔ پانی کے ایک فلیوم (Flume) سے ریزر وائر تک پہنچایا جاتا ہے اور پھر لوہے کے پائپ سے مشینری تک پہنچتا ہے۔

ینگ ہسبنڈ اکیس برس تک مختلف عہدوں پر کشمیر میں فائز رہے اور اُن کی دُور بین نگاہوں نے یہاں کے جغرافیہ، تہذیب وتمدن، تجارت، لوگ، ثقافت قدرتی مناظر کے علاوہ کشمیر کے پہاڑوں اور چوٹیوں کا بغور مشاہدہ کیا اُس نے کشمیر کے وجود میں آنے کا ذکر کرتے ہوئے زمین کی بناوٹ کے مختلف اَدوار کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جو اس طرح ہے۔

۱) Devomian Period (ڈیوو مین پیریڈ) مختلف زمینی تبدیلیوں کا دور (اس دور میں کشمیر سمندر کے پانی کے نیچے تھا)

۲) آتش فشانی کا دوسرا زبردست دور۔ (کشمیر کے جنوب میں آتش فشانی جزیرے بنے) اس کے نتیجے کے طور پر کشمیر دوبارہ ظہور میں آیا اور ہند سے جُڑا اُبھرا۔ اس دور میں ہند افریقہ سے جُڑا ہوا تھا۔

۳) درمیانی کاربونیفرس دور (Mid carboniferous) کاربن (ایک طرح کا کویلہ)۔ کشمیر دوبارہ سمندر کے نیچے ڈوب گیا اور کئی لاکھ سال کے بعد دوبارہ اُبھر آیا۔

۴) پہاڑوں کا بننا:-

مثال کے طور پر اگر نانگا پربت پہاڑ کے بننے کا زمانہ لیا جائے اور مانا جائے

کہ یہ پہاڑ ایک ماہ میں ایک اِنچ اُونچا ہوا تو یہ چھبیس ہزار چھ سو (26,600) برس میں سمندر کی سطح سے اُبھرا ہوگا۔

جب کشمیر ظہور میں آیا تو یہاں زندگی کے کوئی نشانات نہیں تھے۔ ہوا میں کوئی کیڑا یا پرندہ موجود نہ تھا اور سارے خطّے پر ایک ایسی خاموشی چھائی ہوگی جیسی میں نے صحرائے گوبھی کے ریگستان میں دیکھی تھی اس خاموشی کا خاتمہ کئی ہفتوں کے بعد تب ہوا جب میں ایک نخلستان کے قریب پہنچا جہاں مجھے کیڑوں اور پرندوں کا شور سُنائی دیا۔

کشمیر میں زمینی زندگی کی ابتدا کوئلے کے دور میں بیس مِلین برس پہلے ہوئی۔ ستی سر کا ذِکر کر کے بعد میں کشمیر کے ابتدائی قبیلوں کا دور آتا ہے۔

ینگ ہسبنڈ کا دِل ایک مصوّر، ایک شاعر اور ایک وِچارک (گہرائی میں جانے والا) کا دِل تھا۔ اُس نے کشمیر کے بارے میں پہاڑوں کی خاموشی، حُسن اور بڑھائی کی بات کرتے ہوئے شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں عالمِ بشر سے یہ اپیل کی ہے۔

''کیا ہمیں مکمل طورا پنے حساس کے تناسب کو منظّم کر کے دِل کے چیونٹی جیسے طریق کار کو ترک کر کے، اپنے خیالات کو پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں جیسی پاکیزگی، اِن جیسی لمبائی اور چوڑائی کی وُسعت اور اِن سے چھوتے آسمانوں کی شفافی سے مربوط کرنے کی ضرورت نہیں؟

آدمی چاہے قد وقامت میں (پہاڑوں کے مقابلے میں) کتنا بھی چھوٹا ہو، بہر حال وہ اِس اِرتقائی عمل کا لُبِ لُباب ہے۔ وہ ہر صدی کے بعد قدرت پر نئی فتح حاصل کر رہا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑوں کے مُقابلے میں وہ کتنا چھوٹا ہے اور کس طرح پہاڑ لمحہ بہ لمحہ بڑے ہوتے گئے ہونگے اور کتنا لمبا عرصہ اس میں صرف ہوا ہوگا اور اتنا ہی لمبا عرصہ ابھی انسانیت کے سامنے پڑا ہے، تو کیا ہماری سوچ کو آدمی آیندہ عظمت پر، جسے اُس نے خود ترتیب دینا ہے، بھروسہ نہیں کرنا

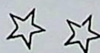
چاہیے۔

ہم ابھی بچے ہیں، ہوسکتا ہے ہم ایک بڑے چھتے پر رینگنے والی مکھیاں ہوں جنہیں اُڑنے کیلئے ابھی پروں کی ضرورت ہے تاکہ وہ آفتاب سے روشن اِس دُنیا کو دیکھ سکیں۔"

ینگ ہسبنڈ اِن ہی فلسفیانہ خیالات کے ساتھ اپنی کتاب (Kashmir) (کشمیر) مکمل کرتے ہیں۔ جیسا اُوپر کہا گیا ہے۔ وہ پہلی بار 1887 عیسوی میں کشمیر آئے۔ وہ ہندوستان میں کئی عہدوں پر کام کرتے رہے۔ اُنہوں نے کشمیر کے ریزیڈنٹ (Resident) کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ لیکن وہ صرف ایک حاکم کی حیثیت سے کشمیر میں قیام پذیر نہ رہے بلکہ اُنہوں نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے کے کشمیر کو بغور دیکھ کر آنے والی نسلوں کے لئے اپنی تحریریں محفوظ کرلیں۔ کشمیر (Kashmir) نام کی کتاب مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو نذر کی گئی ہے کتاب میں مصنف کا نام سر فرنس ینگ ہسبنڈ کے۔ سی۔ آئی۔ ای (Sir Francis Young Hasband K.C.I.E) دیا گیا ہے۔ کتاب کی مصوری (تصاویر وغیرہ) میجر۔ ای۔ فلی نیکس۔ ڈی۔ ایس۔ او (Major E.Mlyneux, D.S.O) نے کی ہے۔

ہمیں ایسے یوروپیئوں کی قدر کرنا چاہئے جنہوں نے کشمیر کے کسی ایک دور کو ہمارے سامنے دیانتداری سے پیش کیا اور اپنی تحریروں سے ساری دُنیا میں کشمیر کے بے پناہ پوشیدہ حُسن، یہاں کی زندگی اور تاریخ کو رقم کر کے سیاحوں کے دِلوں میں کشمیر دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا کی۔

اِس مضمون میں ہوسکتا ہے کہ کچھ باتیں چھوٹ گئی ہوں لیکن مضمون زیادہ لمبا نہ ہو، اِس بات کو مدنظر رکھ کر اہم باتوں کو چُن کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ریاستی اکادمی اِس طرح کے خاص خاص نمبر شائع کر کے ایک اہم اور دیرپا کام انجام دے رہی ہے۔



سید رسول پونپر ☆

سر الیگزنڈر کننگھم

میجر جنرل سر الیگزنڈر کننگھم سکاٹ لینڈ کے شاعر ایلان کننگھم کے دوسرے بیٹے ۲۳ر جنوری ۱۸۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کرسٹس ہسپتال لندن میں پائی ادسکو ںبے (Addiscombe) اور چتھم (Chatham) میں تکمیل کو پہنچائی۔ بنگال انجینئرز (Bengal Engineers) میں سکنڈ لفٹنٹ (Second lieut) کے منصب پر ۱۸۳۱ء میں تقرری ہوئی اور ۱۸۳۳ء کے جون مہینے میں ہندوستان پہنچے۔ ۳۰ر مارچ ۱۸۴۰ء کو مارٹن وہسب (Matin whisb B.S C) کی بیٹی ایلیا ماریا وہسب (Alicia Maria whisb) سے شادی کی۔ یہ وہی مارٹن وہسب ہیں جنہوں نے پنیار (Punniar) کی لڑائی میں دشمن کی توپوں کے دہانے دشمن ہی کی طرف موڑے اور کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ستلج کی جنگ میں ۱۸۴۵۔۴۶ء انگریز لشکر کے ساتھ تھے۔ لداخ تبت سرحدی کمیشن کی سربراہ (Chief of Commission of Ladakh -Tibet Boundary) کی حیثیت سے ۱۸۴۷ء کیپٹن سٹریچے اور ڈاکٹر تھامسن (CApt. Strachey & Thomson) کے ساتھ شمال مشرقی سرحدی علاقہ کا دورہ کیا۔ جسکے دوران اُسے کشمیر کے منادرِ کے محیر العقول آثار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اِس کے بعد ہی وہ ہندوستان کے آثار قدیمہ سے گہری دلچسپی لینے لگے جسکا بیّن ثبوت اُنکی دو تصانیف ''آریائی طرزِ تعمیر۔ کشمیر کے منادر کی روشنی میں'' اور ''لداخ کا تواریخی اور جغرافیائی پس

☆35۔ سیکاپ روڑ بجبہاڑہ۔ کشمیر

منظر'' ہیں[1] چلیانوالا اور گجرات کی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۶۱ء تک ہندوستان کے تعمیراتِ عامہ (P.W.D) میں مختلف مناصب پر فائز رہے۔ وسطی ہندوستان بودھ آثار قدیمہ، لفٹنٹ میزے (LT. Maisey) کے ساتھ ۱۸۵۱ء میں بازیافت کی[2]۔ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء تک برما کے اور پھر ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء تک شمال مغربی صوبہ جات کے (N.W.P) چیف انجینئر (Chief Engineer) رہے۔ دسمبر ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء کے اواخر تک ہندوستان کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے سروئیر کے منصب پر فائز (Arche-ological Surveyor to Govt of india) رہے جسکے دوران انہوں نے آثارِ قدیمہ کے متعلق پہلی دو جلدیں لکھیں۔ ۱۸۶۶ء تا ۱۸۷۰ء دہلی اور لندن بینک کے ڈائریکٹر رہے جسکا مرکزی دفتر لندن ہی میں تھا۔ یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو ہندوستان کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے واپس لوٹے اور ملازمت سے بحسن وخوبی سبکدوش ہوئے یعنی ۳۰ ستمبر ۱۸۷۵ء سے پندرہ سال کی مدت کیلئے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ہندوستانی آثارِ قدیمہ سے متعلق گیارہ جلدیں اِسی مدتِ ملازمت کی مرہونِ منت ہیں۔ اسکے بعد تا دمِ حیات ۲۸ نومبر ۱۸۸۳ء تک آثار قدیمہ سے متعلق پانچ اور جلدیں ترتیب کیں۔ اس طرح اس مجسمِ تجسس وجستجو کے زورِ قلم کے ثمرِ دلپذیر کے طور ہندوستانی آثار قدیمہ کی سروے کے ضمن میں اور سروے کے نام سے کل ۲۴ جلدیں ترتیب پائیں جس میں گیارہ جلدیں بھی شامل ہیں جو اُن کے پیشہ ور معاونین نے اُنکی بالواسطہ نگرانی میں تیار کیں۔ اسکے علاوہ اُس نے ہندوستان کا قدیم جغرافیہ، بودھ عہد (Ancient Geography of India: Budhist Period) ہندوستان کے قدیم سکے (از منہ قدیم سے ساتویں صدی عیسوی تک، مہابودھی (عظیم بودھ مندر) بودھی درخت کے نیچے بودھ گیا میں۔ ہند، ستھیائی

---

1. Ladakh, Physical, Statistical and Historcal: London:Roy, .8 Vo. 1854

2. Essay on the Aryan order of Architecture as exhilited in the temples of Kashmir:Culcutta:8Vo: 1848.

سکے (شاکا اور کشان عہد کے) بعد کے ہند سیتھیائی ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستانی سکے، ودیگر متعدد مقالے ایشیا ٹک سوسائیٹی آف بنگال، رائل ایشیا ٹک سوسائیٹی اور (Numismatic Chroinchle) جیسے مؤقر جرائد میں آثار قدیمہ اور سکوں کو موضوع بنا کر نہایت آب وتاب سے چھپے ہیں۔ سر الیکزنڈر کننگھم کی جملہ تحقیقی قلمی کاوش تمام کی تمام ۱۸۴۸ء سے ۱۸۹۳ء کے درمیان لندن میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ یہ ہے اجمالی خاکہ ایک پیشہ ور ضبطِ حیات کے پابند انگریز، اعلیٰ آرمی انجینئر کی زندگی کا جسکے سر ہندوستانی آثارِ قدیمہ کے بابا آدم ہونے کا سہرا بندھا ہوا ہے۔ قدیم ہندوستان کی تہذیب، تواریخ اُو ثقافت کو سمجھنے میں اُن کی جستجو پیکر کوششیں کلیدی حیثیت رکھنے کی بناء پر نہایت ہی اہم ہیں جنہیں موضوع سے دلچسپی رکھنے والے صاحب الرائے حضرات تہذیب شناس قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سر الیکزنڈر کننگھم تہذیب شناسی کے مقدّس شغل ہی کی بناء پر یاد کئے جاتے ہیں ورنہ ایک اعلیٰ آرمی انجینئر کے منصب دار کی حیثیت سے وہ کب کے اپنے ہی آبائی وطن برطانیہ میں طاقِ نسیاں کی زینت بن گئے ہوتے۔ اُس نے اپنے منتخبہ شعبۂ تہذیبِ انسانی سے کما حقہ انصاف کرنے کی خاطر بلا واسطہ ترجمہ یا بالواسطہ یونانی لاطینی، چینی، پالی اور سنسکرت زبانوں میں دستیاب مواخذ سے بہت حد تک استفادہ کیا اور پھر قلم ہاتھ میں لیا۔ گرانقدر تحقیقی کام انجام دینے کیلئے ایک سپاہی اور آرمی انجینئر، ایک ماہر آثارِ قدیمہ، ایک ضرب (سکہ) شناس ایک جغرافی دان اور سب سے بڑھ کر ایک تہذیب شناس اور تاریخ دان کی حیثیت سے حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ ہندوستان کے قدیم آثار کے مطالعہ سے گہری دلچسپی کا باعث بھی کننگھم کا ۱۸۴۷ء کا سفرِ کشمیر ہوا جب اُس نے کشمیر کے قدیم منادر کے آثار دیکھے جس کے بعد ایک ہی سال کے اندر لندن سے اُسکی پہلی کوشش یہاں کے یعنی کشمیر کے منادر کے طرزِ تعمیر ایک مجلّہ کی صورت میں سامنے آئی، جسکا ذکر پہلے ہی اِس مضمون کی تمہید میں آیا ہے۔ اس کے بعد لداخ کا نمبر آتا ہے جہاں کے گمپاؤں اور ستوپوں کے قدیم طرزِ تعمیر اور تہذیب کے آثار پر اُس کا ایک اور مجلّہ ۱۸۵۴ء میں لندن سے شائع ہوا۔ کچھ بھی ہو کشمیر کے

قدیم تہذیب وثقافت اور طرزِ تعمیر سے اُسکے دل میں عشق کی پہلی چنگاری کشمیر ہی میں روشن ہوئی جو آفتاب بننے میں مسلسل طور مصروفِ عمل رہی اور سر کننگھم نے ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر ثقافتی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا۔۱۸۶۱ء سے ۱۸۲۵ء تک وہ شمالی ہندوستان میں خوب گھوما اور وہاں تہذیبی اور تاریخی مطالعہ میں محو رہا۔ کننگھم خود ہی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا چینی سیاح ہیون سانگ (Yuan Chwong) ہی فقط اُس سے سبقت لے سکتا ہے۔ اُسکے سامنے صرف ایک ہی عظیم آدرش تھا، دنیا کے سامنے یہ بات صراحت ووضاحت سے رکھنا کہ ہندوستان کا ماضی کتنا شاندار ہے۔ کننگھم سے پہلے ویدعہد (Vedicperiod) کے ہندوستانی جغرافیہ پر ایک فرانسیسی عالم اور محقق سینٹ مارٹن (viven de saint Martin) نے ۱۸۶۰ء میں اپنا مطالعہ شائع کیا۔ حالانکہ اس کام کیلئے اُسے رگ وید کے نامکمل فرانسیسی ترجمہ پر انحصار کرنا پڑا۔ اس سے پہلے ۱۸۵۸ء میں اُس نے سکندرِ اعظم کے مورّخوں اور چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرناموں کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا۔ قدیم آثار کی اصل حقیقت جاننے اور مختلف مواخذ میں درج حالات کی تائید وتردید کیلئے کننگھم محولہ مقامات تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا جس کیلئے اُسے دُور دراز جگہوں تک کی مسافت پیدل طے کرنا پڑتی۔ یہاں تک کہ وہ رانی گھاٹ (ٹیکسلا) ودیگر خاص مقاماتِ کارزار تک بھی خود پہنچا جہاں سکندرِ اعظم اور راجہ پورس میں کی لشکروں کے درمیان نبرد آزمائی ہوئی تھی۔ بہت کم لوگ خیالی اور کتابی دُنیاؤں سے اس طرح باہر آکر حقائق کا مشاہدہ کر کے انسانی تہذیب کے خدو خال متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کننگھم نے بصیرت افروز مشاہدے کیلئے تعجب انگیز حد تک ایسے سازگار ماحول کا انتخاب کیا ہے جس میں اُسے یونانی فاتح سکندرِ اعظم کی ہندوستانی مہم جوئی کے مستند حالات اُسکے مورخوں کے قلم سے دستیاب تھے اور چینی سیاح ہیون سانگ جو ہندوستان میں مغرب کے راستے سے ۶۳۹ء میں وارد ہوا اور سب سے پہلے کشمیر میں داخل ہوا اور دو سال یہاں رہا۔ وہ کل پندرہ سال تک ہندوستان کی ثقافتی سیاحت پر رہا اور ۶۴۵ء میں اپنے وطنِ مالوف چین چلا گیا۔ سکندر

اعظم کی مہم جوئی کی واقعات صرف وادئ سندھ تک ہی محدود تھے اور ہیں ۔ کیونکہ یہی وادی اُسکا میدانِ کارزار تھی جبکہ ہیون سانگ ایک تاریخی ،تمدّنی اور ثقافتی زیارت پر سارے ہندوستان میں کابل سے لیکر کشمیر تک گھوما۔ وہ نہ صرف مقدس بودھ وہاروں کی زیارت کیلئے جگہ جگہ گیا بلکہ اپنی مدتِ سیاحت میں بودھ مت سے متعلق دستیاب مقدس مخطوطات جمع کرنے میں مصروف رہا۔ یہی فرق ایک فاتح سیاسی مہم جو اور صاحب بصیرت عالم' فاضل' راہِ حق کے متلاشی' روشنی کے پرستار کے درمیان حدِ فاصل کھینچتی ہے۔ وہ ہندوستان کو نوخطوں میں نہیں بلکہ پانچ خطوں میں بانٹتا ہے اور کشمیر کو بھی بجا طور شمالی خطے میں رکھتا ہے۔ اُس کی سیاحت کے وقت کابل قندہار تک کشمیر ہی کی فرمانبروائی چلتی تھی جو کشمیر کے فاتح اعظم للتادتیہ کے عہدِ حکومت میں بہت وسیع ہوئی اور دُور دُور تک جا پہنچی ۔ مقدس ویدوں کے معتبر اور کلیدی جغرافیائی مواخد ہونے میں کسی بھی تہذیب شناس اور تواریخ دان کو تامّل نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کے قدیم دانشوروں اور دھارمک عالموں نے اپنے وطنِ مالوف کو کنول کے پھول سے تشبیہ دی ہے۔ کنول کے پھول کی مذہبی یا دھارمک اہمیت سے سبھی واقف ہیں اسلئے اِس کے آٹھ پتے بھارت کے آٹھ حصے ہیں اور بیچ یعنی زدِ گل کے مرکزی حصہ کو وسط بھارت کی مانند بتایا۔ یا یوں کہیئے کہ ہندوستان کو نُو خطوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہیون سانگ کشمیر کو سلطنتِ کشمیر یا قلمروِ کشمیر کے نام سے پکارتا ہے جو فقط وادئ کشمیر' دریائے سندھ اور چناب کے جُملہ پہاڑی علاقے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ساتویں صدی میں کشمیر کی فرمانروائی دریائے سندھ سے راوی تک پھیلی ہوئی تھی ۔ کلو کانگڑہ کی چھوٹی ریاست دریائے ویاس (بیاس) کا علاقہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے اس کی گرفت سے بچ سکا اور نوّیں صدی کے آتے آتے شنکرورمن کے عہد میں پنجاب کا سارا پہاڑی علاقہ سندھ سے ستلج تک سلطنتِ کشمیر کے زیرِ نگین رہا۔

کسی بھی ملک خطہ مملکت کا جغرافیہ اور حدودِ اربعہ فطری، سیاسی اور تجارتی اور دیگر بنیادوں پر بدلتا رہتا ہے اور جغرافیائی حالات کسی بھی ملک کے باشندوں کے کردار عادات واطوار اور معاشی حالات کا تعین کرتے ہیں۔ سر کننگھم بھی کشمیری

باشندوں کا ذکر ٹھیک اور شائستہ زبان میں نہیں کرتا۔اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے مشاہدات اور تاثرات اُسکے اپنے زندگی کے تجربات اور کشمیریوں سے قائم ہوئے روابط پر مبنی ہیں اور بشری عجلت پسندی کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہیون سانگ کے کہنے کے مطابق سلطنتِ کشمیر کا رقبہ ۷۰۰۰ (سات ہزار) لی یعنی ۱۶۶۶ میل اور آج کے لمبائی کے پیمانوں سے ۲۵۰۰ کلومیٹر تھا۔ جبکہ وادیٔ کشمیر ۳۰۰ تین سو میل ۴۵۰ کلومیٹر تھی اور اب کے ۱۹۴۷ء میں منقسم وادیٔ کشمیر کا رقبہ تقریباً چھ ہزار مربع کلو میٹر ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں ممتاز عرب مؤرخ اور سیاح ابوریحان البرونی کے بیان کے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت کشمیر کی راجدھانی وِتھ (بہت) کے بائیں مشرقی جانب دس لی تقریباً دو میل قدیم راجدھانی ادھسٹھان' پاندریٹھن کے شمال مغرب میں واقع تھی۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ سابقہ ''پاں'' کے معانی بیرون پرانے یا قدیم کے ہیں۔اس کے قریب ترین معانی پانی، یا پانی سے بھرے کیلئے جاتے ہیں۔ پرورسین پورہ کے وجود میں آنے سے کشمیر کی قدیم راجدھانی سرینگر (ی) کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہ راجہ اشوک نے ۲۶۳ سے ۲۲۶ ق م تعمیر کرایا جو آج کے پاندریٹھن سے لیکر تختِ سلیمان کے دامن تک پھیلی ہوا تھی جسکی چوٹی پر کشمیر کا قدیم ترین مندر جیشٹھا رودرا (Jyeshta Rudra) قائم و دائم ہے۔اِسے راجہ اشوک کے بیٹے جلوکا نے بنوایا تھا۔ پانتہ چھوک (Pantachook) پاندریٹھن کے مقام پر وِیتھ پر قدیم پُل کے اور دو اشوکشورا (Ashokes wara) منادر کی تعمیر بھی راجہ اشوک کے منسوب کی جاتی ہے۔ سرینگری کا شہر پانچویں صدی عیسوی میں بھی کشمیر کی راجدھانی کے طور قائم تھا جب پرورسین اوّل کشمیر کا حکمران راجہ تھا۔ جس نے بھگوان شِو کی علامت پرورییشورا (Pravareswara) مندر کے نام سے خود اپنے آپ سے منسوب کی۔ ۶۳۱ عیسوی میں ہیون سانگ کی زیارتِ کشمیر کے وقت یہ شہر یعنی پرورسین پورہ کشمیر کی راجدھانی نہ ہوتے بھی معمور تھا جو ۹۲۱ء تا ۹۳۱ء سے ابھی تک قائم تھا۔ کننگھم کے سفر نامے میں ویجہ بیور کا ذکر بجبہارہ (Bijbiara) یا وجہ پارا (Vijipara) کے نام سے آیا ہے جو ویتھ (بہت Behat) کے دونوں کناروں پر

آباد ہے۔ اسی طرح سُپُر (Super) یا سُپر (Sopur) کے بارے میں بھی درج ہے کہ یہ شہر وِبتھ (بہت) کے دونوں کناروں وُلر کے مغرب میں آباد ہے۔

اسے اصل کا مبوا (Kambuwa) جسے پانچویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسے اونتی ورمن کے وزیر سُیّا نے، جو ایک ماہر اور باصلاحیت انجینئر تھا ۸۸۳ عیسوی میں پھر تعمیر کیا جس پر اِس کا نام (Suyapura) سیا پورا (Suuapur) پڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ اسے ایک اہم قدیم تاریخی مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ ہند ستھیائی راجہ کنشکا نے عیسوی سموت کے ابتدائی ایام میں کنشکا پورا کو آباد کیا جو بگڑتے بگڑتے کانہ پور (Kanipur) ہو گیا۔ یہ گاؤں شہر سرینگر کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور آجکل اسے خانپور کے نام سے یاد کرتے کرتے خانپور سرائے کے نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ یہاں پر مسافروں کے قیام کیلئے ایک وقت ایک سرائے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ نام بھی کانپور ہی کی بگڑی صورت ہو سکتی ہے۔ کلہنھم ہشکار پورہ کا ذکر کرتا ہے جسے ہند ستھیائی راجکمار ہشکایا ہوشکا نے آباد کیا جو راجہ کنشکا کا بھائی تھا۔ ابوریحان البرونی، اسے اُشکرا اور ہیون سانگ ہوسی کیالو (Hu.Se.Kia.Lo) یا ہشکرا کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہاں ایک بودھ وہار (ستوپا) بھی موجود تھا جہاں کشمیر میں مغرب کے راستے سے وارد ہو کر ہیون سانگ نے پہلے حاضری دی۔ ہشکرا ہشکا پورا یا ہشکار ورمل (بارہمولہ) کا قدیم نام ہے جو کشمیر میں بودھ مت کے زوال کے ساتھ ہی اہمیت کھو دیتا ہے اور وک مُل (بارہمولہ) ہی قصبہ کا نمایاں نام بن جاتا ہے۔ وشکر کا گاؤں آج بھی مشرق کی جانب وِبتھ کے کنارے آباد ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی کے بعد تواریخ میں بارہمولہ کا نام ہی آتا ہے نہ کہ ہشکر یا وشکر کا۔ پرہاسپورہ کا شہر سمبل کے قریب کشمیر کے عظم فاتح حکمران کا راجہ للتادتیہ (۲۳-۷۶۰) نے بسایا جو وِتھ کے بائیں کنارے کھنڈرات کی صورت میں آج بھی اپنی عظمت پارینہ کا ترجمان ہے قصبے محلے شہر یا سڑکیں منسوب یا معنون کرنے کی روایت آج بھی جاری ہے۔

عرف عام میں زکر یا زکورہ شہر سرینگر سے تقریباً پندرہ کلومیٹر دور قدیم جشکا پورا

گاؤں کنشکا اور ہشکا کے بھائی جشکا نے آباد کیا تھا۔

پانپور قدیم نام پد ماپورا، راجہ ورہسپتی ۴۴-۸۳۲ء کے وزیر پک ما نے آباد کیا تھا۔ یہ وِتھ بہت کے دائیں کنارے اپنی تاریخی اہمیت کا تاج سر پر رکھے ہوئے ہے۔ یہ آباد قصبہ زعفران کی کاشت کیلئے مشہور ہے۔ چودھویں صدی کی کشمیری شاعرہ اور کشمیری تہذیب ثقافت کی مینارِ اوّل لل دید کا آبائی مسکن بھی یہیں پر ہے۔ لل دید کے نام سے منسوب یہاں کا لل تراگ بھی بہ زبانِ حال پکار رہا ہے کہ مجھے بھی اپنی شناخت کے طور محفوظ رکھو ورنہ تاریخ تمہیں معاف نہیں کریگی۔

راجہ اونتی ورمن ۵۴-۸۳۳ کا بسایا قصبہ اونتی پور، وِتھ "بہت" کے دائیں کنارے شہر سرینگر سے ۲۶ کلو میٹر دور سرینگر جموں قومی شاہراہ کے دونوں جانب وونتی پورہ (اونتی پورہ) تاریخی آثار گود میں لئے آباد ہے۔ سر کننگھم کا اصلی اور گرانقدر کام آثار قدیمہ کے حوالہ سے عظیم ہے جسکی بنیادی اور پہلی تحریک اُسے سرزمینِ کشمیر ہی سے ملی جو ہمارے لئے فخر کی بات ہے۔ اُس طرح جسطرح دوسرے یورپی مشنری عالم فاضل اور دانشور یہاں آکر کشمیری تہذیب کے کسی ایک ہمہ گیر اور منفرد پہلو کو دیکھ کر اُسکی تہہ تک جانے اور اُسکے سبھی پہلوؤں کو کسی حد تک اُجاگر کرنے کے ناتمام مگر اہم کام میں لگ گئے ایک مختصر سے مضمون میں بہت ہی وسیع و دقیق موضوعات کو سمونا بہت ہی کٹھن کام ہے پھر بھی میں نے اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود اس ناچیز کوشش کے ذریعہ سر الیکزنڈر کننگھم جیسے صاحبِ بصیرت تہذیب شناس کی زندگی اور اُس کے کارناموں کے رُخِ زیبا سے ایک ہلکا سا پردہ سرکانے کی سعی کی ہے۔ ہندوستان کا قدیم جغرافیہ (Ancient Geography of India) پہلی بار ۱۸۷۱ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکی قدامت اور قدر و قیمت بھی بڑھ گئی۔ کننگھم کے اس بڑے کارنامے کی افادیت قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کیلئے دن بدن بڑھتی جائیگی۔ اس اہم تاریخی دستاویز کو ظاہر ہے کہ ہر طرح سے مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تحقیق و تجسس کا کام کبھی بھی پورا اور بشری کوتاہیوں سے مبرا نہیں ہوتا جیسا کہ اسیم کمار چٹرجی (Asim Kumar

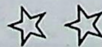


ایک کشمیری کنبہ (۱۹۲۶ء)



اور جمنا داس اختر (Jamma Das Akther) جیسے Chatterjee صاحبِ نظر ہندوستانی تہذیب شناس مؤلفین نے اس کتاب کے ۱۹۷۴ کے ایڈیشن کے ساتھ شامل اپنے گرانقدر اور عالمانہ فکر انگیز تاثرات میں نہایت ہی صریح و بلیغ اشارے کئے ہیں۔ انہوں ایسا کرتے ہوئے بجا طور تحقیقی موشگافیوں کی مستحسن شروعات کی ہیں۔ ایک وسیع و عریض ملک کے جغرافیہ کو ایک چھوٹی سی کتاب میں سمونا ممکن نہیں۔ زیرِ نظر کتاب کے پانچ سو صفحات گیارہ سے بارہ صفحات تک کشمیر کیلئے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ جن میں کشمیر کی جغرافیہ کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کئے جانے کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ ڈل جھیل دریائے ویشو، چھتر کول، دودھ گنگا، معروف درّے گزرگاہیں، شاہرائیں، آمدورفت کے ذرائع، چرند و پرند، درند، جانور پیڑ پودے، قدرتی وسائل، جنگلاتی پیداوار، موسمی حالات، لوگوں کا رہن سہن، لباس عادات واطوار، پھل اور میوے، گھریلو صنعتیں، ماحول و موسم کا اجمالی ذکر بھی اگر سر کنگھم کی اس بڑی کاوش کی حدود سے باہر ہی رہا ہے تو ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک مربوط اور سائنسی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا گیا کوئی جغرافیہ نہیں بلکہ ایک اِشاریہ ہے۔ ہندوستانی آثار قدیم کے باوآدم کا ایک مسلسل بدلتی عظیم انسانی تہذیب کے خدوخال سے شناسائی حاصل کرنے کا۔ سر الیکزنڈر کننگھم ایک عمل پیکر انسان کی پہلی محبت آثار قدیمہ میں چھپی انسانی عظمت پارینہ کی تلاش ہے۔ اسلئے جب وہ انسانی تہذیب کے کسی بھی رخ کی نقاب کشائی کرنے کی سعی کرتے ہیں تو کلیدی زاویہ نگاہ وہی ہوتا ہے جو وہ اَزل سے ساتھ لایا ہے اور جسے جلا بخشنے کا سہرا کشمیر کی مُشاط فطرت و تہذیب ہی کو حاصل ہے جو پتھروں کو بھی ایسی زبان دیتی ہے کہ صاحبِ نطق و نگاہ بھی دنگ رہ جائے۔ بقول غالبؔ۔

ہائے دیوانگیٔ شوق کہ مجھ کو ہردم
آپ ہی جانا اُدھر اور آپ حیران ہونا



پریمی رومانی☆

سر آرل سٹائن اور کشمیر

سرآرل سٹائن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اُن غیر ملکی محققین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے کشمیر کی تاریخ وثقافت، تہذیب وتمدّن اور زبان وادب کے گوناگوں پہلوؤں پر کام کر کے کشمیریات کے شعبے میں نئے دَروازے وا کئے۔ جس خوبی کے ساتھ سٹائن نے اپنے گراں قدر حواشیوں سے کلہن کی راج ترنگنی کو نئے رنگوں سے مزّین کیا اور اَدب اور تاریخ میں اس کی اہمیت متعین کی وہ بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سٹائن کشمیر کے ایک سچّے عاشق تھے جنہوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے کشمیریات کے شعبے میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں کشمیر کے اس غیر ملکی ہستی کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"کلہن اور اس کی راج ترنگنی کا ذکر جب بھی ہوتا ہے تو سرآرل سٹائن کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اسلئے کہ کلہن کو سمجھانے میں جس قدر حصہ اِس غیر ملکی نے ادا کیا وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ راج ترنگنی کے ترجمے کے ساتھ اس کی تاویل اور اِس کے گراں قدر حواشی اس شخص کے علم کام کی لگن، محنت اور ذہانت کا زندہ ثبوت ہیں"۔[1]

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جلوۂ صدرنگ (دوسرا ایڈیشن) ص ۴۳۲

☆ ۳/انصیب نگر۔ جانی پور۔ جموں

آرل سٹائن کا خاندانی نام سر مارک آرل سٹائن ہے۔ وہ ۲۶/ نومبر ۱۸۶۲ء میں ہنگری میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ایک متمول تاجر تھے لیکن سٹائن نے تعلیم حاصل کر کے اپنے آبائی پیشے سے رشتہ نہیں جوڑا بلکہ تحقیق و تجسس کی پُر خار راہوں کو اپنا مقدر بنایا اور اس میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ایک دُنیا حیران ہوگئی۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اُنہیں ہندوستان اور ایران کی کلاسیکی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ یہ دلچسپی بعد میں زندگی بھر اُن کے ساتھ رہی اور وہ علم کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہوئے۔ شروع شروع میں اُن کے تحقیقی کام کی تکمیل میں مشہور عالم اور دانشور ڈاکٹر جارج بہلر کی رہنمائی حاصل تھی لیکن بعد میں جب اُن کا شعور بالغ ہوتا گیا اور اُنہوں نے تحقیق کو اپنی زندگی کا شعار بنایا تو وہ نئے مراحل طے کرنے لگے اور پھر اپنی صلاحیت اور محنت کو ہی اپنا رہنما بنایا۔ موتی لال ساقی نے سٹائن کی زندگی کے مختلف مراحل کا خاکہ یوں کھینچا ہے:۔

"ارل سٹین کا جنم ۲۶/ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہنگری کی راجدھانی اپست میں ہوا تھا۔ اُن کے والد نکولس ایک کاروباری آدمی تھے۔ اُن کے کاروبار کا دائرہ اپست سے زمبار تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹین کی ماں کا نام انلس سٹین تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے کرنے کے بعد اُس نے وی آنا، لیزگ اور بتنگن کی یونیورسٹیوں میں باری باری داخلہ لیا۔ ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان سٹین نے ان دانش گاہوں میں ہندوستان اور ایران کی کلاسیکی زبانوں اور نوادرات کا علم حاصل کیا۔ سٹین کو یہ سعادت اسی دوران نصیب ہوئی جب اُس نے مشرقیات کے مشہور عالم ڈاکٹر جارج بہلر کے سامنے زانوئے اَدب تہہ کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر بہلر کی رفاقت میں اُس نے اپنے علم کے ذخیرے میں

قابلِ قدر اضافہ کیا"۔[1]

سٹائن کو نہ صرف تاریخ سے ہی دلچسپی تھی بلکہ وہ فلسفہ سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اپنی اسی فلسفیانہ بصیرت سے وہ زندگی کے حقائق سے ہمکنار ہوئے۔ اُن کے تحقیقی کارناموں کا مطالعہ کرنے سے اُن کی علمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فلسفے کی اعلیٰ ڈگری نے اُن کے ذہن کو کشادہ بنا دیا تھا اور وہ اپنی محنت سے نئی منزلوں کو سر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تاریخ سے اُنہیں بچپن سے ہی دلچسپی تھی۔ فلسفے اور تاریخ کے امتزاج نے اُنہیں ایک نئی ڈگر پر لا کھڑا کر دیا۔

اُرل سٹائن کا ایک اہم کارنامہ کلہن کی راج ترنگنی کی تدوین اور تدقیق ہے۔ اس تصنیف کو کشمیر کی مستند تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۷۸۱ شلوکوں پر مشتمل یہ تاریخی دستاویز کشمیر کی قدیم تاریخ کے پانچ ہزار برس کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے بارے میں خود سٹائن، راج ترنگنی کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:-

"My subsequent visits in Kashmir offered valuable opportunities in both directions. In 1889 I succeded in securing the codex archetypus of all extant manuscripts of the Rajtarangini, and with its help I was able to publish in 1892 my critical edition of the text of the chronicle. In its preface I expressed my intention of embodying the materials I had collected forth in terpretation of the work in the form of a commentary to be published as a second volume."[2]

اُرل سٹائن ایک بیدار مغز اسکالر اور قابل مترجم تھے۔ قیامِ لاہور کے دوران سے کچھ پہلے ہی اُنہیں کشمیر کی تاریخ سے دلچسپی آہستہ آہستہ عشق کا درجہ

۱؎ ہمارا ادب ۸۸-۱۹۸۷ (شخصیات نمبر-۴) ص-۵

2.M.A: Stein: Kashmir Rajatrangini (Vol.1) Page VII)

اختیار کرنے لگی۔ اس لئے وہ راج ترنگنی کا مستند نسخہ تلاش کرتے کرتے ۱۸۸۱ء میں پہلی بار کشمیر آئے۔ یہاں وہ جگہ جگہ گھومے، کشمیر کے دانشوروں اور بزرگوں سے ملاقات کی اور آخر اُن کی سعیٔ جمیل رنگ لائی۔ اپنی اَن تھک محنت، تلاش و جستجو اور مسلسل تگ و دو سے وہ راج ترنگنی کا مستند نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس کی طرف خود اُنہوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اِشارہ کیا ہے۔ اُنہیں اِس شہرۂ آفاق تصنیف کو سنسکرت سے انگریزی میں منتقل کرنے خیال پیدا ہوا۔ سٹائن نے کلہن کے اِس تاریخی کارنامے کو جانچا، پرکھا اور اَپنے ذہنِ رسا سے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں سرگرم رول اُدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر عالمی تاریخ اور اَدب کے منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اس طرح کا منظوم شاہکار آج تک منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ سٹائن نے اپنے گراں قدر حواشیوں اور حوالوں سے نہ صرف ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب، تمدن کلچر اور آرٹ کے مختلف زاویوں کو دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے بلکہ اُنہوں نے گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی کڑیوں کو بھی ملایا ہے۔ اُنہوں نے حقائق کو سامنے لانے میں کوئی فرو گذاشت نہیں کیا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنے ایک مضمون میں سر آرل سٹائن کو کشمیر تاریخ و ثقافت، علم و ادب اور آثارِ قدیمہ کا عاشق قرار دیتے ہیں۔ ایک جگہ وہ ان باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:-

> ''سر آرل سٹائن نے اپنی زندگی کی کئی قیمتی گرمیاں کشمیر میں گذاریں اور اپنے گراں بہاء کارنامے انجام دئے۔ اُرل سٹائن علم، اَدب، ثقافت، تاریخ، آثار قدیمہ اور ایسے ہی دوسرے علوم کے سچے عاشق تھے۔ ۵۲ سال تک محکمہ آثارِ قدیمہ کے ساتھ وابستہ رہنے کے دوران اُنہوں نے علاوہ دوسرے کاموں کے کشمیر اور کشمیر سے متعلق کئی کارنامے انجام دئے اور اِن کارناموں کی تکمیل کے

دوران اُنھوں نے مقامی عالموں اور فاضلوں سے
استفادہ کیا''۔[1]

سٹائن نے زندگی کے آخری دم تک تحقیق و تجسّس کو اپنی منزل بنا کر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ چین، جاپان، افغانستان، ہندوستان، فرانس، ترکستان، انگلستان اور وسطِ ایشیا کے مختلف علاقوں میں بامقصد سیاحت کرتے رہے۔ مختلف عالموں اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین سے ملاقات کی اور مختلف جگہوں پر بہت ہی اہم مخطوطات، مسوّدات اور علمی نسخوں کو تلاش کر کے اُن کا اَزسرِ نو جائیزہ لیا۔ اُنھوں مختلف جگہوں پر جا کر بھوج پتر، کھجور کے پتوں پر لکھی گئی عبارت کو بھی دیکھا اور نئے تحقیقی اَوزار بروئے کار لا کر پُرانے مسوّدات سے ان کا مقابلہ کیا۔

سٹائن اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے مہم باز تھے۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں اپنی ہمت، جوانمردی، اور مصمم ارادے سے بے شمار مشکلات کے باوجود مخطوطات کی دریافت کے لئے دُور دراز ممالک کی سیاحت کر کے ایک بے لاگ سروے کیا جب کہ رسل و رسائل کے وسائل بہت ہی محدود تھے اور ایسی دستاویزات کی بازیافت کی جو مقامی رنگ میں رَنگی ہوئی ہیں۔ موتی لال ساقی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''وسطِ ایشیا کے پہلے تحقیقی دورے کو سٹین نے چینی ترکستان کے جنوبی حصے تک ہی محدود رکھا۔ اس دورے میں اُس نے اپنی زیادہ تر توجہ ختن کی طرف مبذول کی۔ اس دورے کی تفاصیل کو اس نے اپنی کتاب ''قدیم ختن'' میں شامل کیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں چھپ کر بازار میں آ گئی۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اپنے اوّلین دورے کے دوران اس نے قدیم نوادرات اور ہندوستانی، تبتی اور چینی میں لکھے گئے سینکڑوں دستاویزات حاصل

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جلوۂ صد رنگ (دوسرا ایڈیشن) ص ۲۳۴

کیں جن کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلّمہ ہے۔اِن دستاویزات اورنوادرات کی بدولت قدیم ترکستان کے نئے اورنامعلوم گوشے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ چوتھی اور نوّیں صدی عیسوی کے درمیان اس علاقے کی تہذیب اور یہاں کے تمدّن پر ہندوستانی رنگ چڑھا ہوا تھا‘‘۔[۱]

سرآرل سٹائن کی سیاحت اور اُن کے تحقیقی مراحل کی تفصیلات پنڈت رام چندر بالی کے نام تحریر کئے گئے سٹائن کے خطوط سے جا بجا ملتی ہے۔ پنڈت جی کے نام تحریر کئے گئے یہ خطوط تواریخی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور سٹائن کی مصروفیات اور اُن کے اُسفار کے بارے میں بھی جانکاری فراہم کرتے ہیں۔سٹائن کے اِن خطوط سے اِس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اُنہیں وادی کشمیر سے کتنی عقیدت تھی۔ وہ یہاں کے ذرّے ذرّے سے کتنا پیار کرتے تھے۔اُنہیں یہاں کی مٹی کی خوشبو کس قدر عزیز تھی اور وہ یہاں کے قدیم مقامات اور کھنڈرات سے کتنی جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ پنڈت رام چند بالی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

’’میں وادی کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں۔ میرا مقصد قدیم مقامات (Sites) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا تھا تاکہ انہیں راج ترنگنی کے نئے ایڈیشن کے ترجمے میں شامل کرسکوں۔اس لئے اِن تمام قدیم مقامات کی دوبارہ سیاحت کی جہاں گھومنے کی سعادت مجھے ۲۵ سال قبل نصیب ہوئی تھی۔ یہ سیاحت میرے لئے انتہائی دِل چسپی کا باعث ثابت ہوئی‘‘۔[۲]

راج ترنگنی کے علاوہ سرآرل سٹائن نے اپنی زندگی میں جو تحقیقی کارنامے

---

[۱] سون ادب (۸۸۔۱۹۸۷ء) شخصیات نمبر۔۴ ص ۸

[۲] سون ادب (۸۸۔۱۹۸۷ء) شخصیات نمبر۔۴ ص ۲۳

انجام دیئے اُن کا ایک ہلکا سا خاکہ پیشِ خدمت ہے۔

سٹائن کی بعض اہم تصانیف اور سروے رپورٹ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جن میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہونے والی اُن کی کتاب ''قدیم ختن'' کا نام توجہ کا حامل ہے۔ اُنہوں نے اپنی تیسری مہم کے تفصیلات ''Inner most Asia'' کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں درج کئے ہیں جو چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو سٹائن کا ایک اور یادگار کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے "Memoir of Archoe-logical Survey" کے نام سے سٹائن کی ایک اور قابلِ مطالعہ تصنیف شائع ہو چکی ہے، جو اُن کے سفر کے دوران درپیش آئے ہوئے مسائل کے علاوہ اُن کے تحقیقی کام کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ اُنہوں نے وسطِ ایشیا کے دوسرے دورے کی تفصیلات سروے آف انڈیا میں شائع کیں۔ اُن کے ایک طویل مضمون ''Some River names in the Ragveda'' میں وتستا اور چناب کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

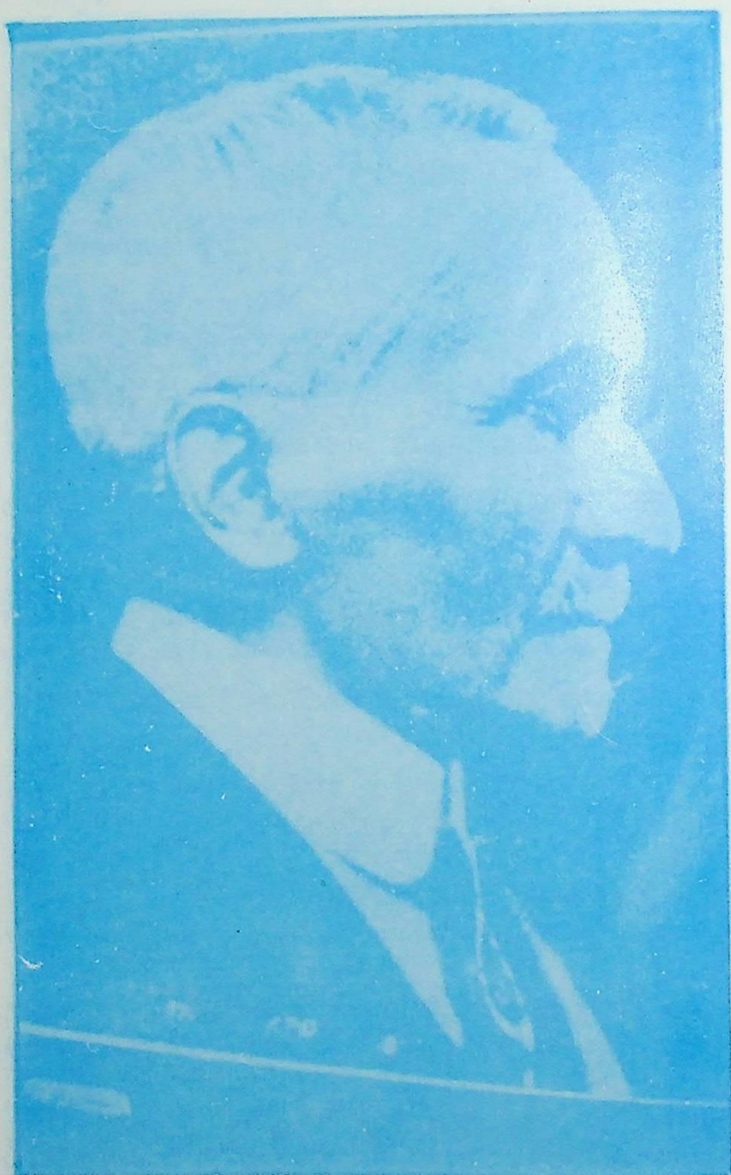
سٹائن کے اور بھی بہت سے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔[1]

1. Marco-polo's accout of Mongolian roads in Kashmir
2.Hatim's tales. 3. Memoir of Maps Illustrating the ancient Geography of Kashmiri . 4. Kashmir English Dictionary (2 Vol). 5.in memorium Pandit Govind Kaul. 6. The castle of Lahore. 7. Identification of Parihaspora. 8. A note on Avantipora. 9. A note on Kashmiri Manuments. 10. Sanskrit deed of Sale Concerning a Kashmiri Maha Bharata. 11. Ancient Geography of Kashmir.

سٹین کو اپنے گوناگوں تحقیقی کارناموں کی وجہ سے بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا۔ رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے اُنہیں سونے کا تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اُنہیں پیڑی میڈل سے نوازا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اُنہیں سونے کا تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ہکسلے ایوارڈ کے مستحق قرار دیئے گئے اور ۱۹۳۵ء میں نوادرات سوسائٹی کا میڈل بھی اُن ہی کے حق میں گیا۔ برطانوی حکومت نے اُنہیں CIE اور KCIE کے اعزازات سے نوازا۔

---

[1] سون ادب (۸۸۔۱۹۸۷ء) شخصیات نمبر۔۴ ص ۳۲



سر آرل سٹائن

INDIAN TEXTS SERIES

HATIM'S TALES

KASHMIRI STORIES AND SONGS

RECORDED WITH THE ASSISTANCE OF

PANDIT GOVIND KAUL

BY SIR AUREL STEIN, K.C.I.E.

AND EDITED WITH A TRANSLATION, LINGUISTIC ANALYSIS, VOCABULARY, INDEXES, ETC.

BY SIR GEORGE A. GRIERSON, K.C.I.E.

WITH A NOTE ON THE FOLKLORE OF THE TALES
BY W. CROOKE, C.I.E.

With a Frontispiece

LONDON
JOHN MURRAY, ALBEMARLE STREET, W.
PUBLISHED FOR THE GOVERNMENT OF INDIA
1923

۱۹۲۳ء میں شائع شدہ ارل سٹائن کی Hatims Tales کے سرورق کا عکس

drāyĕ	hĕth.
she-went-forth	having-taken (them).

" Shĕn-köd-khānan	ṭsöcé	bög^{a}rēmay.
" For-six-prisons	loaves	were-divided-by-me-O.

Satimis	aṭsayō,	bār-Khŏdāyō	hāy."
To-the-seventh	I-will-enter-O,	Great-God-O	alas."

8. Dapān wustād,—
(Is) saying the-teacher,—

Bög^{a}rĕn	yima-ṭsöcĕ.	Dop^{u}nakh,	"khāwand
Were-divided-by-her	these-loaves.	It-was-said-by-her-to-them,	"husband

chum	bĕmār.	Ath^{i}	kyāh	dop^{u}ham
is-to-me	sick.	Therefore	verily	It-was-said-by-them-to-me

pīrav	phakīrav,	'ṭsöcĕ	gaṭshan	bög^{a}rañĕ
by-saints	(and) by-faqīrs,	'loaves	are-proper	to-be-divided

satan-köd-khānan.'	Yih-kĕnṭshāh	dapun	chuwa,
to-seven-prisons.'	Whatever	to-be-said	is-by-you,

tih	dăp^{i}zĕm	yōra	aṭsawunuy.	Ōra
that	you-must-say-to-me	from-here	even-as-I-enter.	From-there

nĕrawun^{u}	kĕh	dăp^{i}zĕm-na,	mĕ	gaṭshi
as I-go forth	anything	you-must-say-to-me-not,	to-me	will-occur

shekh."	Dop^{u}nakh	biyĕ,	"mă	chuh
anxiety."	It-was-said-by-her-to-them	also,	"I-wonder-if	there-is

kāh	köd^{i}	yiti?"	Dop^{u}has	yimav,
any	prisoner	here?"	It-was-said-by-them-to-her	by-them,

رومن نوٹیشن (گووندکول) انگریزی ترجمہ ارل سٹائن

14. The sweeper said to the sweeper's wife, "I shall never remember what I have to do. They expect me to provide leather and a cobbler's laces. They are sending me off, my dear, with a leather-cutter and a cobbler's awl." "Yārkand will we conquer for ourselves."

15. And she replied, "Thou shouldst have answered them, O pimp of a sweeper.[1] Thou shouldst have said, 'I know not how to use them.'" "I did, my sweeperess, say that to them, but they heard me not at all." "Yārkand will we conquer for ourselves."

16. The roll-call was cried for the artisans, and a demand was made for workers in iron. Each came bearing his anvil on his head, and leaning on his tongs as if they were a stick. "Yārkand will we conquer for ourselves."

17. The blacksmiths grumbled and complained, "Where are we to look for coals? How can we aright arrange our smithy?" But somehow or other the officials made a makeshift for them, and set them a-forging horseshoes. "Yārkand will we conquer for ourselves."

18. Very pleased did I become, and mighty good it seemed to me that last of all they impressed the barber and the carpenter (of my village), and that I saw them running after the others each with a kerchief of food in his hand.[2] "Yārkand will we conquer for ourselves."

19. Their wives are holding a conference with each other. Say they, "Who is, then, now to support the barber's wife and the carpenter's wife? We shall have to earn our livelihood by hiring ourselves out for spinning thread." "Yārkand will we conquer for ourselves."

20. Ṣābir Oilman[3] only so much say, so long as they shall pay heed unto the news. At length came the Sāhib with all his retinue, saying, "Yārkand will we conquer for ourselves."

[1] This is really a term of affection, much as we sometimes use abusive words in an affectionate sense, or talk of a "poor devil" in the language of pity.

[2] A thoroughly Kāshmīrī sentiment, quite in keeping with the villager's indifference to the troubles of others. The author was evidently on bad terms with the barber and carpenter of his village (Stein).

[3] The name of the poet.

vātạl^{i} dup vātüjạ bunai serạ za
chim mangān dāle muy tạ ka ।
tōrastạ å̄r h^{y}et m^{y}eti hai pak^{a}nāvān
Yārkand° ॥ 14
(vātij vanān phērit)
phērit dabzạ hek vātạl gānau
dabzi hek ạs^{i}nau zānau ।
dap^{y}āmak vātạj k^{y}ĕ nai chum bōzān
Yārkand° ॥ 15
shumār bōz hai tạ^{i}fạdārạn
mang^{a}lạj ahongārạn ।
vōd^{y}o p^{y}eṭh yiran h^{y}et shrānz dakhe nāvan
Yārkand° ॥ 16
kārau ditti bārau yingar kat^{i} tārau
vān kat^{i} jān shērau ।
hāl kya kur hak nāl garạ nāvān
Yārkand° ॥ 17
khush kya gōsai amōb gau jān
patạ nyūk nāyid chān ।
baṭṭạ daje at^{i} h^{y}et patə chuk lārān
Yārkand° ॥ 18
muslạ hat karān tim^{e} å̄sạ pānevāñy
kusuy kạ^{i}ri nāyiz tạ chān^{y} ।
katạ vạn^{y} kạ^{i}rit hai karau guzrān
Yārkand° ॥ 19
Sābir tilevāñye tāmat yūtuy van
yāmat khabạr bōzan ।
tāny^{e} āụ sāhib bā sō^{i}ri sāmān
Yārkand° ॥ 20

"patimi-pahara an^{i}mat^{i} kuṭ^{a}wālan z^{a}h
"at-the-last-watch (of the night) (were) brought by-the-chief-of-police two

köd^{i}. Tim chih path-kun." Wös^{u}
prisoners. They are at-the-back." She-arrived

yiman-nish. Dopun amis-pananis-khāwandas,
these-near. It-was-said-by-her to-that-her-own-to-husband,

"wuñ kĕtha-pöṭh^{i} mŏkali yiti pātashāh-
"now how will-escape from-here the-king's-

kūr^{u}? Tagiyĕ mŏkalāwüñ^{a} yih pātashāh-
daughter? Is-she-possible-for-thee to-be-released this king's-

kūr^{u}?" Dop^{u}nas am^{i} phīrith, "tih
daughter?" It-was-said-to-her-by-him by-him answering, "that

yĕli tagihēm, ada kyāzi lagahö
when (if) it-had-been-known-how-for-me, then why should-I-have-remained (in)

köd?"
imprisonment?"

9. Dapān wustād,—
(Is) saying the-teacher,—

Koḍun nāla panun^{u} pŏshākh, shunun
Was-taken-off-by-her from-the neck her-own garment, it-was-put-on-by-her

pātashāh-kōrĕ; pātashāh-kōrĕ-hond^{u} koḍun,
to-the-king's-daughter; the-king's-daughter-of was-taken-off-by-her,

shunun pānas. Krünḍ^{u} dits^{u}nas
was-put-on-by-her to-herself. The-basket was-given-by-her-to-her

آرل سٹائن کو کشمیر کی فضا راس آئی تھی ۔ اُنہوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں اور علمی تجربوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں کی خاموش اور پُرسکوں فضاؤں سے گھری ہوئی جگہ مہند مرگ کا انتخاب کیا تھا۔ یہاں اُنہوں نے وسطِ ایشیا اور دوسرے مقامات کے آثارِ قدیمہ کی کھوج کے نتائج پایہ تکمیل تک پہنچا دیئے۔ اس مرگ کے پُر اسرار سناٹوں اور طویل خاموشیوں سے اُنہیں بے حد لگاؤ تھا۔ وہ اپنی آخری سانسیں انہی سناٹوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ افغانستان کی ایک علمی مہم کے دوران کابل میں ۱۹۴۳ء میں انتقال کر گئے لیکن سٹائن کی خواہش کے مطابق رام چند بالی نے مہند مرگ میں سنگِ مرمر کا کتبہ کندہ کروایا[1]۔ اب بھی یہ کتبہ سال ہا سال گذرنے پر بھی اسی مقام پر کھڑا ہے اور کشمیری تہذیب و تمدن ، اَدب اور کلچر سے زبردست دلچسپی رکھنے والے قلم کے اُس عظیم سپاہی کی یاد تازہ کرتا ہے جس کو ساری دُنیا آرل سٹائن کے نام سے جانتی ہے۔

آرل سٹائن نے کلہن کی راج ترنگنی کے تدوین و تدقیق میں جو نمایاں رول اَدا کیا وہ اُنہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ کشمیر کی تاریخ کے علاوہ اُنہیں یہاں کی تہذیب و تمدن ، کلچر اور زبان سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ سال ہا سال تک مہند مرگ کی تنہائیوں میں کیمپ لگا کر کشمیریات سے متعلق تاریخ کے لازوال گوشوں کی تہیں کھولنے پر مُصر رہے اس مہم میں اُنہیں کشمیر کے بعض عالموں ، فاضلوں اور ماہرین آثارِ قدیمہ کا بھرپور تعاون رہا ہے۔ جن میں پنڈت گووند کول کا نام سرفہرست ہے۔ اپنی ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۷ء کی ایک تحریر میں خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''کشمیر سے مجھے جو عشق؟ اس کی تب و تاب (اپنے کام کے سلسلے میں) کشمیر سے دور رہنے پر بھی متاثر نہ ہوئی۔ اسی کشمیر میں مجھے گووند کول کی دوستی کا فخر حاصل ہوا''[2]

پنڈت گووند کول سنسکرت زبان کے جیّد عالم تھے۔ وہ دُنیا کی قدیم روایات

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جلوۂ صد رنگ (دوسرا ایڈیشن) ص ۲۴۹۔
۲. بحوالہ ڈاکٹر برج پریمی: کشمیر کے مضامین ص ۰۶

سے واقفیت رکھتے تھے [۱] اور سٹائن جیسے محقق اور عالم بھی اُن کی علم و دانش سے بہرہ ور ہوتے رہے ۔۔۔۔۔ بلکہ پروفیسر جارج بوہلر جیسے عالم بھی اپنی پہلی ہی ملاقات میں سنسکرت کے اس کشمیری عالم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے جس کا اعتراف اُنہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سنہری الفاظ میں کیا ہے۔[۲]

آرل سٹائن ، گووند کول کی علمیت کے زبردست قایل تھے۔ وہ بار بار اسکا اظہار راج ترنگنی کے دیباچے میں کرتے ہیں۔ وہ کشمیر کے اس باکمال عالم اور فاضل کی محنت، لگن اور خداداد صلاحیت کی داد دیتے ہیں۔ اگر وہ آرل سٹائن کو کلہن کی اُن بے شمار تلمیحوں اور علایم کی وضاحت نہ کرتے جو مہابھارت اور پورانوں میں شامل ہیں تو سٹائن کی تحقیق و ترجمے میں بڑی دشواری پیدا ہو جاتی۔ ڈاکٹر برج پریمی کے مطابق سر آرل سٹائن اور پنڈت گووند کول کا ساتھ گیارہ برس تک رہا۔ اس دوران سٹائن نے وہ تاریخی کارنامہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا جس کی حسرت وہ عرصۂ دراز سے اپنے سینے میں رکھے ہوئے تھے۔

اپنی کتاب راج ترنگنی کے دیباچے میں آرل سٹائن ، پنڈت گووند کول کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"I have already above had occasion to refer to the advantage I enjoyed by being able together valuable information on many Points of the traditional and local lore of Kashmir through Pandit Govind Kaul of Srinagar...... The Identification of Kashmir's numerous allusions to stories contained in the Mahabahrta and purans is mainly his work. I am also indebted to his aid for a preliminary collection of the Lahore manuscript of the chronicle which has enabled me to improve the critical constitution of the text underlying my translation"[۳]

سٹائن کشمیر کی تاریخ اور آثار قدیمہ سے گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے سال ہا سال تک کشمیر کی سیاحت کرتے رہے۔ اُن کا مستقبل قیام مہند مرگ میں ہوتا تھا

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر برج پریمی: کشمیر کے مضامین ص ۶۷ ۲۔ ایضاً ص ۶۵

3.M.A Stein: Kalhanas Rajatrangini Page xxii

جہاں اُنہوں نے بڑے بڑے تحقیقی کارنامے تکمیل کے مراحل تک پہنچا دئے۔ تاریخ کے علاوہ اُنہیں کشمیری تہذیب، تمدن کلچر اور زبان سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ آرل سٹائن کو سنسکرت کے ایک اور عالم پنڈت نتیا نند شاستری سے بھی زبردست عقیدت تھی۔ وہ نہ صرف اس عقیدت کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتے ہیں بلکہ اپنی محفلوں اور اپنے عزیز واقربأ کے نام لکھے گئے مکاتیب میں بھی کرتے ہیں۔ ان مکاتیب میں وہ پنڈت نیتانند کی خیریت ہی دریافت نہیں کرتے بلکہ اُن کی عالمانہ بصیرت کی بھی تعریف بھی کرتے ہیں۔ مثلاً خطوط کے چند اقتباسات:

۱) ''آپ کے خط سے مجھے اُپنے پُرانے کشمیری عالم دوستوں میں سے پنڈت نتیا کی علالت کا حال جان کر بہت دُکھ ہوا۔ میری خواہش ہے کہ جب مئی کے آخر میں کشمیر آؤں تو اُنہیں صحت یاب دیکھ سکوں''

(۵۲/جنوری ۱۹۳۵ء)[۱]

۲) براہ کرم پنڈت نتیا نند سے بہت جلد ملئے اور اُن سے معلوم کیجئے کہ کیا اُنہیں وہ رقم ملی ہو جس کا میں نے اکتوبر اور اب جنوری میں اُن کے لئے انتظام کروالیا ہے۔ یہ انہیں امپریل بینک کے ذریعے ملے گی۔ یہ رقم دراصل انہیں ''ڈان کو یک زٹ'' کے کشمیری اور سنسکرت ترجمے کے معاوضے کے طور پر دی گئی ہے......''

(۱۷/مارچ ۱۹۳۹ء)

۳) ''مجھے پنڈت نیتا نند کے سورگباش ہونے سے بے حد افسوس ہوا......''

(۱۰/جنوری ۱۹۴۳ء)[۲]

سر آرل اسٹائن کی مہم کے ساتھ پنڈت رام چند بالی نامی ایک کشمیری پنڈت کی بھی زبردست وابستگی رہی ہے۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی، بالی پٹ مین سسٹم میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اپنی کارکردگی سے وہ آرل سٹائن کا دِل جیتنے میں

---

[۱] [۲] بحوالہ ڈاکٹر برج پریمی جلوۂ صد رنگ ص (۲۳۹-۲۴۰)

کامیاب ہوئے اور پھر تقریباً ۱۲ سال تک مسلسل سٹائن کے ساتھ وابستہ رہے۔ سٹائن کے ساتھ اُن کے تعلقات نہ صرف بحیثیتِ ایک کلرک کے تھے بلکہ اپنی محنت لگن اور ایمانداری سے وہ جلد ہی اُن کے معتمدِ خاص بن گئے جس کی مثال سٹائن کے اُن خطوط سے ملتی ہے جو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً پنڈت رام چند بالی کے نام لکھے ہیں، چند خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ ان خطوط سے رام چند بالی کے تئیں سٹائن کا خلوص جگہ جگہ عیاں ہے۔ لکھتے ہیں:-

"۱) آپ کا ۱۲ دسمبر کا خط دو ہفتہ قبل ملا۔ جس سے مجھے بڑی مسرّت ہوئی۔ میں اس میں آپ کی تصویر دیکھ کر خوش ہوا۔ شکریہ!

۲) مجھے توقع ہے اگر سب کچھ درست رہا اور کشمیر دُوسری بہار میں آسکا تو مجھے آپ سے مل کر بے اِنتہا خوشی ہوگی۔

۳) میں سرینگر میں تقریباً دو ہفتے قیام کے بعد شمال مغربی سرحدوں کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مئی کے مہینے میں واپس جا رہا ہوں اور دوسرے سال گرمیوں میں مہندمرگ میں کام مکمل کروں گا۔ میں بخیر ہوں اور انگلستان سے باہر بھی بہت خوش گوار وقت گزارا ہے۔ آپ کی صحت اور ترقی کا متمنی ہوں"۔

کشمیر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اُنہیں کشمیری زبان اور یہاں کے کلچر سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ جس کا اظہار اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ عیاں ہوتا ہے۔ لیکن اِن دلچسپیوں کی وجہ بھی وہ کلہن کی راج ترنگنی کی تدوین و تدقیق ہی بتاتے ہیں:-

"کشمیری زبان اور کشمیر کے لوک ورثے کے ساتھ میری دلچسپی کی ابتدا اُسی وقت ہوئی جب ۹۸۔ ۱۸۸۸ء کے دوران میں کلہن کی راج ترنگنی کا تقابل ایڈیشن تیار کرنے اور اُس کا شرح ترجمہ کرنے کے لئے وادی میں قیام پذیر رہا۔ ماضی سے متعلق متعدد سوالات جن کا اس نوع کے کام کے ساتھ گہرا رابطہ ہے اور

جن کو سُلجھانا میرے لئے خاص کشش رکھتا تھا، کی گرہ کشائی کشمیری
و دھوانوں کے ساتھ قریبی واسطہ رکھنے سے ہی تھی۔ ساتھ ہی اس
مقصد کے لئے اس پہاڑی خطے کے روایتی ورثے کے ساتھ رشتہ
بنائے رکھنے کی بھی ضرورت تھی۔ موقع پر قدیم آثار کی چھان بین
کرنا بھی ایک لازمی امر تھا۔''

آرل سٹائن کا کشمیر زبان سے عشق اور لوک ورثے سے پیار اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے اسی لئے جب وہ کشمیریات کے گونا گوں پہلوؤں پر کام کرنے لگے تو اُنہوں نے اوّلین فرصت میں اس زبان کی تہہ داری اور اس کے گرائمر سے پوری پوری واقفیت حاصل کی۔ اس کے بارے میں راج ترنگنی کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:-

From the time when I began my study of the Kashmir chronicle the advice and ready help of professor BUHLER had accompanied my labours. His own researches in Kashmir were my best guide to the materials that were needed for the task and nothing encouraged me more in its execution then the unflagging interest with which he followed it. Realizing from his own Indian experience the Practical difficulties with which I had to conted, he readily helped to secure to me the leisure in dispensable for the work.[1]

آرل سٹائن کے تحقیقی کارنامے کے حوالے سے دو[۲] اور کشمیری اشخاص کا ذکر کرنا لازمی بن جاتا ہے۔ پنڈت گووند کول، پنڈت رام چند بالی، پنڈت نتیا نند شاستری جیسے عالموں، فاضلوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ حاتم نام کے ایک تیلی اور خانسامان علیا کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ 'حاتم کی کہانیاں'' کے نام سے جو کتاب شائع ہوچکی ہے، اس کے سرنامے میں آرل سٹائن' حاتم کے حافظے کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور اُنہیں ایک قابلِ قدر داستان گو قرار دیتے ہیں۔ سر آرل سٹائن کو کشمیر کے اس بلند و بالا پہاڑی کی چوٹی پر یہ مرگ کیسے نظر آئی اور اس مرگ

---

1. M.A.Stein:- Kalhan's Rajtarangini Page XXI

کی خاموشیوں میں ایسی کون سی کشش تھی جس نے کشمیر کے اس غیر ملکی عاشق کو ہزار ہا میل طے کرنے، سختیاں جھیلنے، اور تُند و تیز طوفانوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کیا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ کی جاسکتی ہے کہ سٹائن نے مہینوں اسی مرگ میں کیمپ لگا اپنے کئی تحقیقی مراحل طے کئے اور کشمیریات کے حوالے سے عظیم کارنامے منزلِ مقصود تک پہنچادئے لیکن اُن کے مطابق کشمیریات سے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ان کو ضبطِ تحریر میں لانے کے باوجود بھی ایسے بے شمار اَسرار ہیں جن کی تہوں تک جانے کی ضرورت ہے۔کون جانتا ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسا کشمیر کا حقیقی عاشق پیدا ہوجائے جو آرل سٹائن کے نقشِ قدم پر چل کر کسی اور مہند مرگ کا پتہ لگائے جہاں کشمیریات کے حوالے سے تحقیق کی جائے اور ایسے بے شمار اسرار کھول دیئے جائیں جن میں حقیقی کشمیر مضمر ہے۔آرل سٹائن نے اگرچہ کشمیریات سے متعلق عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھے۔اُن کے مطابق کشمیر کی تہذیب تمدن اور کلچر میں اتنی تنوع مندی اور گہرائی ہے کہ مزید تحقیق و تلاش کرنے کے لئے دل میں کسک پیدا ہوجاتی ہے۔ مہند مرگ کشمیر میں ۱۸رمئی ۱۹۰۰ء میں لکھی گئی اپنی ایک تحریر میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> It is time to collect as carefully as possible the materials still left for the study of old Kashmir and its earliest records. I have spared no efforts to serve this end and in the result of my labours, I hope, there will be found some return for the boons which I own to Kashmir.[1]

سر آرل سٹائن کو مہند مرگ کی مٹی سے بے انتہا پیار ہوگیا تھا جبھی تو انہوں نے اس من پسند مرگ کی ایک چٹان کے سائے میں اس کی خوشبودار مٹی میں جذب ہونے کی خواہش کا بار بار اظہار کیا۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے والہانہ انداز میں کہتے تھے..... ''یہ میری قبر ہے!'' لیکن افسوس اُن کی یہ خواہش پوری نہ

---

1. M.A.Stein: Kalhanas Rajatrangini Page XXIV

ہو سکی کیوں کہ ۸۱ ربرس کی عمر میں وہ افغانستان میں اپنی سیاحت کے دوران کابل میں انتقال کر گئے اور وہیں اُن کی آخری رسومات انجام دی گئیں۔ مہند مرگ سے اُن کے لگاؤ اور اُن کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہ کتبہ مہند مرگ میں نصب کروایا گیا جو آج ۵۰ برس سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اِس عظیم مہم جو کی یاد تازہ رکھے ہوئے ہے۔

مہند مرگ

سر آرل سٹائن نے ۱۸۹۵ء کے موسم گرما میں، جب کہ وہ راج ترنگنی کی تالیف کر رہے تھے، اِس مرگ میں پہلی بار اپنا کیمپ لگایا۔ بعد میں وہ اپنے سفر ہائے عظیم کا حال لکھ رہے تھے تو کئی بار پھر یہاں آئے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہاں سے افغانستان روانہ ہوئے۔ ۸۱ر سال کی عمر میں بمقامِ کابل ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو رحلت کر گئے۔



محمد یوسف ٹینگ☆

لارنس آف کشمیر
کل بھی اور آج بھی

مغرب کی استعماری طاقتوں نے بیسویں صدی کے پہلے پہلے برسوں میں جو کُھل کھیلے انہوں نے اُن کو اپنی فوجی اور حربی پشت پناہی سے بہادری اور شجاعت کا ملمّع پہنا کر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ علمِ تاریخ کا یہ حتمی کلیہ ہے کہ حال پر حکمرانی کرنے والا ماضی پر بھی اقتدار رکھتا ہے اور وہ اس کے بُل بوتے پر ماضی کو اُپنے پسندیدہ رنگوں اور علاقوں میں پیش کرتا ہے اور دُنیا سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ دُنیا کو انہی رنگوں اور علامتوں کی مدد اور معرفت سے پہچانے۔ مرحوم سویت یونین کی بات تو سبھی کو معلوم ہے۔ نئی دہلی کی حال ہی میں رحلت کرنے والی واجپائی سرکار نے بھی ایسا ہی کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ فزیکس کے پُروفیسر مُرلی منوہر جوشی نے اُپنے آبائی پیشے جیوتش یعنی Astrology کے قیاسی مضمون کو یونیورسٹیوں میں ٹھہرایا اور ساورکر جیسے متنازعہ فیہ وِیکتی کی تصویر کو پارلیمنٹ ہاؤس میں مہاتما گاندھی جیسے مردِ مجاہد کی تصویر کے رُوبرو ٹانکنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

تفصیل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

پہلی جنگ عظیم کے ساتھ ہی وسط ایشیا سے جاسوسی، فریب کاری، بہروپ بھرے اور

☆T-3 تلسی باغ، سرینگر

قتل و غارت کی آگ بھڑکانے کے لئے برطانوی محکمہ جاسوسی سے وابستہ ایک شخص تامس ایڈوارڈ لارنس کے چرچے اُس وقت کے ذرائع ابلاغ میں بڑی شان اور سنسنی خیزی کے ساتھ اس طرح کیے گئے کہ جن مغربی آقاؤں کے لئے اُس نے اتنے پاپڑ بیلے تھے اُن کا تو اُسے ہیرو بننا ہی تھا، اُسے مشرق کے ذہنوں میں بھی ایک رول ماڈل کی طرح چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُس کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت دیا گیا کہ اُس نے برطانیہ کے سامراجی عزائم اس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ جن عربوں کو اُس کی ستم رانیوں کا تختہ مشق بننا پڑا وہ اُن میں اتنا گھل مل جانے میں کامیاب ہوا تھا کہ وہ اسے ایک عرب کی حیثیت سے جاننے پہچاننے لگے اور یُوں لارنس آف عربیا کا نام مشہور و معروف ہو گیا۔ اُس نے نہ صرف عربی زبان اَز بر کر لی بلکہ مقدّس قرآن، احادیثِ نبویؐ پر بھی اتنا عبور حاصل کیا کہ وہ انہیں Quote کرتا رہتا تھا۔ اُس نے عربوں کے رہن سہن، لباس، لبادے اور رسوم و رواج میں بھی اہلِ عرب کا سا رنگ ڈھنگ پیدا کر لیا۔ یاد رہے کہ اس قماش کے انگریزوں نے اُس عظیم ٹریجڈی کے تانے بانے اُستوار کئے جسے دنیا آج مسئلہ فلسطین کے نام سے جانتی ہے اور جس کے دریائے خون کی لہریں خود صبح و شام ہمارے ضمیر کی حساس سرحدوں کے ساتھ سر ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ لارنس آف عربیا نام کا ایک بہروپی، جسے بعض حلقے کشمیر سے بھی جوڑنے کے پتنگ اُڑاتے رہتے ہیں، ۱۳ مئی ۱۹۳۵ء میں ایک سڑک حادثے میں کام آیا۔ بعد میں پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں اُس پر 'لارنس آف عربیا' کے نام سے ایک بڑی زبردست ہالی وڈ فلم بنی جسے حال ہی میں سارے وقت کی سب سے بڑی رزمیہ فلم قرار دیا گیا۔ خوش قسمتی سے میں جس لارنس کا ذکر کر رہا ہوں وہ اپنے ہم عصر اور ہم شہر مگر زیادہ بانس پر چڑھائے ہوئے لارنس سے بالکل مختلف خوبیوں کا مالک تھا۔ چونکہ اُس کی خیر پسندی اور انسان دوستی کا تمتع کشمیریوں کو ملا (اور بہت شاندار اور پائیدار انداز میں ملا)۔ اس لئے سامراجیوں کے حافظے میں اس کیلئے کوئی جگہ نہیں نکل سکی۔ وہ آج برطانیہ میں ایک بھولا بسرا شخص ہے اور میں یہ

بات پوری جانچ پڑتال کے بعد ہی لکھ رہا ہوں۔ میں نے اُس کے اور اُس کے پبلشروں وغیرہ کے ایڈریس پر کئی دہائیاں پہلے خط لکھے، یا تو خطوط کا جواب ہی نہیں آیا یا مثلاً اُس کے پبلشروں نے بتایا کہ اُن کے متعلق تمام کاغذی یادداشتیں دوسری جنگ عظیم (1945-1939) میں لندن پر ہونے والی بمباریوں کی نذر چڑھ گئی ہیں۔ اُنہیں سر والٹر روہر لارنس جیسے کشمیر نواز اور دردمند انسان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن سر والٹر نے کشمیر اور کشمیریوں کی ایک نہایت ستم گرانہ مصائب اور مشکلات، بلندی اور پستی، تشویشات اور ترغیبات، کارناموں اور کارستانیوں اور کامرانیوں اور ناکامیوں کا جو بیان دل کے سطور کی تاریں بجا کر ہمارے سامنے چھوڑا ہے وہ اُسے ہم میں سے اکثر لوگوں سے زیادہ کشمیری کہلانے کے مستحق بناتا ہے۔ اُس کی مرمر کی چھوٹی سی مورتی اُس کے جیتے جی ہی اُس جگہ نصب کی گئی تھی جہاں زنانہ کالج امیراکدل کے پاس ہمارے محکمہ مال کا محافظ خانہ ہے۔ لیکن اُس کی خوبصورت یاد ہر پڑھے لکھے اور دردمند کشمیری کے دل کے محافظ خانے میں مسکرا رہی ہے۔ اُسے بجا طور پر کشمیر کے محسنوں اور مربّیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور وہ تاریخ میں لارنس آف کشمیر کے نام سے ہی جانا جائے گا۔ میری اس رائے میں بیسویں صدی کے سب سے ممتاز کشمیری مورّخ شری پی این کے بامزئی (جو اِس وقت بہ فضل تعالیٰ اپنی عمر کے پچانوے برس میں ہی دلی کے کیلاش اپارٹمنٹس میں حسبِ معمول اپنے علمی کام میں مصروف ہیں) میرے ہم خیال ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی سند کی تلاش ضروری نہیں ہے۔ کشمیریوں کی لوک یادوں میں وہ ''لارن صائب'' کے کشمیریا۔ ئ ہوئے نام سے موجود ہیں۔



والٹر لارنس اُن انگریز افسروں کی کھیپ میں ہندوستان آئے جو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (1857) کی ناکامی کے بعد ہونے والے حالات کے بعد بھیجی گئی تھی۔ کمپنی بہادر کا نقاب اُٹھا کر انگریز سلطنت کی ملکہ وکٹوریہ کا راج ہندوستان میں

نافذ کر دیا گیا تھا۔ کشمیر میں مہاراجگانِ جموں نے برطانوی راج کی چھتری کے نیچے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا اور یہاں امن و امان کی سی صورت کا گمان ہونے لگا تھا۔ کشمیر میں مغل بادشاہ اکبر کے راجہ ٹوڈرمل نے پرگنہ ہا وغیرہ کی قدیم بنیاد پر مالیہ کی وصولی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ افغانوں، خالصاؤں اور گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ابتدائی راج میں مسمار ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوستان کے سامنتی اور قبائلی سماج میں نئے اُبھرنے والے علوم کی روشنی میں انسانی انتظام کے کچھ تازہ تصوّرات لے کر آئے تھے اور تصوّرات (Ideas) ہر وقت اپنے آقاؤں کی مرضی پر ہی نہیں چلتے۔ وہ ایک اپنا وجود اور مقصود بھی بن جاتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات (1885ء) کے بعد انگریزوں کی گرفت کشمیر میں مضبوط ہو رہی تھی۔ اُن کا ریذیڈنٹ اَب یہاں اختیار کا اصل مرکز تھا۔ انگریزوں نے 1846ء میں کشمیر جیسی گلبدن اور گُل مشام نازنین کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ اونے پونے داموں یعنی (75 لاکھ نانک شاہی) کے عوض بیچ کر جو داؤ ہارا تھا اِنہیں اب اُس کی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ بیعہ نامۂ اَمرتسر کے تحت کشمیر کو مہاراج کے ہاتھوں بقولِ علامہ اقبالؔ ''دہقان و کشت و جوئے، خیاباں'' کے سمیت بیچ ڈالا گیا تھا اور اَب ساری زمینیں اور سارے درخت ''اندر مہندر سپر سلطنت انگلشیہ'' کی مملکت مانی جاتی تھیں اس لئے مالیہ میں تقریباً ساری فصل وصول کی جاتی تھی۔

چنانچہ حالات ایسے ہوئے کہ یہاں کے کسانوں نے اُن زمینوں کو جہاں سے انہیں پسینے کے موتی بو کر صرف تازیانے اور بھوک کی فصل کاٹنی پڑتی تھی، کھیتوں کو تیاگ کر چوری چھپے پنچال کی زنجیریں توڑنے کے بعد بھاگنا شروع کیا۔ یہی وقت تھا کہ انگریزوں کے مشورے سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1925-1885ء) نے مالیاتی نظام میں کچھ استحکام اور انصاف لانے کے لئے زمین کے بندوبست کا بیڑا اُٹھایا۔ سب سے پہلے سیٹلمنٹ کمشنر بھی ایک انگریز مسٹر ونگیٹ ہی تھے۔ وہ 1886ء میں یہاں آئے۔ یہاں ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنے والے سزاولوں اور شقداروں (مالی نظام کے مختلف کارندے) نے ایسی ہڑبونگ مچا رکھی تھی کہ وہ معمولی اصلاح تو درکنار

اس طریقہ وصولی کو پوری طرح دیکھنے بھالنے کے روادار بھی نہ تھے۔ چنانچہ ونگیٹ کی سفارشات پر ایسا شور بپا کیا گیا جیسے یہاں پر قیامت آ گئی ہو۔ نوکر شاہی کے بڑے طبقے اس طبقاتی لوٹ کھسوٹ کے برابر سے بھی زیادہ حصے دار تھے اور اس میں خویشی، کے رِشتوں سے بھی منسلک تھے۔ لٰہذا کسی کی کچھ نہیں چلی اور ونگیٹ صاحب کی ہیٹ کے پیچھے موقوفی کا بڑا سا بورڈ لگا کر اُنہیں پیرو پار کر دیا گیا۔

اس اہم لیکن نازک مرحلے پر والٹر لارنس کشمیر بھیج دیئے گئے تاکہ وہ ونگیٹ کے خستہ وخراب خیمے کی طنابیں پھر سے محکم کریں اور نئے سیٹلمنٹ کمشنر کی حیثیت سے وہ کر دِکھائیں جو ونگیٹ نہ کر سکے تھے اور پھر بادِ مخالف کا رُخ موڑ دیں۔ یہ 1889 میں ہوا جب دس سال کے بعد لارنس یہاں سے ترقی پر دِلی گئے تو کشمیر کے اُفراتفری کے حالات کے باوجود انہوں نے یہاں کا بندوبستِ اَراضی بڑے سلیقے اور سُتھرائی کے ساتھ کر لیا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا جتن کئے اور ستم سہے اُس کی تفصیل کے لئے مضمون کی تنگی نہیں بلکہ کتاب کی ورق در ورق وسعتیں چاہئیں۔ البتہ یہ بتانا واجب ہے کہ انہوں نے بدنام اور بدآموز بیعہ نامہ امرتسر 1846 پر یہیں ضرب لگاتے ہوئے کشمیر کے کھیتوں پر مہاراجے کی ذاتی ملکیت کا قبضہ کھول کر کشمیریوں کے نام اُن کے انتقال کرنے کے آغاز کیا اور اس طرح سے ایک پیچی ہوئی قوم کی عزت کو بحال کرنے کا پہلا قدم اُٹھایا۔ اُس نے مالیے کی جبری وصولی سے سہمے ہوئے سینکڑوں کشمیریوں کے نہ مانگنے کے باوجود اور مرضی کے خلاف بھی انہیں زمینیں منتقل کیں۔ کوئی نصف صدی کے بعد ہی کشمیری شعور میں اتنی بالیدگی پیدا ہو سکی کہ انہوں نے نعرہ لگایا ع

بیعہ نامہ امرتسر کو توڑ دو کشمیر چھوڑ دو، کشمیر چھوڑ دو

لارنس، کشمیر سے تبدیل ہونے کے بعد مشہور اور تاج محل کو سنوارنے والے انگریز وائسرائے لارڈ کرزن کے پرنسپل سیکرٹری بنے۔ انہوں نے اس اعلیٰ حیثیت میں بھی کشمیریوں کی فلاح کی تدابیر کرنے کی کوششیں جاری رکھیں جس کی تحریری

شہادتیں موجود ہیں۔

والٹر لارنس کی کتاب ''دی ویلی آف کشمیر'' آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کے حقِ اشاعت ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی قزاقی (Piracy) شروع ہوگئی تھی۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن دھڑا دھڑ چھاپنے والے اور جیبیں بھرنے والے ناشرانِ کتابوں پر پہلے ایڈیشن کا سن یا والٹر لارنس کے متعلق ایک معتبر اور تسکین آور دیباچہ تک درج کرنے کی زحمت برداشت نہیں کرتے، جو دوبارہ چھاپ کے مسلمہ بین الاقوامی قاعدوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ بہرحال کتاب کشمیر سے متعلق اِتنے اہم، مستند، معتبر اور بے مثال معلومات اور تجزیات پر مشتمل ہے کہ اِسے ایک سو سال کے بعد بھی شاید کشمیر کا سب سے مستند مختصر انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ (یہ بات صحافی خشونت سنگھ نے بھی لکھی ہے جب کشمیر کے متعلق لکھتے ہوئے یہ کتاب اُن کے زیرِ مطالعہ آئی)۔ اس کتاب کو لارنس کا شاہکار (Magnum Opus) تو کہا ہی جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ اُن کے عظیم معاصر یورپی کشمیر شناسوں کے نام بھی وابستہ ہیں۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات کے مطابق کشمیر کی جغرافیہ، نباتات، پھلوں، پھولوں، آثارِ قدیمہ، لوک ادب، زبان اور لغات وغیرہ سے متلق جو باب اس میں شامل کئے گئے ہیں اُن کے ابتدائی مسودے (Draft) یا تو جارج گیرسن، آرل سٹائن، پادری بنٹن نولز اور الیگزینڈر کنگھم جیسے دیو قامتوں نے تحریر کئے، یا لارنس کے لکھے ہوئے پہلے مسوّدوں پر انہوں نے اپنی اپنی مہارت کی حدود میں تصحیح کی۔ جب ہی تو اس کتاب کے دعوؤں کو مسترد کرنا اس قدر مشکل بنتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے کشمیر کے مورّخِ کبیر حسن شاہ کھویہامی کا دامن بھی وابستہ دیکھا جاسکتا ہے۔ لارنس نے اگرچہ لکھا ہے کہ حسن شاہ کھویہامی کشمیری زبان جاننے کے سلسلے میں اُس کا استاد ہے لیکن اگر اس کو مبالغہ ملیح بھی قرار دیا جائے تو بھی یہ بات بہرحال قرینِ قیاس ہے کہ اس نے کتاب میں شامل جزئیات اور تفصیلات کی ترتیب وتہذیب میں حسن شاہ کی زمینی حقائق پر مبنی

اطلاعات سے مناسب حد تک استفادہ کیا ہوگا۔ یہ بات کسی تردید کے خوف کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ کشمیر سے متعلق معتبر معلومات و معاملات پر حاوی اس سے زیادہ مقبولِ خاص و عام انگریزی کتاب آج تک سامنے نہیں آئی ہے۔ اُردو میں اس کا ایک ضخیم ترجمہ سامنے آچکا ہے اور کم از کم دو اور کشمیری تراجم کی تیاریوں کے متعلق اطلاعات موجود ہیں۔ لارنس کے متعلق ریاست بھر میں مصدّقہ روایات ہیں کہ وہ کشمیری زبان روانی سے بولتے تھے اور اَن پڑھ کسان اور مرد و عورتوں سے اِسی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اُن کی گہری کشمیر شناسی کی گواہی کشمیر کے سابق گورنر بی' کے' نہرو نے اپنی آپ بیتی میں دی ہے۔

جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے اکتوبر 1989ء میں سر والٹر لارنس کی آمد کشمیر کی صد سالہ برسی پر ڈیمنز کالج کے پچھواڑے میں اُن کی مورتی کے سائے میں ایک یادگاری تقریب منعقد کی تھی جس کی صدارت اُس وقت کے مشیرِ مال آنجہانی پنڈت پیارے لال ہنڈو نے کی تھی۔ اس میں جموں اور کشمیر پر مختلف اہم تاریخی کتابوں کے پنجابی مصنف پرُوفیسر سُکھ دیو سنگھ چاڑک آنجہانی نے بھی مقالہ پڑھا تھا۔ اُس موقعے پر کشمیر کے اہم ترین افسر اور دانشور، ادیب اور صحافی موجود تھے۔ راقم الحروف نے اس وقت کلچرل اکادمی کے سیکرٹری اور تقریب کے میزبان کی حیثیت سے مطالبہ کیا تھا کہ لارنس نے کشمیریوں کا جس طرح درد محسوس کیا اور اُن کی مشکل وقت میں بے باکی سے ترجمانی کی اُس کے اعتراف میں گپکار روڈ کو لارنس روڈ کے نام سے منسوب کیا جائے۔ ہنڈو صاحب نے اس وقت معاملے پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے کابینہ کے سامنے پیش کریں گے لیکن بعد کے خون ریز معاملات نے سارے معاملے کو ہی نذرِ طوفان کر دیا۔ بقول مرزا غالب ع

میرے دریائے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

اس موقعہ پر اکادمی کی طرف سے لارن صاحب کے احسانات کے اعتراف کے طور پر اُن کی مورتی پر لگی پہلی کی ایک ایسی تختی کے نیچے ایک اور کتبہ آویزاں کیا

گیا تا کہ سَندرَ ہے کہ کشمیری قوم نا شکر گزار نہیں ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

ریکارڈ کے لئے میں ایک اور بات کو درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اُس وقت اگرچہ ہم نے محکمہ مال اور بندوبست کے ایک بڑے کشمیری ماہر افسر جناب سیّد احمد سعید قادری صاحب کو ماہرانہ رائے کے لئے منچ پر لایا تھا (رام چند راز دانؔ جنہوں نے 51-1950ء کے زرعی اصلاحات کو روبہ عمل لانے میں مرحوم مرزا محمد افضل بیگ کا ہاتھ بٹایا تھا اُس وقت دستیاب نہیں تھے) لیکن ایک اور نہایت اعلیٰ افسر، جو چیف سیکرٹری بھی رہ چکے تھے، نے مجھے بُلایا اور ناگواری سے کہا کہ لارنس کے سلسلے میں بات کا یہ بتنگڑ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے جب پہلے اُن کی ''ویلی آف کشمیر'' کی اہمیت کے حوالے سے بات کرنا چاہی تو وہ بگڑ گئے۔ کہنے لگے ''ویلی آف کشمیر.....ویلی آف کشمیر.....آپ لوگوں نے یہ کیا فضول کی رٹ لگا رکھی ہے..... یہ آپ کی ناواقفیت کی دلیل ہے.....وہ ایک سیٹلمنٹ رپورٹ (Settlement Report) ہے اور بس......ایسی رپورٹیں لکھی جاتی ہیں اور ریکارڈ میں غائب ہو جاتی ہیں...... میں خود ایسی رپورٹ کسی بھی وقت لکھ سکتا ہوں''۔ میں اُن کے سامنے تابِ سخن نہیں لا سکا لیکن لارنس کے بعد اب ایک صدی گذر گئی۔ ایسی رپورٹ نہ سُنی نہ دیکھی۔ کاش! وہ حاکمِ اعلیٰ جو خوش نصیبی سے اَب بھی خوش و خرّم ہیں اُپنے دعوے کی دلیل پیش کر کے ہمیں خرسُند کرتے ع

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

سر والٹر لارنس 1944ء میں لندن کے نزدیک انتقال کر گئے۔



سر والٹر لارنس نہ معلوم کس حُسنِ قبول کی گھڑی میں کشمیر آئے۔ کام تو اُن کا ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر اُن کی رُوح میں اُتر

گیا، مَن وتُو کی تمام سرحدیں مٹ گئیں۔ کشمیر کے ماہر اور دردمند تو وہ بنے ہی لیکن کشمیر کو دَردمند دوستوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ جو چیز لارنس کو خاص بناتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود کشمیر بن گئے تھے۔ بقول بُلھے خان ؏

رانجھا رانجھا کہتے کہتے آپ ہی رانجھا ہوئی

اِس کا سب سے معتبر گواہ اُن کی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' ہے۔ دیکھئے کشمیر کے متعلق وہ کیسے بات کرتے ہیں:

''کشمیری زبان میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات بھی ہیں جن کے انگریزی میں مترادف نہیں ہیں۔ اُنہیں فرہنگ کی Glossary کا حصّہ بنانے کی جگہ اُن کو اصل (انگریزی) عبارت میں جُوں کا تُوں درج کرنا چاہیئے۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جو کشمیریوں کے ساتھ رہن سہن کرتے ہوئے انسان روزانہ اُن کی گفتگو میں سنتا ہے اور جس کسی کو بھی وادی میں کوئی کام چلانا ہے اُسے اندازہ ہوگا کہ ان الفاظ اور رسوم و رواج کی آگاہی اُسے کشمیریوں پر ایک کارآمد گرفت عطا کردے گی''۔ (صفحہ 258)

لارنس نے خود اس طریقِ کار پر عمل کیا ہے اور اسی صفحے میں اس کے نمونے دیئے ہیں صرف زبان کے ساتھ ہی لارنس کا برتاؤ نہیں ہے بلکہ وہ کشمیر اور اس کی طول طویل تاریخ اور اس کے ہمہ گیر پہلوؤں پر اِسی طرح بات کرتا ہے، بات بات میں پتے کی ایسی باتیں بیان کرتا ہے کہ دوسری تاریخوں اور سرگذشتوں کے درجنوں صفحات پر پھیلی ہوئی عبارتیں اس قسم کے جگنو نہیں چمکاتیں۔

لارنس کشمیر میں کئی بار آیا اُس نے چھ سال سے زیادہ عرصہ یہاں تقریباً استقلال اور تسلسل سے بسر کیا اور وہ بھی سرکاری دفتر یا سرینگر کے کوٹھی باغ میں نہیں، جہاں بننے والی سب سے پہلی کوٹھیوں میں سے ایک اس کی قیام گاہ تھی۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ، کشتی کی سیٹ اور انسان کے کندھوں پر لگی ہوئی پینس[1] کے علاوہ پیدل بھی چلتے تھے

---

[1] یہ مرزا غالب کا استعمال کردہ لفظ ہے جو انسان بردار عماری نما سواری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جسے کہار اُٹھاتے تھے۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؏

پینس میں جو گذرتے ہیں وہ کوچے سے میرے ☆ کندھا کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے



سروالٹر لارنس



بزرگ کشمیری شالباف - کانی شال بنتے ہوئے

اور انہوں نے قاضی گنڈ سے لولاب تک بے شمار دورے کئے۔ انہوں نے کشمیری زبان پر ایسی قدرت حاصل کی کہ وہ بے تکلّف اَن پڑھ کِسانوں اور اُن کی عورتوں سے گفتگو کرتے تھے۔ میرے بچپن میں جب لارنس کو کشمیر سے گئے ہوئے بس چالیس سال کا عرصہ گذرا تھا، شوپیان میں ایک بُونا (Pygmy) احمد اللہ نام کا موجود تھا[۱]، جس نے 'لارن صاحب' (کشمیری اُسے اسی پیارے نام سے پکارتے تھے) کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اُس کو کسانوں کے ایک جمگھٹے میں اُس نے بات چیت کرتے دیکھا اور سُنا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ لارن صاحب خود کھیتوں میں جاتے اور اُن کی مٹی کی جانچ پڑتال کر کے اُس کا اندراج کرتے تھے (لوک روایت نے اس پر مبالغے کی پرت چڑھا کر یہ صورت پیدا کی ہے کہ وہ کھیت کی مٹی کا ذائقہ چکھ کر بتاتے تھے کہ اس کی زرخیزی کا درجہ کیا ہے)۔

ویلی آف کشمیر، انڈیکس وغیرہ کے ساتھ باریک ٹائپ اور بڑے سائز کے 478 صفحات پر محیط ہے۔ اس میں کُل 19 باب ہیں۔ جن میں کچھ ابواب کے ذیلی باب بھی ہیں۔ لارنس پہلے ہی صفحے پر اس کو ایک رپورٹ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے پندرہ رپورٹیں حکومت کو پیش کی ہیں جن میں مٹی کی اقسام، تاثیر، پیداواری صلاحیت وغیرہ کے مطابق باتیں درج کی ہیں۔ لیکن اس (ویلی آف کشمیر) میں' میں عام دلچسپی کے معاملات پر خامہ فرسائی کرونگا۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اس کتاب (رپورٹ) میں اپنے اُن نوٹوں اور حوالوں کا صرف پچاس فی صدی حصہ استعمال کر سکا ہوں جو میں نے کشمیر میں اپنے قیام کے چھ سیشنوں (Sessions) میں قلم بند کئے تھے۔ وہ اپنی عدیم الفرصتی پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ باتیں بھی بڑی دخل اندازیوں کے باوجود اور عام طور آڑے اوقات (Odd hours) میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب کو پڑھ کر دل میں ہوک اُٹھتی ہے کہ اگر آدھے حصّے کا یہ عالم ہے تو دوسرا نصف کتنا بصیرت افروز ہوگا جو کبھی

۱۔ لوک عقیدے کے مطابق، جس کی علم حیاتیات بھی تصدیق کرتا ہے، ایسے بونے اوسط سے زیادہ عمر پا لیتے ہیں۔ احمد اللہ کی عمر اُس وقت اُسی سے زیادہ بتائی جاتی تھی۔

روشنائی کی روشنی سے مالامال نہ ہوسکا ع

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

لارنس تقریباً پہلی ہی سانس میں کشمیر کی خاص شخصیّت اور شناخت کا فریفتہ نظر آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''کشمیر کی ایک خاص اور امتیازی قومیت ہے۔ کشمیریوں کا کردار، اُن کی زبان، اُن کا لباس، اُن کے رسوم ورواج بہت ہی منفرد اور دلچسپ ہیں۔ اس کی تاریخ ممتاز ہے اور اس کا انتظامیہ بھی انوکھا''۔

لارنس 1889 (یہ جواہر لال نہرو کا سن پیدائش بھی ہے جس کے ہاتھوں کشمیر کے موجودہ حالات کے پہلے صفحات کی عبارتیں پیدا ہوئیں) میں پہلی بار آیا اور وہ صاف لکھتا ہے کہ اس وقت یہ خطہ مطلق العنانیت کا پورا نمونہ ہے اور اگر اقتدار کی کوئی طبقاتی صورت رہی ہے تو اُس کو تہس نہس کر دیا گیا ہے اِس حد تک کہ اَب لوگ نہیں اور اُوپر اُن کا مالک ومولیٰ مہاراجہ''۔ وہ لکھتا ہے:

''میں نے لوگوں کو ناراض، حواس باختہ اور شک وشبہے سے لبالب بھرا ہوا دیکھا۔ ایسے غلاموں (Serfs) کی طرح جن کو کوئی حق یا رعایت حاصل نہ ہو لیکن جن پر طرح طرح کا بوجھ اور ذمہ داریاں ہوں۔ اُنہیں ظلم پرست قرار دیا جاتا ہے اور اس اُمر کی تسکین کے لئے اُن پر اِس جنس (ظلم وجبر) کی فراوانی رکھی جاتی ہے۔ سپاہی انہیں بیجائی کرنے اور ہل جوتنے کے لئے گھسیٹتے ہیں اور جب فصل کاٹنے کا وقت آتا ہے تو یہی کارندے پھر آجاتے ہیں...... انہیں اپنے گھروں سے زور زبردستی سے کھینچا جاتا ہے اور گلگت کی بیگار کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ ہر سرکاری کارندے کو اُن کی مزدوری اور اُن کی جائیداد پر حق ہوتا ہے۔ اُن کی زندگی کا سادہ سا اصول کہ جو کھیتی کرے، وہی فصل کاٹتا ہے[1]۔ نظرانداز کیا جاتا ہے اور اُن

---

[1] ''یُس گرِ گوُنگل سُے گرِ کرٗاو''

کی حالت فرانس کے اُن بیچارگاں (Tiers Etat) سے کہیں زیادہ قابلِ رحم ہے جو انقلاب فرانس سے پہلے ظلم کی چکی میں پستے تھے۔''

رکسانوں کی حالتِ زار پر کتاب کے مختلف مقامات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ حکومت کے ہرکارے اُن کی فصل کا 9/10 حصہ چھین کر لے جاتے تھے۔ وہ شاذ ہی کبھی اپنے چاول کھاتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے یہاں مثل مشہور ہے ''بھتہ بُھتہ تہٖ پیادہٖ پتہ''۔ (چاول پکنے کی بُو کیا پھیلی کہ سرکاری کارندے لٹھ مار کر پیچھے پڑ گئے)۔

لارنس کشمیریوں کی انفرادیت کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس انفرادی پہچان کو قائم رکھنے کے لئے کشمیریوں نے عجیب طریقے وضع کئے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ صدیوں سے اُن کے طرزِ معاشرت کے بنیادی خدوخال جیسے لوہے کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں، جو بدَلتے نہیں۔ وہ اس اعتراض کو مسترد کر دیتا ہے کہ یہ اُن کی رجعت پسندی یا کنزرویٹیو ہونے کی نشانی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ اس طرز کے نہیں ہوتے تو مغلوں، افغانوں، سکھوں، ڈوگروں نے انہیں اپنے شیشے میں اُتار کر اُن کی قومی شخصیّت کا نشان ہی بدل دیا ہوتا۔

لارنس کو کشمیر کی زمینوں کی زرخیزی کا بھی اعتراف ہے۔ لیکن وہ اس کا مقابلہ اُن کی عورتوں کی تخم پرَوری (Fecundity) سے کرتا ہے اور دلچسپ انداز میں کہتا ہے کہ یہاں زمین اور زن، زرخیزی اور تخم پروری میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس کا پلڑا بھاری ہے۔ لیکن جہاں زمین کی فصل کو سرکاری غنڈے لوٹ کر کشمیری کو بھوکا پیاسا چھوڑ دیتے ہیں وہاں عورتوں کی اولاد قحط سالی، بیماریوں، بیگار اور ظلم و جبر کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ کشمیر کی حالتِ زار کو بدلنے کی اوّلین شرط یہی ہے کہ یہاں آبادی میں اضافہ ہو۔ کاش! لارنس آج ہوتا تو دیکھ لیتا کہ بدنصیبی نے کثرتِ آبادی کے باوجود اُن کا تعاقب نہیں چھوڑا ہے۔ اگرچہ یہاں آجکل عورتوں کی گود ہری بھری ہے اور یہ کھیتی ہر لحاظ سے لہلہا رہی ہے لیکن اس سے اُگنے والی

فصل اَب ایک اور رُوپ میں بندوق اور بارود کے ہتھے چڑھ رہی ہے۔ اُسکے زمانے میں یہاں سبزیاں اور میوے ساری دُنیا میں سب سے زیادہ اَرزاں تھے...... وہ کہتا ہے کہ کشمیر کی آب و ہوا میں اتنی تاثیر ہے کہ یہ ساری دُنیا میں صحت کی بحالی کی نعمت بانٹ سکتا ہے لیکن اُسے کشمیریوں کی گندگی اور غلاظت سے دل بستگی پر بہت غصّہ آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کشمیر میں کالرا کا سب سے بڑا سبّب اُن کی یہی غلاظت پسندی ہے۔

لارنس ہر جگہ کشمیریوں کے کمالات اور اُن کے اِمتیاز کے پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے باب میں اُس نے اپنے وقت میں ہندوستانی آرکیولاجی کے سب سے بڑے ماہر الیگزینڈر کننگھم کا ایک پورا مضمون مستعار لیا ہے۔ وہ ایک اور ماہر Bates کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کشمیر میں جو تعمیراتی آثار بکھرے پڑے ہیں وہ ہندوستان کے موجود آثارِ قدیمہ میں سب سے زیادہ شاندار اور قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں کسی شک وشبہ کے بغیر قدیم یونان کے آثار جھلکتے اور چھلکتے ہیں۔ اَن کا تو ہندوستان میں میں کوئی جواب نہیں ہے۔ لیکن یونان کے پارتھینان اور Lysicvates کی آن بان کا حسن کسی قدر مختلف ہے لیکن کشمیری طرز کا اپنا خاص رنگ اور طرحداری ہے"۔ (صفحہ 164) بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ دعویٰ بھی سامنے آتا ہے کہ یونانیوں کو کشمیر کے شناختی طرزِ تعمیر کی نزاکتوں اور نفاستوں کا علم ہی نہیں بلکہ احساس بھی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیریوں نے جو خاص طرزِ تعمیر ایجاد کیا اُسے ''آریائی طرز'' (Arian Order) کہہ کر یاد کیا جانا چاہئے۔ یہ طرح اُن خوبیوں اور زیبائیوں کا سرمایہ رکھتا ہے جو دُنیا کے کسی بھی اہم (Celeberated) طرز کا امتیاز ہے۔ اسی لئے کشمیریوں کا بنایا ہوا کوئی ستون سارے ہندوستان میں سب سے نرالا اور انوکھی پہچان رکھتا ہے۔'' اس استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ اقتباس سامنے آتا ہے:

''ساری کی ساری ہندوستانی تعمیرات میں کشمیر کے طرزِ تعمیر کی بالاتری اور بُلندی سے وہاں کے ہندوؤں کو بھی واقفیت تھی کیونکہ

کشمیریوں کے لئے اُن کا ایک لقب ''شاستر شِلپنا'' بھی ہے جس کا مطلب ہے فن تعمیر کے ماہر...... یہ ایسی اصطلاح ہے جو فنِ تعمیر میں اُن کے کمال کی بدولت ہی استعمال کی جاسکتی تھی۔ اس وقت بھی کشمیری مشرق کے سب سے ماہر دست کار ہیں۔ اور اس بات پر باور کرنا مشکل نہیں کہ وہ کشمیری جو اس وقت تمام اہلِ مشرق کو پارچہ بافی، بندوق سازی اور خطاطی میں پیچھے چھوڑتے ہیں، فنِ تعمیر میں بھی کمال کی اُونچائیوں کو سَر کر چکے ہوں گے۔''

کشمیری فنِ تعمیر کی شہرت وہ سب سے پہلے بطلیموس (عیسائی سن سے دو سو سال پہلے) کے یہاں سنتا ہے۔ اگر چہ وہ کشمیری عمارتوں کے کھنڈرات کو 'پانڈولز' (پانڈوؤں کا مکان) کے روایتی نام سے جوڑ کر وہ قیاس کرتا ہے کہ اصل پانڈو کشمیر کا ہی رہا ہوگا لیکن اُسے یہ متوازی روایت یاد نہیں رہتی کہ مہا بھارت کی ۱۸ روزہ جنگ میں کشمیری حکمرانوں نے جو فوج روانہ کی اُس نے کوروؤں کا ساتھ دے کر پانڈوؤں کے خلاف لڑا۔ آگے چل کر وہ ان کھنڈرات کی عظمت کے سلسلے میں ٹریبک (Trebek) کے حوالے سے لکھتا ہے 'اِن کھنڈرات کا حجم اور اُن کی پہنائی فرعونی مصر کے عظیم ترین آثار سے کم نہیں ہے۔ اس بات میں وہ اِن عمارتوں کے زوال کے لئے کبھی سکندر بُت شکن، کبھی زلزلوں اور کبھی سیلابوں کو ذمہ دار مانتا ہے۔ لیکن وہ بار بار اس نقطے پر زور دیتا ہے کہ کشمیریوں نے پتھر کا استعمال کر کے جو شاندار معابد اور مندر تعمیر کئے وہ اُن کی تخلیقی اُپج اور طباعی کا ایسا نمونہ ہیں جنہوں نے سارے شمال مغربی ہندوستان کو تقلید پر مجبور کر لیا۔ اور وہ اُن کا اپنی پہچان کا واضح منشور بھی ہے اور اعلان بھی۔

فنِ تعمیر کے ذکر میں وہ الیگزینڈر کننگھم کے حوالے سے ہی کشمیر کے سب سے عظیم زمانے اور اس کے سب سے بڑے بادشاہ (جسے اُس کی فتوحات کے آئینے میں شہنشاہ کہنا زیادہ زیب دیتا ہے) راجہ للتادتیہ کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اُس کے بنائے ہوئے معبد آفتاب (Sun Temple) مارتنڈ کو کشمیری آرکی ٹیکچر کا نقطۂ عروج قرار دیتے

ہوئے اسے عجائبِ کشمیر (Wonder of Kashmir) مانتا ہے۔ اس معبد کے چونسٹھ عظیم ستون تھے جو ہفتے کے سات دنوں کو Zodiac کی بارہ بُرجیوں سے تقسیم کے بعد حاصل ہونے والا شمار ہے۔ یہ صرف ہندوؤں کے لئے ہی ایک متبرک مقدار ہی نہیں بلکہ علمِ نجوم کے قاعدوں سے بھی ایک بہت ہی قابل توجہ گنتی ہے۔ اس مندر کی تفصیلات کا تجزیہ کر کے وہ اِسے للتادتیہ جیسے فاتحِ عالم بادشاہ کی شان کے شایان کارنامہ قرار دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں یہ وادی کا سب سے دلکش اور مکمل نظارہ بھی پیش کرتا ہے اور وہ اس بات کو اِس کی کرامت کا ایک قابل لحاظ حصہ مانتا ہے۔

تختِ سلیمان کے مندر کو (شنکر آچاریہ نام کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے) کشمیر کی قدیم ترین یادگاری عمارت بتایا گیا ہے اور اسے اشوک اعظم کے بیٹے راجہ جلوک (220 ق م) کے نام سے جوڑا گیا ہے۔ راجہ جلوک نے بُدھ مت کے مہارتھی اَپنے عظیم باپ کے مذہب سے انحراف کر کے کشمیر میں شیومت کے فروغ کی طرف دھیان دیا۔ لارنس کے مطابق وہ یہاں کی ناگ دوشیزاؤں کی اَداؤں پر ایسا لوٹ پوٹ ہو گیا کہ دھرم کرم کی ساری چوکڑیاں بھول گیا۔ اس مندر کی بعد میں مسلمان بادشاہوں کے عہد میں مرمت ہوئی اور کننگھم اس کی اَندرونی دیواروں پر فارسی کے دو کتبوں کا ذکر کرتا ہے۔

''یہ بُت 54 سموت میں بہشتی زرگر نے بنایا'' ایک اور اَدھورے کتبے کی عبارت ہے ''اس بُت کو اُٹھانے والا خواجہ رگن تھا، جو میر جان کا فرزند تھا......'' اب یہ عبارتیں مندر کی دیواروں پر کے گئے وارنش اور لیپا پوتی کے نیچے دَب گئی ہیں لیکن انیسویں صدی کی کچھ کتابوں میں اُن کے فوٹو گرافوں میں یہ عبارتیں نظر آتی ہیں، خاص طور ہنری ہارڈی کی ''قدیم کشمیر'' میں۔

کشمیر کی تحریری تواریخ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لارنس ''راج ترنگنی'' کے سلسلہ تاریخ نویسی کو برِصغیر میں ایک بے مثال کارنامہ قرار دیتا ہے۔ کلہن، جونراج، سُکا، شری ور اور پراجیہ بٹ جنہوں نے اسے ماقبل تاریخ سے اکبر بادشاہ کے زمانے

(1586) تک لایا۔ وہ کلہن کی راج ترنگنی کی دریافت، ترتیب، تہذیب اور ترجمہ و تشریح پر ایک نہایت معنی پرُور تفصیل درج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی طلب اور تحقیق کا سلسلۂ نسب ہندوستان میں مغرب کے روشن خیال خاور شناسوں کے سرخیل اور قافلہ سالار سر ولیم جونز سے ملتا ہے۔ ولیم جونز ہندوستان میں رائل ایشاٹک سوسائیٹی کا بانی تھا۔ اُسی نے سنسکرت کے بارے میں سب سے پہلے اس کا سلسلہ بنی آدم کی سب سے مکمل کلاسیکل زبانوں سے جوڑا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ انڈو آرین زبانوں کی ہی نہیں ٹرانس یورپین زبانوں پر بھی اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ چنانچہ بعد میں یہ ایک باقاعدہ علم کا مصدر بن گیا جس میں جرمن مستشرق میکس مولر جیسے فاضلوں نے تحقیق و تلاش کے نئے اُفق روشن کئے۔

لارنس اپنے معاصر مورخین کی تائید سے کشمیر کی تواریخ کی ابتدا، ماقبل تاریخ تک لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علمِ تواریخ کے بابا ہیروڈوٹس نے بھی کشمیر کا کئی حیثیتوں سے ذکر کیا ہے اور اس بات کے نشان بھی ملتے ہیں کہ سکندر مقدونی اور اُس کے ہمراہ تاریخ نویسوں کو کشمیر کے سیاسی اور تمدنی وجود کا گہرا عرفان و احساس تھا۔ اُس کے خیال میں کشمیریوں نے قدیم ترین تاریخی مرحلوں میں برِصغیر کے معاملات میں فیصلہ کن حد تک دخل اندازی اور کارفرمائی کی۔ اگرچہ چند تازہ صدیوں میں یہ صورت اُلٹ گئی ہے۔

کشمیر کی ابتدا اگرچہ خرافات اور دیو مالا کی دُھند میں چھپی ہوئی ہے مگر اس نازک مرحلے سے گزرتے وقت لارنس کی کشمیر نوازی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ وہ 'ہارِہ پربت' کو "ہری پربت" لکھنے پر سیخ پا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "It is a Dogra populer Etymology" یہ بات ذہن میں رہے کہ اُس وقت مہاراجانِ ڈوگرہ کا راج عروج پر تھا اور وہ اُن کی ملازمت میں تھا۔ وہ بجا طور کہتا ہے کہ یہ 'ہارِ پربت' ہے یعنی شارکا یا اُردو مینا سے منسوب۔ وہ دُرست طور کہتا ہے کہ کشمیری بہت قدیم زمانے سے پاروتی کی اِس سروپ میں پوجا کرتے تھے۔ وہ کشمیر کے قدیم ستی سر کا ذکر

کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مقامی روایت کے مطابق جب پاروتی شگفتہ مزاج میں ہوتی تو وہ وادی کے شمال میں اپنے بسیرے ہرمُکھ سے ایک شاندار کشتی میں تفریح کرنے نکلتی تھی اور جنوب میں کُنسا ناگ[1] پہنچ کر دم لیتی تھی۔ ہر کشمیری کو اس روایت کا ذکر لل دید کے اس مصرعے کی یاد دلائے گا ؎

ہرموکھ کونسراَ کھ سُم سرس

کشمیر کی نیلم پری کیسے ستی سر کے پانیوں کو ہٹا کر اُبھر آئی لارنس نے اس بارے میں جو تفصیلات دی ہیں وہ اتنی خوبصورت ہیں کہ اُس پر عالمی درجے کی اسطور کا گمان ہوتا ہے اور یہ تفصیلات اگرچہ اُس کی طبع زاد نہیں لیکن اُس کی کتاب کے بغیر شاید اِن کا اَتہ پتہ کسی کتاب میں شاذ ملے گا۔ وہ لکھتا ہے:

"جھیل میں ایک ظالم عفریت جَلدیو نام کا رہتا تھا جسے برہما کی سرپرستی حاصل تھی۔ برہما کے پوتے کشپ نے اس صورت کو بدلنے کی ٹھان لی۔ کشب ایک ہزار سال تک عبادت کرنے کے بعد جلدیو سے دو دو ہاتھ کرنے پر اُتر آیا لیکن جلدیو اُسے جُل دے کرنا کام بناتا رہا۔ وشنو، کشپ کی مدد کے لئے آیا تو جلدیو پانی کے نیچے پاتال میں چُھپ گیا۔ وشنو نے بارہمولہ کے قریب اپنا ترشول گاڑ کر جھیل کے پانی کے بہاؤ کا راستہ بنایا لیکن جلدیو ہارہ پربت کے پاس جھیل کی نچلی سطح میں چُھپ گیا۔ دیوتاؤں نے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند لے کر جلدیو کی تلاش شروع کردی لیکن عفریت اُن کو ٹالتا رہا۔ آخر پاروتی مینا کی رُوپ میں آئی۔ اُس نے اپنی چونچ میں ہارہ پربت پہاڑی کا کنکر لے کر جلدیو کے اُوپر پھینک دیا اور عفریت کا کچومر نکل گیا"۔

کشمیریوں کی اُفتادِ طبع کے مطابق لارنس نے کچھ دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔

---

[1] کونسا ناگ۔ لارنس نے "کوثر" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جو اِس جھیل کے نام کے ساتھ بعد میں غلطی سے جوڑا گیا۔ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ یہ دراصل کُن سر ناگ (کونوں والا چشمہ) ہے۔ لارنس کشمیری الاصل نہ تھے لہٰذا لگتا ہے کہ اُنہیں کُن سر سنتے ہی چوک ہوگئی اور وہ صرف Konsa لکھ گئے۔

وہ کہتا ہے کہ" کشمیری اُسی وقت اپنا جوہر دکھاتے ہیں جب وہ اپنے وطن سے باہر جا کر فتح کریں اور لڑائیوں میں مصروف ہوں۔ اس سلسلے میں خاص طور للتادتیہ اور شنکرورمن کی فتوحات کا ذکر کرتا ہے۔ شنکرورمن نے ایک لاکھ گھوڑ سواروں، تین سو ہاتھیوں اور نوے ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل لشکر تیار کیا تھا جس میں کشمیر سے باہر پنجابی اور دوسرے Mercenaries کی بڑی تعداد تھی۔ بہر حال جب کشمیری ایسی مہمیں کرنے کے لئے نہیں جاتے تھے تو" اُن کے سپاہی وغیرہ بے کاری سے تنگ آ کر ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے اور کشمیر میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی تھی"۔

اسی طرح انتظامیہ کے منشی اور کلرک جنہیں اُن دنوں کائستھ کہہ کر پکارا جاتا تھا بذات خود ایک بڑی مصیبت بنتے تھے۔ ایک مقامی بادشاہ راجہ اُچل (1101-1111) کا قول لارنس بڑی رغبت اور رضامندی سے نقل کرتا ہے کہ کشمیری عوام کو جس طرح ہیضہ، قولنج اور دوسری وبائیں تباہ کرتی ہیں اور موت کے گھاٹ اُتارتی ہیں، اُس سے کچھ کم بربادی یہ کائستھ لوگ نہیں کرتے جن کے قلم سے زہر قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے۔ لارنس آگے چل کر لکھتا ہے کہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد خود اُس کے زمانے میں انتظامیہ کے ان کارکنوں کے رول میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔

لارنس کشمیر میں ہندو راج کے خاتمے پر آہ بھرتا ہے لیکن تواریخ کی کرتوتوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

"یہ سب باتیں کشمیر میں ہندو شاہی کے انتشار کا اِشارہ دے رہیں تھیں جو کئی صدیوں تک فرمانرواء رہی تھی۔ 1305 میں جب راجہ سمہادیو گدی نشین تھا تو کشمیر شرابیوں کبابیوں اور جواریوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا اور اُن کی عورتوں کا حال بھی کچھ بہتر نہیں تھا...... ایسے میں تاتاری ذولچو نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور سمہادیو کشتواڑ بھاگ گیا"۔

اور اس کے بعد اس زوال کے آخری منظر ملتے ہیں جن سے تواریخ کشمیر کے طالب علم بہ خوبی واقف ہیں۔ اس دور کا آخری واقعہ ایک ہالی وڈ فلم کا کلائمیکس لگتا

ہے۔ دو بادشاہوں سے بیاہی ہوئی کشمیر کی آخری ہندو حکمران کوٹہ رانی اپنے نئے عاشق سلطان شاہ میر کی پیش دستیوں کا مقابلہ تو نہیں کرتی بلکہ بن ٹھن کر اور ساز سنگار سے آراستہ ہو کر بسترِ عروسی پر بیٹھ جاتی ہے لیکن جب نوشہ اندر آ کر لطف و نشاط کی پہل کرنے لگتا ہے تو دُلہن اپنے پیٹ میں خنجر گھونپ کر اُس کا خونین استقبال کرتی ہے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں لارنس پہلے سلطان سکندر بُت شکن کے 24 سالہ دور کی دُھند کو پھیلاتا ہے۔ اُس کے مطابق سکندر کے وقت بُت شکنی کے علاوہ موسیقی، شراب اور جُوا بازی پر بھی پابندی لگی اور سَتی ہونے کی رسم پر بھی۔ اس کے بعد وہ اس تاریک پسِ منظر میں زین العابدین بڈشاہ کے دور کے اُجالوں کو اُبھارتا ہے۔ خود بادشاہ ایک سبزی خور تھا۔ اُس نے ہندوؤں کا جزیہ ٹیکس معاف کیا۔ فارسی سِکھا کر اُنھیں انتظامیہ میں برتری کے راستے پر گامزن کر دیا۔ فارسی اُسی زمانے میں سنسکرت کی جگہ کشمیر کی سرکاری زبان بنی۔ وہ صرف علم و فن کا دلدادہ ہی نہ تھا بلکہ تلوار کا دُھنی بھی۔ اُس نے پشاور سے لے کر تبت تک اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ وہ بجا طور دورِ بڈشاہی کو کشمیر کا سنہری زمانہ خیال کرتا ہے۔ مغلوں کے زمانے کی بات کرتے ہوئے اُسے اپنے پیشے کے ماہر ٹوڈرمل کی یاد آتی ہے جس نے کشمیر میں پہلا بندوبست اراضی کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ ٹوڈرمل کے بندوبست میں بہت دُرستی نہ تھی لیکن یہ بہت عجلت میں کیا گیا۔ وہ ستم ظریفی سے بیان کرتا ہے کہ اس تعجیل میں پٹن کے اردگرد کے بہت سے گاؤں اندراج سے رہ گئے اور اُن سے سینکڑوں سال کسی نے مالیہ نہیں لیا۔ وہ کہتا ہے کہ اکبر نے ہارِ پربت کی قلعہ کی فصیل تعمیر کی اور پھر وہاں ناگرنگر کا قصبہ بسایا جہاں اُس کے رئیس اور امیر رہتے تھے۔ وہ بس ان ہی دو چیزوں کو اکبر کے دور کی یادگاریں سمجھتا ہے۔ جہانگیر کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کشمیر کا عاشق تھا۔ اُس نے تزکِ جہانگیری کے متن کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہانگیر نے کشمیر کی ایک شاہزادی سے بھی شادی کی تھی۔ مغلوں کے دور کو وہ مجموعی طور سے کشمیریوں کے لئے فراغت اور فرصت کا دور قرار دیتا ہے۔ مغل بادشاہوں کی آمد اور اُن کے جاہ و حشم کے موقعوں پر

اگرچہ کشمیریوں کا قافیہ تنگ ہو جاتا تھا لیکن اُن کی وجہ سے یہاں روپے پیسے کی ریل پیل بھی ہوتی۔ مغل تہذیب کی شان وشوکت سے کشمیر میں زندگی اور اس کے تصوّرات کے متاثر ہونے کو بھی وہ ایک اہم امکان مانتا ہے کیونکہ وہ اپنی شان کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ اور اس کے لئے خرچہ اُٹھانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ کشمیر میں جہانگیر اور نور جہاں کی عیاشانہ مصروفیتوں کے جو قصّے لارنس نے سُنے اور پھر مغل باغات کی تعمیر کا جو ماجرا اُس نے دیکھا اُس کے پیش نظر وہ کہتا ہے کہ کشمیر میں مغلوں کی شہنشاہی عیش و نشاط کی ایک مسلسل جھانکی رہی ہوگی۔ وہ کشمیر میں ٹوڈرمل کے مالیاتی نظام کے استقلال اور دیہات میں مقدموں (نمبرداروں) کے ادارے کی ترتیب کا اُن کا اہم کارنامہ مانتا ہے۔ افغانوں اور سکھوں کے دَور کی تاریکیاں کسے معلوم نہیں ہیں لیکن لارنس کشمیر پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے کے متعلق وہ جانکاری کا ایک اور زاویہ بھی پیش کرتا ہے۔ عام طور یہی مانا جاتا ہے کہ افغانوں نے کشمیر میں جو ہُلڑ مچایا اُس کے نتیجے میں بیربل در لاہور جا کر رنجیت سنگھ کو کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت کا محرک بنا۔ لیکن لارنس کہتا ہے کہ اس کے پیچھے افغانوں اور سکھ حکمرانوں کی پس پشت سازش بھی تھی۔ افغان حکمران فتح خان برکت زئی نے جو کشمیر میں اُن کے صوبیدار عطا محمد خان کا آقا تھا، نے سکھ اقتدار کے عروج کو دیکھ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لبھایا تھا کہ برکت زئی اُسے آٹھ لاکھ روپے سالانہ ادا کرے گا بشرطیکہ وہ کشمیر اُس کی تحویل میں رہنے کیلئے مدد دے۔ چنانچہ یہ سودا ہوا لیکن مقامی گورنر عطا محمد نے سکھ فوج کی مزاحمت کی اور انہیں ناکوں چنے چبوائے مگر اُسے شکست ہوئی۔ فتح محمد نے رنجیت سنگھ کو آٹھ لاکھ روپے دیئے اور محمد عظیم نے اگرچہ اپنے لئے کروڑوں روپے اِکٹھا کئے لیکن اُس نے رنجیت سنگھ کو 8 لاکھ روپے باج ادا نہیں کیا۔ چنانچہ 1814 میں ایک سکھ فوج کشمیر پر حملہ آور ہوئی جس کی نگرانی رنجیت سنگھ خود پونچھ میں بیٹھ کر کر رہا تھا۔ بہر حال یہ لشکر ناکام ہوا۔ اس پر رنجیت سنگھ نے بڑی تیاریاں شروع کیں کہ اُسی دوران پنڈت بیربل در مدد طلب کرنے کیلئے لاہور پہنچے۔ محمد عظیم نے اُس کی عورتوں کو شاید یرغمال بنانے کیلئے

طلب کیا لیکن اُنہیں ایک مسلمان دوست عبدالقدوس گوجواری نے چُھپالیا تھا مگر بیربل در کے داماد کو اس کا سراغ تھا۔ اُس نے یہ اطلاع دربار میں پہنچائی تو قدوس خواجہ کو کوڑے مار کر ہلاک کردیا گیا۔ بیربل در کی بیوی اور بہو (راج کاک در کی بیوی جو اپنے باپ کے ساتھ لاہور چلا گیا تھا) کو دربار کی طرف لے جایا گیا۔ بیوی نے اپنی انگشوٹھی کے نگینے کے نیچے چُھپائے ہوئے زہر کو منہ میں ڈال کر خودکشی کرلی لیکن بہو اُس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ اُس پر قاتلوں کا ہاتھ نہ اُٹھ سکا۔ تبدیلیٔ مذہب کے بعد اُسے کابل بھیج دیا گیا ہے۔ لارنس اطلاع دیتا ہے کہ وہ حال حال تک کابل میں زندہ تھی۔ (لارنس کے کشمیر آنے تک اس بات کو ستر سال کے قریب ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اچھی عمر پاکر انتقال کرگئی ہوگی اور کہ اُس وقت کشمیر میں اُس کے متعلق دلچسپی قائم تھی اور اطلاعات موصول ہورہی تھیں[1])..........سکھوں کا دور افغانوں سے زیادہ بہتر ثابت نہ ہوا۔ اس زمانے میں اگر کوئی سکھ مارا جاتا تو اُس کے سر کی قیمت 20 روپے اُدا کی جاتی مگر کوئی کشمیری مرتا تو اُس کا سر بس 2 روپے کے برابر تسلیم کیا جاتا۔ سکھ حکومت کا روشن وقت کرنل مہان سنگھ کی بہ حیثیت صوبیدار تقرری ہے۔ 1831 میں کشمیر میں غضب کا قحط پڑا تھا جس کے عواقب میں یہاں اناج کے بیج اور مرغی بطخ وغیرہ گھریلو Fowl کی نسل معدوم ہوگئی تھی۔ کرنل مہان سنگھ نے پنجاب سے نئے بیج اور انڈے منگوا کر یہاں پھر زندگی اور پرورش کی رونق کو فروغ دیا۔ آبادی میں اضافہ کرنے کے لئے اُس نے شادیوں پر ٹیکس منسوخ کیا تاکہ لوگ پھر افزائشِ نسل میں مصروف و مشغول ہوجائیں۔ اُس نے بلاسُود کے زراعتی قرضے دیئے جو اُن دِنوں بہت اہم قدم تھا۔ وہ مقدمات کی شنوائی اس قدر عدل سے کرتا تھا کہ اُس کا نام کشمیریوں نے نوشیروانِ ثانی رکھا۔ لیکن یہ فطرت کی

---

[1] یہ عورت اتنی حسین وجمیل رہی تھی کہ اُس کے درخاندان میں آج تک اُس کے متعلق روایات کا سینہ بہ سینہ ذکر ہوتا ہے۔ مجھے اس معزز خاندان کی ایک زندہ خاتونِ محترم نے بتایا کہ وہ بہت ہی گوری اور اُجلی تھی...... ....ہمارے گھر میں آج بھی بتایا جاتا ہے کہ جب وہ پانی پیتی تھی تو باہر سے اُس کے گلے کی رگوں سے پانی کو دیکھا جاسکتا تھا ......واللہ اعلم بالصواب۔ (م.ی.ٹ.)

عجیب منطق ہے کہ ایسے اچھے حاکم کو اپنے ہی ایک سپاہی نے نہایت بے رحمی سے شیر گڈھی کے محل میں قتل کر دیا۔

سِکھ دَور کا خاتمہ ایک عجیب داستان ہے۔ لارنس کے وقت یہ معاملے تازہ تازہ تھے۔ اِس لئے مستند بھی۔ سِکھوں کے دَو آخری صوبیدار لاہور کے دو مسلمان باپ بیٹے تھے۔ لاہور میں شیرِ پنجاب رنجیت سنگھ نہیں رہا تھا اور اُفراتفری تھی۔ اِس لئے کشمیر کے دو مسلمان صوبیداروں نے صرف اُپنے حُسنِ کردار اور عوام نوازی کی بَدولت کشمیر کو اُن کی قلمرو میں رکھا۔ شیخ محی الدّین 1842 میں صوبیدار بنا اور اُس نے 23 سال کے بعد سرینگر کی جامع مسجد کے دروازے پھر عبادت کے لئے کھول دیئے۔ کشمیریوں نے اس کے اچھے کاموں کو اس طرح سے یاد رکھا کہ جب وہ تین سال کے بعد یہیں سرینگر میں انتقال کر گیا تو اُنہوں نے اس کے جسد کو حضرت مخدوم حمزہؒ کے روضے واقع کوہ ماران میں حجرہٗ خاص کے باہر والے دالان میں آسودہ کرنے کی اجازت دی۔ یہ اتنی عزت اور تعظیم کی بات تھی کہ کسی بھی غیر کشمیری حاکم کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس پاک روضے میں اُس کی سنگ مرمر کے تعویذ سے آراستہ قبر اِس وقت بھی موجود[1] ہے۔

شیخ محی الدین کے بعد اُس کا بیٹا امام الدّین گورنر بنا۔ اس کے ایک سال بعد 16 مارچ 1846 میں لاہور دربار نے کشمیر کو، جسے دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں علاقوں کے ساتھ انگریزوں کی تحویل میں دیدیا تھا ایک بِکری پتر کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں میں بیچ دیا۔ یہاں تک تو لارنس اور

---

[1] کشمیر کے ایک سابق گورنر بلونت کمار نہرو (بی کے نہرو) کی ماں راجیشوری نہرو لاہور کی تھیں اور اپنی ننھیال کے ناطے لاہور میں شیخ محی الدین کے خاندان کے ساتھ اُن کے تعلقات قایم تھے۔ جب وہ یہاں گورنر تھے (1977-1983) تو انہوں نے اس خاندان کے معاصر بزرگوں کا ایک خط مجھے دکھایا۔ جس میں شیخ محی الدین کے آخری ایام کے متعلق جانکاری کے لئے لکھا گیا تھا۔ جب میں نے کچھ دیر کے بعد ضروری معلومات انہیں فراہم کیں تو انہوں نے انہیں اپنے خط کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔ بِعد میں مجھے نہرو جی کا ایک خط موصول ہوا (جو میرے پاس محفوظ ہے) جس میں انہوں نے اُس خاندان کی طرف سے میرا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھا تھا..... ''اس نوٹ میں جو باتیں لکھی تھیں وہ اُن کے لئے بے حد خوشگوار حیرت کا باعث بنی ہیں۔''

دوسرے مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ خود لارنس کہتا ہے کہ امام الدّین کی سرکردگی میں کشمیریوں نے نئے حکمران کی سخت مزاحمت کی۔ اُس کی مزاحمت کی وجہ سے گلاب سنگھ کی فوجیں 40 دن تک ہارِ پربت قلعے میں محصور رہنے کے بعد ہار گئیں۔ اُس کا فوجی کمانڈر وزیر لکھپت میدانِ مائسمہ میں جان سے گیا اور اُس کی چھوٹی سی سمادھی آج بھی وزیر اعلیٰ کے بنکوئٹ ہال کے بالکل داہنی طرف آج بھی کشمیریوں کی سپہ گری کی خاموش شہادت دے رہی ہے۔ راقم الحروف اس سلسلے میں مزید ایک لوک روایت کا ذکر کر کے اسے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ آج تک اس کا کہیں ذکر نہیں ہوا ہے۔ امام الدین اُن دنوں کشمیر میں ایک عوامی ہیرو بن گیا تھا اور کشمیریوں نے اپنی عادت کے مطابق اُسے لوک گیتوں میں جگہ دی۔ مثلاً ایک گیت کے ابتدائی بول ہیں:

سونہٕ سُندس گُرِس روپہٕ سُند زٔین
اتھ کُس کھٔسِتھ ......امام الدین

(سونے کے گھوڑے کو چاندی کی زین سے سجایا گیا ہے۔ اور اُس پر کون سوار ہے؟ ہمارا امام الدین) اس کے مقابلے لکھپت بے چارے کے متعلق یہ تُک زبان زد عام تھی...... ع

ہَچِو گُرِس زَچِو کلہٕ
اتھ کُس کھٔسِتھ....لکھپت دٔلہٕ

(لکڑی کے گھوڑے کا سر چیتھڑوں سے بنا ہوا ہے اور اُس پر کون سوار ہے؟ وہی پاجی لکھپت)

بہر حال اس معاملے کو انگریزوں کو اپنی فوج بھیج کر نپٹنا پڑا۔ لیکن صرف فوجی طاقت سے نہیں۔ امام الدین کو باقاعدہ ڈپلومیسی سے رام کیا گیا اور جب وہ راجوری پہنچا تو اس کا وہاں انگریزی فوج کے کمانڈر نے استقبال کیا۔ نہ صرف اُس کو ایک لاکھ چاندی کے روپے دیئے گئے بلکہ تزک و احتشام سے رخصت کیا گیا۔ امام الدین لاہور میں دفن ہے اور انگریز لاہور میں اپنے تسلط کے بعد اُس کے لواحقین کو آرام و

آسائش سے رکھتے رہے۔

سکھ دور کے سرینگر کی بات کرتے ہوئے لارنس لکھتا ہے کہ شیخ باغ، جہاں آج لال چوک وغیرہ ہیں وہ شیخ محی الدین کے نام پر ہی شیخ باغ کہلاتا ہے۔ (یہ نام آج بھی پرانی نسل کے لوگوں کو یاد ہے اور محکمہ مال کے کاغذات میں موجود) اسی طرح منشی باغ جہاں چیف منسٹر کی کوٹھی اور بڑا ڈاک گھر ہے کسی منشی تلوک چند کی ملکیت تھا۔ لال منڈی کا آج کا عجائب گھر ڈوگرہ مہاراج بنکوئٹ ہال کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے اور وہاں باہر سے آنے والے عمائدین کے لئے ضیافتیں منعقد ہوتی تھیں۔ چھاونی آج کے بادامی باغ میں نہیں بلکہ رام باغ کے نزدیک واقع تھی۔ کیونکہ حملہ آور شوپیان ہیرپور کے ہی راستے سے آسکتا تھا۔ بانہال ڈوگروں کے قبضے میں تھا۔ وہاں سے کون حملہ کرتا کہ بادامی باغ میں چھاونی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ لسجن گاؤں میں کشمیر کے بہترین ''وگو'' بُنے جاتے تھے۔ یورپی سیاح پہلی بار کشمیر کا رُخ کر رہے تھے اور اُن کی جیب سے خرچ ہونے والا روپیہ عوام کی خوشحالی میں پیوند لگا رہا تھا...... چائے کشمیر میں پہلی بار خواص کے دائرے سے نکل کر عوام تک پہنچ رہی تھی۔ مغلوں کے لائے ہوئے سفیدے کشمیر کی آرائش کا باعث بن گئے تھے۔ شیر گڈھی سے شوپیان کے راستے (بہ طرف رام باغ) سفیدوں کی دورویہ قطاریں سات میل تک چلی گئی تھیں۔ اسی طرح شیر گڈھی سے تختِ سلیمان تک سفیدوں کی شاندار قطاریں تھیں۔ (ان الفاظ کے لکھنے والے نے ان کی بوڑھی باقیات پچاس کی دہائی میں دیکھی ہیں۔)

مہاراجہ گلاب سنگھ کے انتقال کے سلسلے میں لارنس نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ مہاراجہ 1857 میں جو ہندوستان میں غدر یا پہلی جنگ آزادی کا سال تھا۔ اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کے حق میں دستبردار ہوگیا تھا اور آخری دن کشمیر میں گزارنے آیا تھا۔ یہاں اُس کا انتقال ہوا تو اس کا رام باغ میں انتم سنسکار کیا گیا جس پر بعد میں ایک عالی شان سمادھی تعمیر کی گئی۔ جس کے اوپر سونے کے ملمع سے سجی سجائی Plates بھی ہیں

(اب جموں کے رگھوناتھ مندر میں اس کا ایک Replica تیار کیا گیا ہے اور اس کی چھت بھی سونے کے ملمع شدہ تختوں سے مزّین ہے) بہر حال اس کی وفات سے بعد پروہتوں نے قرار دیا کہ اُس کی آتما مچھلی میں داخل ہوگئی ہے۔ چنانچہ کشمیر میں چھ سال تک مچھلی کے شکار اور ماہی گیری پر پابندی لگادی گئی۔ اگر کوئی قسمت کا مارا غلطی سے پکڑا جاتا تو اُس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ (صفحہ 157)

لارنس کی حقیقت بیانی کی اُس وقت پھر داد دینا پڑتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ جب باہر کے غیر مسلم حکمران کشمیر آئے اور اُنہوں نے یہاں کے استھاپنوں اور مندروں میں مورتیوں اور فن پاروں کا آنکھیں چندھیانے والا گنجینہ دیکھا تو اُن کی سٹی گُم ہوگئی اور انہوں نے یہاں سے ہزاروں مورتیاں اور لنگھم اُٹھا کر پیر پنچال سے پار پہنچا دیئے (صفحہ 162) لگتا ہے کہ یورپی میوزیموں اور دوسرے گنج فنون میں جو کشمیری فن پارے ہیں وہ انہی دنوں انگریز اور یورپی فن شناس لے گئے ہیں۔ لارنس نے گلاب سنگھ کا قول نقل کیا ہے کہ میں ہر انگریز کو اپنا آقا سمجھتا ہوں۔ لیکن اُن کو روکنے کا سوال نہ تھا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس طرح سے یہ فنی نوادر ضائع ہونے سے بچ گئے۔

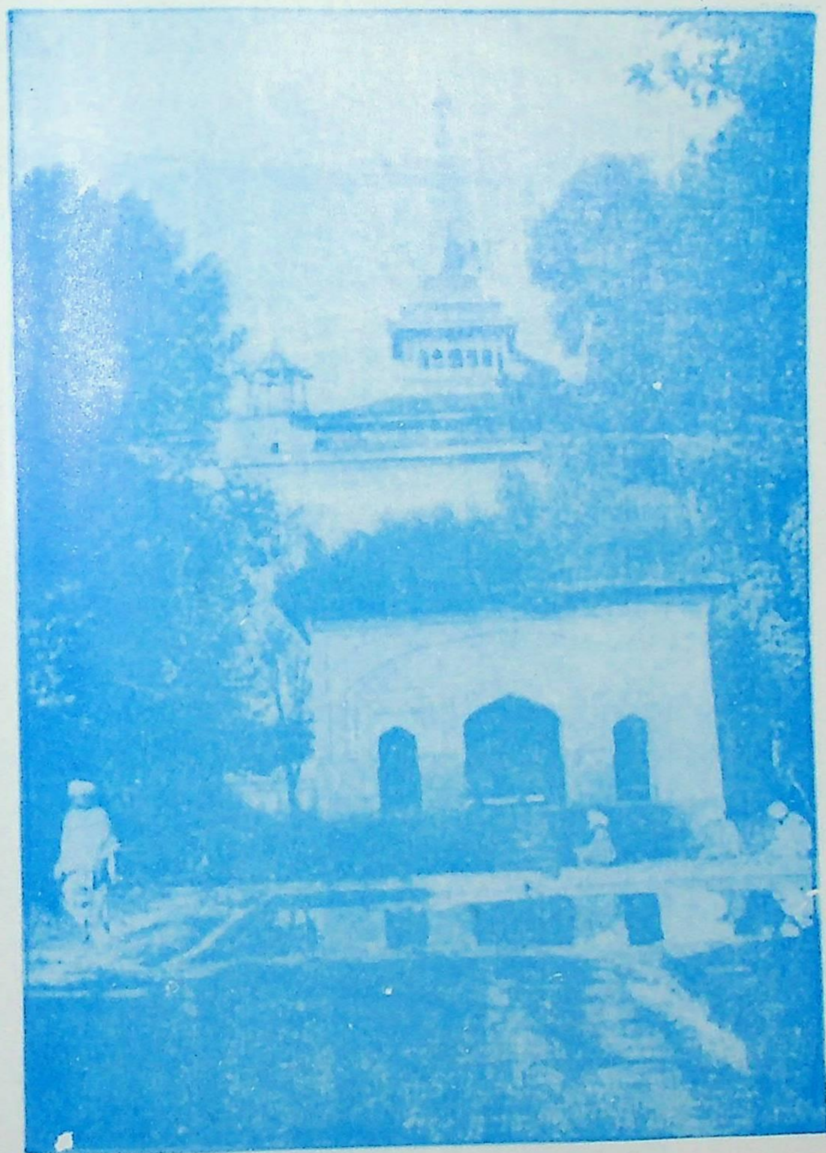
ڈوگرہ راجہ پرتاپ سنگھ کے وقت وہ ہندوستان کو بارہمولہ سے ملانے والی سڑک جہلم ویلی روڈ کی تعمیر کو وہ اُن کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیتا ہے اور اس کو کشمیر کی ترقی کے لئے ایک نیک شگون قرار دیتا ہے۔ وہ آخر پر سیاسی تاریخ پر اپنے حتمی تبصرے میں کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت حیران کُن امر ہے کہ مختلف مذاہب، نسلوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حکومتوں سے گزرنے کے باوجود کشمیریوں نے اپنی خاص قومیت (شناخت) کو کسی رخنے کے بعد جاری اور بحال رکھا ہے لیکن وہ ایک دانشمند مبصر کی طرح نئے حالات پر گہری نظر رکھنے اور احتیاط کا مشورہ دیتا ہے۔

"جو انقلاب ہندوستان کے ساتھ تیز تر اور زیادہ گہرے تال میل اور آمد ورفت کے نتیجے میں برپا ہوگا اُس پر بہت ہی احتیاط سے نظر رکھنے اور اُس کی نہایت عقلمندی کے ساتھ رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے۔"



کشمیر میں مختلف مقامات پر کھدائی کے دوران برآمد یونانی سکے





جامع مسجد سرینگر ۱۹۱۸ء

'ویلی آف کشمیر' کی ہر سطر کے نیچے معلومات اور بصیرتوں کے شاندار خزانے رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی کوئی تلخیص سچّے معنوں میں اصل کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ اس کو سمجھنے اور خود کشمیر کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے کہ اس کو بہت گہرائی سے پڑھا جائے۔ اس میں شہنشاہ کنشک کے کنڈل وَن وِہار کے متعلق بھی اشارے موجود ہیں: اور کشمیری زبان کی نزاکتوں اور نفاستوں کے قصیدے بھی۔ اس میں کشمیر میں طبقۂ عالیہ کی عشرتوں اور عورتوں کے ساتھ اُن کے مدھر ملن کے قصے بھی ہیں اور کشمیری کسانوں پر نت نئے اور ہر موسم میں ہونے والے مظالم کا بیان بھی۔ اس میں اپنے وقت کے ممتاز کشمیریوں کا ذکر ہے۔ مثلاً پنڈت سورج کول کا 'جو اُس وقت مشیرِ مال تھے جب لارنس یہاں کارفرما تھے۔ لارنس نے اُن کی شخصیت کو خراج ادا کر کے اُن کے بارے میں کشمیر کی لوک روایتوں کی تصدیق کی ہے۔ یہ وہی سورج کول ہیں جنھیں کشمیری سِرج کاک کے نام سے جانتے ہیں اور جن کے بارے میں مہجور کا مشہور شعر ہے۔

رُچھ سِرج کاکن مسلمانن گبرِ گژنذر
دِل تتھے پاٹھی ملہٕ ناوَو پانہٕ واٗنی

(سرج کاک نے مسلمانوں کو اپنے بیٹوں کی طرح پالا۔ یہ وقت ایسی ہی باتیں یاد کرنے کا وقت ہے)

یہ صاحبِ تعظیم پنڈت رینہ واری میں رہتے تھے جہاں اُن کا دسترخواں غریب امیر کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا اور جہاں ہزاروں فاقہ مست سیر ہو کر کھاتے تھے۔ اُن کی غریب پروری کا ایک عجیب و غریب نمونہ رکھ شالنہ میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اُن کی جاگیر میں تھا اور اُن کے کاشتکار یہاں ''نمبِد'' (دھان کے کھیتوں سے فضول گھاس الگ کرنے کا عمل) کرتے رہتے تھے۔ ایک بار پنڈت صاحب خود وہاں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس لق دق کھیت میں دھوپ کا سانپ محنت کشوں کو ڈستا رہتا ہے اور جب وہ پیٹ کی آگ بجھانے یا پانی پینے کے لئے باہر آتے ہیں تو انہیں درخت تک کا سایہ نصیب نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُس نے وہاں درجنوں

چناروں کی قطاریں لگوادیں جو آج بھی اُس ننگ دھڑنگ علاقے میں بہت ہی شاندار اور بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہاں اُن کے کاشتکار چھاؤں میں بیٹھ کر پیٹھ سہلاتے تھے۔ کاش آج پنڈت صاحب زندہ ہوتے تو ان سایہ دار درختوں کی جولانی دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے[1]۔ اسی طرح اُس وقت کے بڑے مسلمان رئیس ثناء اللہ شال صاحب کا بھی جن کے مکانات آج بھی خانیار میں شانِ رفتہ کی کہانی سناتے ہیں اُن کے متعلق کشمیر لوک بات میں بھی ذکر ہے۔ ع

رؤ دھیوٚ ٹن والُن ☆ گرٛھ سونہ شالُن

لارنس کے ایک مشاہدے کو بیان کر کے میں اس لذیذ حکایت کو اُدھورا چھوڑ دوں گا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اُس کے زمانے میں جب اچھے گھروں میں کسی نئے بچے کی آمد آمد ہوتی تھی تو اُس کا پہلا پارچہ سوئی سے نہیں سِلا جاتا تھا بلکہ اُس کو کسی تیز دھار...... (قدرتی طور اُگنے والے) کانٹے کی مدد سے سلائی کرتے تھے۔ اس لئے کہ سوئی انسان نے بنائی ہے اور کانٹا خدا نے اُگایا ہے۔ اور عام عقیدہ یہ ہے کہ اگر کانٹے سے سلا ہوا کپڑا بچہ پہلے پہنے تو وہ لوہے (جس سے سوئی بھی بنتی ہے) کی بنی ہوئی تلوار کا ناجائز استعمال نہیں کریگا اور نہ انسان اور نہ ہی کسی جانور کا خون بہائے گا۔

☆☆☆

سر والٹر لارنس اب کشمیریوں کا اپنا اور سانجھا ورثہ بن گیا ہے۔ انگلستان میں اُس کی یاد موجود نہیں ہے مگر میرے خیال میں کشمیری اُس کو بھُلا نہیں پائیں گے۔ وہ لارنس آف کشمیر بن کے اُن کے لوک اور تاریخی حافظے کا حصہ بن گیا ہے اور آئندہ بھی بنا رہے گا۔ جون 2004 میں ریاست کے موجودہ ریونیو منسٹر حکیم محمد یٰسین نے اعلان کیا کہ سر والٹر کے 111 برس بعد کشمیر میں اُس کے بندوبست کی تجدید و ترمیم کرنے کے لئے ایک الگ محکمہ...... بندوبستِ اراضی...... کے نام سے قائم کیا جارہا ہے اور

---

[1] افسوس یہ ہے کہ ان شاندار درختوں کو بعض مفاد پرست سکھانے کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ کچھ چنار سوکھ بھی چکے ہیں۔ راقم الحروف وہاں موقعے پر گیا تو دیکھا کہ درختوں کی چھال اُتار دی گئی ہے۔ شاید اینٹ کے بھٹوں کے لئے جو نواح میں ہیں، مٹی حاصل کرنے کے لئے (م.ی.ٹ)

اُس کے بندوبست کو Up to date لانے کے لئے اقدامات شروع کئے گئے ہیں...... میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر کے محسنوں کا اگر ایک نگار خانہ اعزاز قائم کیا جائے تو اُس میں سر والٹر لارنس کی تصویر کو ضرور جگہ ملے گی۔ .... مگر اُس کے لئے نہ معلوم کب تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ فی الحال ہم کشمیری اپنے احسان کاروں کی پگڑیاں اُچھالنے کے شغل میں محو اور مشغول ہیں۔ شاید اس وقت ہماری کیفیت یوں ہے ع

غیر سے نفرت جو پائی خرچ خود پر ہوگئی
جتنے ہم تھے ہم نے خود کو اُس سے آدھا کرلیا



شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

- ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔
- ہندوستانی تاریخ و تمدّن اور ثقافت و اَدب پر مختلف پہلوؤں پر معیاری اور تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔
- ریاست کے تمدّنی اور فنّی وَرثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور شائع کئے جاتے ہیں۔
- فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوّری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔
- منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔ ....اِدارہ

پریمی رومانی ☆

ٹینڈل بسکو اور کشمیر

کشمیر صدیوں سے غیر ملکی سیاحوں کی توجّہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاح دُنیا کے مختلف ممالک سے دُشوار گذار مسافت کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ سیاحوں کا یہ جوق در جوق قافلہ نہ صرف یہاں کے خوبصورت نظاروں اور رُوح پرَور فضاؤں سے لُطف اَندوز ہوتا رہا بلکہ یہاں کی زبان، کلچر، تہذیب وتمدن یہاں کے تعلیم نظام سے بھی غیر معمولی دِلچسپی لینے لگا اور کشمیر کے ذرّے ذرّے پر اَپنے کارہائے نمایاں سے اُپنے نقوش مرتسم کرنے میں کامیاب ہوا۔ فرانسس برنیر، ہیون سانگ، رابرٹ تھروپ، ولیم مور کرافٹ، گریرسن، سرالیکزانڈر کننگھم، رچرڈ ٹمپل، بیرن چارلس ہیوگل، فرانسس ینگ ہسبنڈ اور سر والٹر لارنس کے نام تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اِن غیر ملکی سیاحوں نے اپنی ذہانت، صلاحیت اور محنت سے علم وادب، تاریخ و ثقافت اور لسانیات کے شعبے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور کشمیریوں کو وقت کی بے اعتنائی سے بے ہوئے اپنے عظیم ورثے کا احساس دلایا۔ بسکو کا نام بھی انہیں غیر ملکی سیاحوں میں لیا جاسکتا ہے جنہوں نے محنت لگن اور صلاحیت سے کشمیر میں جدید تعلیمی نظام رائج کرنے اور اس کو توسیع دینے میں اہم کارنامے انجام دیئے۔

بسکو نے کشمیر میں مغربی طرزِ تعلیم رائج کرکے اس کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھا، اس لئے وہ کشمیر میں مغربی تعلیم کے معمار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف مغربی

☆ پمپوش کالونی۔ نصیب نگر۔ جانی پور۔ جموں توی

تعلیم سے روشناس کرانے کے دَرپے تھے بلکہ اُنہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود، وَرزش، ناوٗ دوڑ (ریگٹا)، کوہ پیمائی، تیراکی، اسکاوٹنگ وغیرہ جیسی مہم بازیوں سے بھی کشمیریوں کو روشناس کیا اور اِسطرح سے اس قوم کو تعلیمی لحاظ سے بیدار کیا۔ اُنہوں نے انسانیت کی خدمت کرنا، تعلیم نسواں، کمزور اور پسماندہ طبقہ سے اظہارِ ہمدردی کرنا اور حیوانات اور پرندوں سے اَنصاف کرنے کو بھی حقیقی تعلیم کا درجہ دیا۔

بِسکو کا خاندانی نام سی، ای، ڈی ٹینڈل بِسکو ہے۔ وہ 1890 عیسوی میں پہلی بار کشمیر آئے۔ پہلے پہل اُنہوں نے یہاں کے ماحول، کلچر، تہذیب و تمدن سے آشنائی حاصل کی۔ اُنہیں محسوس ہوا کہ یہ قوم سالہا سال سے ظلم و استبداد کا شکار ہوئی ہے اور ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے لِہٰذا اُنہوں نے یہ خدمات انجام دینے کے لئے خود اپنے آپ کو وقف رکھا اور اس طرح سے عمر بھر کشمیری عوام کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔

بِسکو خوبصورت مناظر کے عاشق تھے۔ وہ کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں، خوبصورت پرندوں، رنگ برنگے پھولوں اور سنسان تاریک جنگلوں سے اِتنے مسحور ہوئے کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو یہاں کی عوامی زندگی کا حصہ بنا دیا۔ دراصل ان پہاڑوں اور جنگلوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں اُنہیں طلبا کو نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ عملی تعلیم کے بے شمار امکانات نظر آئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کی عوامی زندگی سے بھی دِلچسپی لینے لگے۔ اپنی کتاب میں ایک جگہ کشمیر کے حُسن اور اس کی خوبصورتی پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"Standing on these glorious pine-clad mountains and seeing through a clearing in the forest the whole vale of Kashmir Stretched before one's feet, One thinks of Moses on mount Pisgah viewing the promised land. For truly Kashmir is a land of milk and honey.Marys on your right and left provide grass in abundance for the oattle and flowers galore for the bee"[1]

---

1. Kashmir in sunlight and Shade: C.E Tyndale Bisco page 55

بسکو کی نظر بہت تیز، اور ذہن بیدار تھا۔ اُنہوں نے جلد ہی پہچان لیا تھا کہ کشمیر قوم صدیوں سے غلام در غلام زندگی بسر کرتی ہوئی آرہی ہے۔ اس قوم پر ہمیشہ ظلم وستم، دہشت و درندگی اور قہر ومصیبت نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ پسماندہ ہیں۔ باہر کی طاقتوں نے اس قوم کو جان بوجھ کر مفلوج بنایا ہے۔ یہ لوگ سیدھے سادے اور بہت ہی محنت کش ہیں۔ ان کے رَگ رَگ میں ہُنر مندی پائی جاتی ہے لیکن یہ لوگ ظلم واستبدار کی چیرہ دستی میں پِس گئے ہیں۔ اسی لئے یہ قوم بے حس وحرکت ہے۔ اُن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز سلب کیا گیا ہے اور اس قوم میں دقیانوسی خیالات نے ان کا دامن پکڑ لیا ہے۔ ان کے جذبات دبا کے رکھ دیئے گئے ہیں، اِسی لئے یہ لوگ توہمات میں گرفتار ہیں۔ سیّد رسول پونپر اپنے ایک مضمون "مِس میلنسن"، میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فلاکت زدہ، پسماندہ اور توہم پرست عوام کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مشنری سکول (Missionary school) قائم کئے گئے جیسا کہ ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے "جدید وقدیم" کی آپس میں ٹھن جاتی ہے، چنانچہ عیسائی مشنریوں کو بھی یہاں کشمیر میں کٹر پنتھیوں کی لازمی اور شدید مخالفت ومخاصمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تاریخ کے پہلوؤں کو پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے تھے، لیکن کامیاب کہاں ہوتے۔ رفتہ رفتہ اُن کا زور واُثر کم ہوتا گیا اور یہاں عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی [1]"

"بسکو" انسانیت کے سچے معنوں میں بے لوث خدمت گذار تھے۔ اُنہوں نے کشمیر میں جدید طریقہ تعلیم سے لوگوں کو آشنا کیا۔ اُس زمانے میں لوگ فٹ بال کو ہاتھ لگانا، چپو چلانا، مغربی علوم سے آشنا ہونا اور دریا پار کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ بسکو پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان چیزوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ دِل وجان

---

[1] ہمارا ادب "شخصیات نمبر"۔۲ (۸۶-۱۹۸۵) ص-۱۴۰

سے کشمیری عوام کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور لوگوں کی تنگ نظر تو ہم پرستی اور خوف ودہشت دور کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے رگ رگ میں خلوص کا جذبہ پایا جاتا تھا اور اسی جذبے نے اُنہیں اپنا مادرِ وطن انگلستان چھوڑ کر کشمیر میں رہائش کرنے پر مجبور کیا۔ تعلیم وتربیت اور کھیل کود کے جدید طریقہ کار کو کشمیر میں رائج کرنے اور اُنہیں تقویت دینے میں بِسکو صاحب کوششوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بِسکو انگلستان کے ایک زرخیز علاقے میں 1863 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ تعلیم وتربیت پائی۔ وہ شروع سے ہی حساس اور دردِل مند دِل رکھتے تھے۔ جب اُن کا شعور بالغ ہوا تو اُن کے دِل میں افریقہ کے دور دراز علاقوں میں رہنے بسنے والے لوگوں کے لئے بے پناہ درد پیدا ہوا۔ وہ دِل و جان سے اُن کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور زمانے کے اُتار و چڑھاؤ سے پیدا ہونے والے اُن کے دَرد وکرب کو دُور کر کے اُن کے زخموں پر پھاہا رکھنا چاہتے تھے لیکن نہ جانے وادی کشمیر کی کھُلی فضاؤں نے اُنہیں کیوں اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ پھر کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ امرناتھ مٹو، اپنے ایک مضمون میں بسکو کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:-

''فادر سی۔ای۔ٹینڈل بسکو، جو کہ کشمیر میں بسکٹ صاحب کے نام سے مقبول ہیں، آکسفورڈ کاونٹی کے ہالٹن نامی گاؤں کے ایک زمیندار ڈبلیو۔ای۔بسکو کے تیسرے بیٹے تھے۔ ایک خداترس گھرانے میں پلے بڑھے، فادر بسکو کی دلی تمنا غریبوں کی خدمت کرنا اور بدی کا خاتمہ کرنا تھا۔ موصوف پر افریقہ میں کام کی دُھن سوار تھی لیکن کشمیری عوام کی خدمت کرنا اور اُنہیں ظلمت سے نکال کر نُور کی طرف لانا اُن کا مقدر تھا۔ اُنہوں نے اپنا یہ مشن تندہی اور خلوص بھرے جذبے سے آگے بڑھایا۔ کشمیری عوام کی خوفناک پسماندگی یہاں کے سحر آفریں فطری حُسن کے قطعی برعکس تھی''[1]

---

[1] ہمارا ادب ''شخصیات نمبر ا''۔ (۸۵-۱۹۸۴ء) ص-۱۰۵

بسکو نے جب کشمیر کا سفر کیا تب وہ جوان تھے کام کرنے کی لگن تھی، دِل میں ارمان تھے اور آنکھوں میں خطۂ کشمیر کے لوگوں کی خدمت کرنے کی بے پناہ حسرت تھی۔ وہ بڑے چاک و چوبند تھے۔ ایمانداری اور ذہانت اُن کے رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ تعصب سے بالاتر اور رنگ نسل قوم اور مذہب کے ہتھکنڈوں سے آزاد یہ شخص اپنے وطن اور اپنے ماحول سے دور ایک ایسی منزل پر روانہ ہو چکا تھا جہاں اپنی سادگی کی وجہ سے لوگ جاگیردارانہ نظام کی بھٹی میں جل رہے تھے۔ بسکو اپنی کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

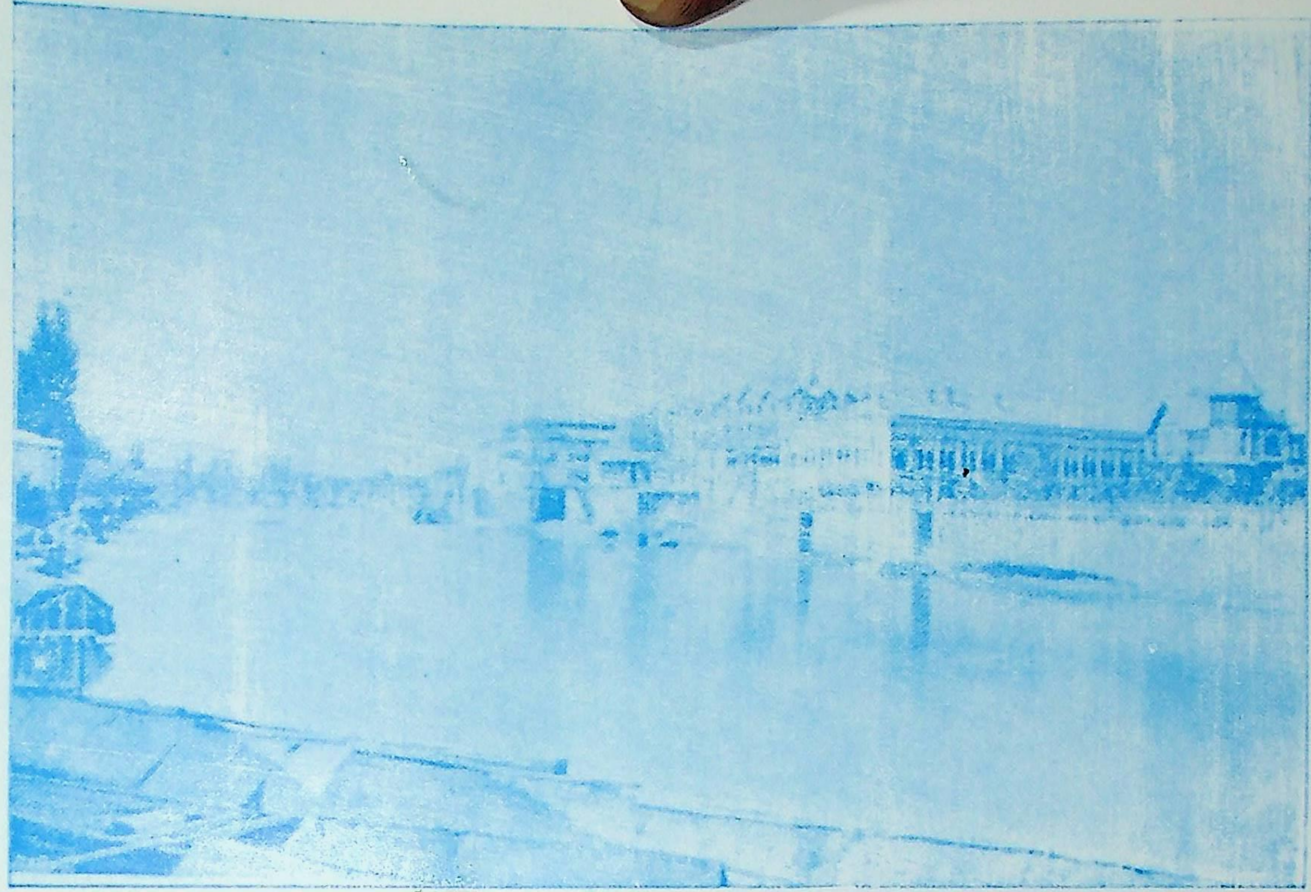
"Kashmir, being one of the most lovely countries of the world, very naturally become the desire of all who visited it, and the poor Kashmiri has been the servent and slave of various dynasties"[1]

کشمیر میں بسکو نے جب مشن اسکول کا چارج سنبھالا تو اُس وقت اس اسکول کے سربراہ ہنٹن نولز تھے جنہوں نے اٹھارویں صدی کے اُواخر میں اس سکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسکول چلانے کیلئے ابتداء میں بسکو کو مختلف دُشوار گذار منزلوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ بڑے نبض شناس تھے۔ اُن کی اُنگلی ہمیشہ لوگوں کی نبضوں پر رہتی تھی۔ اُنہوں نے چند باشعور لوگوں کو اپنے دائرہ اختیار میں لایا اور اپنی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ خدمتِ خلق اُن کی قوم کی پہچان تھی۔ یہ جذبہ اُن کے دِل میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ اس جذبے کو نہ صرف اپنی قوم تک محدود رکھنا چاہتے تھے بلکہ دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانا چاہتے تھے اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر بائبل مقدس کے حوالے سے بات کرتے تھے اور لوگوں کے دِلوں میں جوش، ولولہ اور لگن پیدا کرتے تھے۔ دوسروں کو دُکھ دینا، چوری کرنا، جھوٹ بولنا، کسی جانور کو مارنا، رشوت دینا، اشیائی خوردنی میں ملاوٹ کرنا، دوسروں کا حق تلف کرنا اور بد دیانتی سے کام لینے کے وہ شدید مخالف تھے وہ طلباء کو بھی اِن چیزوں سے دُور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

1. Kashmir in sunlight and Shade, by C.E Tyndale Bisco page 26



(۱۹۴۵ء)



امیرا کدل سرینگر کے پاس شیر گڈھی کے محلات (۱۹۱۸ء)



ایک کشمیری پنڈت خاندان

عربی اور شاردا کا سنگم - مزار کاں کا ایک سنگ مزار

بسکو سچّے معنوں میں کشمیر میں مغربی تعلیم کے بانی تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے تعلیم کی ترقی و فروغ کے لئے ایک لائحہ عمل مقرر کیا اور اُسی لائحہ عمل کو ریاستی حکومت نے اپنا کر جدید تعلیمی ڈھانچہ بنایا ہے۔ سماجی بہبود، جذبۂ اِنسانیت، تعلیم نسواں، کے ساتھ ساتھ حیوانات کو تحفظ دینا، طوفانوں کا مقابلہ کرنا، کمزور طبقہ کے لئے محبت کا جذبہ رُوا رکھنا، اور سچائی پر چلنا ہی بسکو کے مطابق حقیقی تعلیم ہے۔ بسکو کا زمانہ کشمیر میں سیاسی طور پر اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ سیاست کے علاوہ سماج میں بھی طرح طرح کی کوتاہیاں اور خامیاں نظر آتی تھیں۔ تعلیم لحاظ سے ہماری ریاست پسماندہ تھی لوگوں کو مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کے ذریعے سے تعلیم دی جارہی تھی۔

بسکو نہ صرف طلباء میں نصابی تعلیم عام کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ کھیل کود، ورزش، اسکاؤٹنگ، پہاڑی مہم سازی اور آبی کھیلوں کو بھی ترجیح دینا چاہتے تھے وہ اُن میں بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں۔ اُس زمانے میں لوگ ان چیزوں کی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ لہٰذا بسکو کے ان اقدامات پر حیرانی کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن بسکو ایک چٹان کی طرح اپنے قول و فعل کے پابند تھے۔ وہ لوگوں پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالتے تھے اور نہ اُنہیں پریشان کرتے تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے پروگرام کو جاری رکھا اور بڑی حوصلہ مندی سے پیش قدمی کرتے رہے۔ اُن کی زبان پر ہمیشہ یہ معنی خیز جملہ رہتا تھا کہ

"They say, what do they say, let them say; what they say"

بسکو زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف خود ہی پیش پیش رہتے تھے بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ اُنہوں نے طلبا کو طوفانوں سے لڑنا سکھایا اور اُن میں اعتماد کا جذبہ پیدا کیا۔ آبی کھیلوں میں بھی اُنہوں نے طلبا کو کشتی چلانا، غوطہ زنی، کشتی کھینچنا اور چپو چلانے کی مشق سے آشنا کیا۔ اُس زمانے میں کشتی چلانا عار سمجھا جاتا تھا اور سماج طلبا کو یہ کام انجام دینے پر نیچ نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن بسکو نے اسکول کے طلبا کی ایک ٹیم کھڑی کردی، طلبا کا یہ قافلہ کشمیری پنڈتوں پر مشتمل تھا[1] جو اِس مہم پر روانہ ہوا، اس پر سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔

---

[1] ہمارا ادب شخصیات نمبر ۱ (۸۵-۱۹۸۴ء) ص ۱۰۸

چپو چُرائے گئے لیکن بسکو نے اپنی عزت اور طلبا کی شان میں آنچ نہیں آنے دی بلکہ اپنے پروگرام کو جاری رکھا۔ چنانچہ نئے چپو بنوا کر طلبا میں تقسیم کر کے اس مہم کو کامیاب بنایا۔ وہ کشمیر کے جھیلِ وُلر پر کیمپ لگایا کرتے تھے اور اس طرح سے اُنہوں نے اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے لوگوں کے دِلوں سے سماج کی اس بدعت کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نیست ونابود کر دیا۔ یہ بسکو کا ایک اہم کارنامہ تھا۔ اسی طرح سے پہاڑی مہم میں بھی اُنہوں نے دِل وجان سے حصہ لیا اور طلبا کو اس مہم کی افادیت سے روشناس کیا۔ پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنا سماجی طور پر بُرا تصوّر کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا حوصلہ پست کرنے کے لئے ان چوٹیوں کو بھوت پریت کے خوف اور دہشت سے تعبیر کیا گیا تھا لیکن بسکو ایک بہادر اور نڈر انسان تھے۔ اُن کی نگاہیں تیز تھیں جو سماج کے کھوکھلا پن کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے کشمیر کے اُونچے پہاڑوں اور فلک بوس چوٹیوں کا بغور جائیزہ لیا تھا اور ان میں پہاڑی مہم بازی اور ٹریکینگ کے بے شمار امکانات دیکھے لہٰذا وہ اُن پہاڑوں کی چوٹیوں کا بھرپور استعمال کرنا چاہتے تھے اور طلبا میں عزم اور استقلال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی جذبۂ شوق نے اُنہیں 1934 عیسوی میں (Xaeri climbing club) کے نام سے ایک کوہ پیمائی کلب کا انعقاد کروایا۔ اس طرح سے اُنہوں نے لوگوں کے دِلوں سے خوف و دہشت کی یہ بیماری ہمیشہ کیلئے دور کی۔

اسکاوٹنگ کے شعبے میں بھی بسکو ماہر تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک انسان کے لئے اسکاوٹ بننا بھی لازمی ہے۔ اُنہوں نے طلبا پر یہ بات آشکار کر دی اسکاوٹنگ سے انسان چاک وچوبند رہتا ہے اور نڈر سپاہی کی طرح طوفانوں کے ساتھ بھی کھیلنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بسکو کے دور تک طلبا نہ صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ اور نہ وقت کی پابندی کا، نہ ملبوسات کا اور نہ جسمانی یا ذہنی نشو ونما کا۔ بسکو نے جب طلبا کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے دِل میں بار بار یہ سوال دستک دینے لگا کہ اس قوم کو تاریکی کے گڈھے سے نکالنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے کشمیریوں کے دِل ودماغ سے صدیوں سے پھیلی ہوئی اس بیماری کو

نیست و نابود کرنے کا تہیہ کیا اور وہ میدان میں کود پڑے۔ بعض اوقات اُنہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔

بسکو کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے طلباء میں عزم اور استقلال پیدا کیا۔ اُس زمانے میں سرینگر میں اکثر آگ کی وارداتیں رونما ہوا کرتی تھیں۔ بسکو نے طلبا میں آگ پر قابو پانے اور ہمدردانہ جذبہ روا رکھنے کیلئے جوش اور ولولہ پیدا تھا۔ اُنہوں نے سکول کے احاطے میں آگ بجھانے کے لئے بہت سا سامان خرید کر رکھا تھا اور طلبا کو تعلیم کے ساتھ ساتھ آگ پر قابو پانے کی ٹریننگ بھی دی تھی اور اس طرح سے اُن میں قومی جذبہ بیدار کیا۔

اسی طرح سے اُنہوں نے جانوروں اور پرندوں کو مارنے پر بھی پابندی عاید کردی تھی اور انصاف سے کام لینے کی تلقین کی تھی۔

اُنہوں نے اسکول کا ماٹو ہی کچھ اِس اَنداز سے بنایا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ دِل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا تھا۔ مثلاً

> "By the term man is meant one who combines in his nature both strength and kindness the idea of which is borne out by the crest. The paddle indicates hard work or strenght, and the heart shoped blade betokens kindness. The crossed paddles express self-sacrifice, and are a reminder to all men of him who taught that great lesson and all that his cross meant to the world."[1]

اس جائزے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ بسکو کو کشمیر کے ذرّے ذرّے سے کتنا پیار تھا اُنہوں نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی ساری زندگی وقف رکھی تھی اور جس تندہی اور ایمانداری سے اپنا فرض نبھایا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُنہیں اسکول کے طلبا اور اساتذہ پر فخر تھا۔ وِدھواوِواہ پر اُس زمانے میں سماجی طور پر پابندی عاید تھی لیکن بسکو نے سماج کے اس اندھے قانون کے خلاف بھی

---

1. Kashmir in sunlight and shade by C.E.Tyndale Biscoe page 309

صدائے احتجاج بلند کی ۔ اس طرح سے مہاراجہ ہری سنگھ نے 1928 میں اس قانون پر نظرِ ثانی کی اور کشمیری پنڈتوں میں دوسرا بیاہ جائیز قرار دیا گیا۔ پنڈت اَمرناتھ مٹو، جنہوں نے بسکو کا زمانہ دیکھا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

''یہاں تک کہ 1928ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوؤں میں دوسرے بیاہ کو جائیز قرار دیا۔ بسکو کے لئے یہ خوشی اور شادمانی کا لمحہ تھا۔ ایک عظیم کارنامہ اور ایک بہت بڑی فتح ۔ کسی ہندو بیوہ کو بیاہنے کی اوّلین مثال ان کے ہی ایک سٹاف ممبر، ہیڈ ماسٹر شنکر پنڈت، جو کہ واقعی عظیم تھے، نے قائم کی''۔[1]

بسکو کا ایک اور کارنامہ اُن کی کتاب ''Kashmir in sunlight AND shade'' ہے۔ یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے اور کشمیر کی تہذیب، تمدن اور کلچر کے بہت سارے پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔ 1890ء میں جب اُنہوں نے وادی کشمیر کی اور اپنے سفر کا آغاز کیا تو اُن کو کن منزلوں سے گذرنا پڑا، اس کی تمام داستان کتاب کے پہلے باب میں ملتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں بسکو وادی کشمیر کی خوبصورتی اور اس کے ماحول سے روشناس کراتے ہیں، چوتھا پانچواں اور چھٹا باب کشمیر کا بھرپور منظرنامہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے اور نئے کشمیر کا تقابلی مطالعہ آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمانوں کا رہن سہن، عادات واطوار اور اُن کے کردار کا جائیز پیش کیا گیا ہے۔ کشمیر کی مسجدوں اور مندروں گلیوں اور بازاروں اور کشمیریوں کے لباس و پوشاک پر اس کتاب میں مدلل بحث ملتی ہے۔ کتاب کے تین اُبواب میں لداخ کی تہذیب و تمدن پر بھی سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔ بسکو نے اس کتاب میں اُس دور کے تعلیمی نظام کا بھی بھرپور جائیزہ لیا ہے اور مشن سکول کی ترقی و ترویج میں جن لوگوں نے جی توڑ محنت کی ہے اُس کا اجمالی جائیز بھی زیرِ بحث کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتا ہے۔ بسکو نے کتاب کا انتساب اپنے محبوب اور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری شنکر کے نام ان

---

[1] ہمارا ادب (شخصیات نمبر ۱) (۸۵-۱۹۸۴ء) ص ۱۱۰

الفاظ میں کیا ہے۔

I must express my thanks to my headmaster Mr. Shankar Pandit, B.A. who has allowed me to draw upon his knowledge of the ancient history of Kashmir and of the various rites and cermonies, both of Hindu's and Mohammadans,with respect to birth, death, marriage etc. What my friend Shankar does not know concerning his country is not worth knowing. [1]

بسکو سچے معنوں میں کشمیر کے عاشق اور کشمیریوں کے ہمدرد تھے۔ اُنہوں نے اپنے کارناموں سے وہ نقشِ پا چھوڑے ہیں جو ہمارے جدید تعلیمی نظام کا پیش خیمہ ہیں۔



قلم کار حضرات توجہ فرمائیں

☜ اپنی غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ نگارشات کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھ کر بھیجئے۔

☜ شیرازہ میں شامل ہونے والی تخلیقات کا مناسب معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔



1. Kashmir in sunlight and shade by C.E.Tyndale Biscoe.page 12

عبدالغنی شیخ☆

لداخ۔غیر ملکی سیّاحوں کی نظر میں

لداخ صدیوں سے سیاحوں، محققوں اور مُہم جوؤں کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کے بُلند و بالا پہاڑ، دُشوار گزار درّے اور بے آب و گیاہ میدان مہم جوؤں اور من چلے سیاحوں کی مہم جوئی اور شوقِ سفر کی راہ میں حائل نہیں ہوئے ہیں۔ لداخ کا جغرافیائی محل وقوع مسافروں اور مہم جوؤں کے لئے اہم گزر گاہ کا کام دیتا رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لداخ کے راستے مسافر، حملہ آور، علما، مبلغین اور محققین تبت، چین اور وسطِ ایشیاء آتے جاتے رہے ہیں۔ لیہہ صدیوں سے وسط ایشیاء کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ گرمیوں میں یہاں کے بازار میں سنٹرل ایشیا کے علاوہ تبت، شمالی ہندوستان، سائبیریا اور افغانستان تک کے تاجر جمع ہوتے تھے اور مختلف اشیاء کا بتادلہ اور خرید و فروخت کرتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے بہت سارے ممالک برطانیہ، امریکہ، روس، چین، سویڈن، آسٹریا، ہنگری، بھوٹان، نیپال، تبت، فرانس، جرمنی، جاپان، افغانستان، ناروے، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ سے

☆ یاسمین گیسٹ ہاؤس۔فورٹ روڈ۔لیہہ لداخ (جے اینڈ کے)

ہزاروں سیّاح وارِدِ لداخ ہوئے۔ ان میں عام سیاح سے لے کر ماہرینِ حیاتیات، ماہرینِ نباتات، ماہرینِ بشریات، ماہرینِ طبعیات، ماہرینِ طیور اور حشرات الارض، نقشہ ساز، آثارِ قدیمہ اور دوسرے شعبوں کے ماہرین تھے۔ ان میں بیسیوں نے اپنی یادداشتیں، روزنامچے اور سفرنامے لکھے ہیں جو اُس دَور کے لداخ کے لوگوں کی سماجی، ثقافتی اور مذہبی زندگی، سیاسی حالات اور دوسرے عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان سفرناموں اور تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کیلئے لداخ کی سنگلاخ چٹانوں، بے آب وگیاہ میدانوں، کھاری جھیلوں اور برف پوش کہساروں میں بے پناہ کشش اور جاذبیت تھی۔ سخت جسمانی تکالیف اور بڑے مالی اخراجات برداشت کرنے کے بعد جب لداخ میں وہ اپنی منزل پالیتے تو انہیں بے پایاں مسرّت حاصل ہوتی اور بے ساختہ کہتے ہیں کہ ان کی ریاضت بے کار نہیں گئی۔

اکبر کے نورتن اور وزیر ابوالفضل نے 'آئینِ اکبری' میں لداخ اور تبت کا ذکر کیا ہے۔ آئینِ اکبری ۱۸۹۵ء میں لکھا گیا تھا۔ مغل اور کشمیری مورخین نے لداخ کو تبت، تبتِ کلاں اور تبتِ بزرگ لکھا ہے۔ اس لئے قارئین کو کئی دفعہ اصلی تبت اور لداخ میں فرق کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ تاہم دونوں کی تاریخ اور ثقافت میں یکسانیت کی وجہ سے مؤرخین کی تحریروں کا دونوں خطوں پر اطلاق ہوتا ہے۔

آئینِ اکبری میں لکھا ہے۔ ''تبت میں آج کل لاموں کا ایک طبقہ یا منگول پجاری، گوشہ نشین اور تارک الدنیا ہیں جو دوسو سال یا اس سے زیادہ زندہ رہتے ہیں۔''

اکبر نے اس پر یقین کیا اور ابوالفضل لکھتا ہے: ''اِسی سبب جہاں پناہ نے اِن لاموں کے طور طریقوں کی تقلید میں حرم میں اُپنے رہنے کا وقت محدود رکھا۔ کھانا پینا خاص طور پر گوشت کے پکوان کا استعمال کم کیا۔ انہوں نے چندیا کے بال کاٹ لئے اور کناروں پر بال بڑھنے دئے۔ کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایک مکمل آدمی کی روح کی آمد موت کے وقت ہوتی ہے اور چندیا سے بادلوں کی گرج کے سے شور کے ساتھ

نکلتی ہے جو اِنسانی بدن کا دسواں سوراخ ہے۔ اِسے مَرتا ہوا آدمی اپنی خوشی اور گناہ سے رستگاری کا ثبوت سمجھتا ہے اور اِس بات کی علامت سمجھتا ہے کہ اس کی رُوح عملِ تناسخ سے کسی عظیم اور طاقت ور بادشاہ کے بدن میں داخل ہوگی۔"

ابوالفضل نے لداخ میں دریائے سندھ کے صاف اور شفاف پانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پینے کیلئے صحت بخش ہے اور اتنا شفاف ہے کہ مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ انہیں آہنی نیزے مارتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے بھی انہیں پکڑتے ہیں۔

آئینِ اکبری میں یاک کی غیر معمولی شکل وشباہت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ جہاں نامہ میں سترھویں صدی میں عنایت خان نے لکھا ہے کہ جہانگیر (۱۶۰۵-۲۷) نے تبت اور لداخ پر مغل عمل داری قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور کشمیر کے گورنر ہاشم خان نے حملہ کیا لیکن ناکام ہوا۔

مصنّف نے کتاب میں جن میوہ جات کا ذکر کیا ہے، یہ سارے میوے لداخ میں نہیں، تب بلتستان اور جزوی طور پوریگ (علاقہ کرگل) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں خوبانی، ناشپاتی، خربوزہ، انگور، شہتوت وغیرہ شامل ہیں جو بڑے مزیدار ہیں۔

مرزا حیدر نے اس سے پہلے تاریخِ رشیدی میں لداخ سے متعلق لکھا تھا کہ زیادہ تر علاقوں میں بلندی اور سخت سردی کی وجہ سے صرف شلغم اُگتا ہے اور ایک قسم کا جَو اُگایا جاتا ہے، جو دو ماہ میں پکتا ہے۔ کچھ علاقوں میں موسمِ گرما صرف چالیس روز رہتا ہے اور اس دوران میں بھی آدھی رات کو دریا جم جاتے ہیں۔

لداخ کو شکار جنت کہا جاتا ہے۔ بہت سارے یورپی شکار کیلئے آتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں زارِ روس نے وسطِ ایشیا کی چند مسلم مملکتوں پر قابض ہونے کے بعد برصغیرِ ہند کی طرف پیش قدمی کی اور ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ گلگت اور لداخ ان کے پہلے ہدف تھے۔ برطانوی ہند سے سرکار کو بڑی تشویش ہوئی اور خطّے کا سروے کرنے کیلئے ماہرین، روسی فوجوں کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے کیلئے جاسوس اور سفارتی

مشن روانہ کیئے۔ ان کی رپورٹ خطے کے جغرافیہ اور سیاسی حالات کی عکاسی کرتی ہے۔

ابتداء میں سیاح جان ہتھیلی پر رکھ کر بِلا اجازت لداخ میں داخل ہوتے لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور وسطِ ایشیا کے مابین تجارتی معاہدہ ہوا تو سرینگر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ لداخ جانے والے سیاحوں کو پروانۂ رہداری اجرا کرتا تھا۔ لداخ کی محدود پیداوار اور وسائل کے پیش نظر محدود تعداد میں سیاحوں کو لداخ جانے کی اجازت ملتی تھی۔ بہت سارے سیاحوں کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کسی کسی سال لداخ اور بلتستان شکار پر جانے والوں کی تعداد چار سو تک پہنچتی تھی۔ کئی سیاح لداخ آکر اپنے قیام کی معیاد میں توسیع کرتے تھے۔ کئی دوبارہ لداخ میں سیاحت کی اجازت حاصل کرنے کیلئے درخواستیں دیتے تھے۔ موسم گرما میں سیاحوں کا تانتا بندھتا تھا۔ لداخ کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ چند اہم منزلوں پر چولہے کی آگ ابھی گرم ہی ہوتی کہ دوسرا یورپی سیاح پہنچ جاتا۔

یُورپ کے مہم جوؤں، سروے کرنے والوں اور سیاحوں نے لداخ میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ انہوں نے لداخ کا چپّہ چپّہ چھانا، برفانی چوٹیاں سرکیں۔ گہری جھیلوں کی تہہ معلوم کی۔ مختلف شاہراؤں کی پیمائش کی۔ چنگ چھنمو، قراقرم اور اکسائی چن کے بے آب و گیاہ میدانوں اور گھاٹیوں کی دشت نوردی کی۔ گلیشروں پر راتیں گزاریں۔ کئی یورپی سیاحوں نے لداخی اور تبتی زبانوں میں مہارت تامّہ حال کی۔ تمدّن، ثقافت اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ لداخ کے آثارِ قدیمہ، نسل، طبعی ماہیت اور چٹانوں پر سائنسی تحقیق کر کے کتابیں لکھیں۔ مختلف مقامات کی بلندیاں اور درجہ حرارت معلوم کیا۔ کئی سیاح لداخ کی بودھ خانقاہوں میں جھوٹا موٹا کھانا کھاتے ہوئے علم، تجسس اور تحقیق کی پیاس بجھاتے رہے۔ کئی سیاحوں نے سفر کے دوران اپنی جانیں گنوائیں۔ آج بھی لیہہ میں اُنیسویں صدی میں آنے والے محققوں سٹولیکزا، ڈیلگلیش، ہربرٹ نور اور کئی دوسرے سیاحوں کی قبریں ماضی کی مہم جوئی کی یاد دلاتی ہیں۔

لداخ آنے والے سیاحوں میں کئی مہم جواور من چلی عورتیں بھی گذری ہیں۔
مسز ہاروے ۱۸۵۰ اور ۱۸۵۱ء میں دومرتبہ لداخ آئی۔ دوسری مرتبہ وہ اکیلی تھی۔
مسز بُلاک ورک مین نے ۲۲،۸۰۰ فٹ بلند ایک چوٹی سرکی۔ ہالینڈ کی ایک خاتون مسز ویسر Visser اوراس کے شوہر نے قراقرم کے گلیشروں کا کھوج لگایا۔
لداخ پر لکھی گئی کتابوں میں ایسی اور کئی عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے اور ایک مقالہ میں ان کے کارناموں کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔

اُس زمانے کا لداخ آج سے بہت مختلف تھا۔ سفر اِنتہائی کٹھن تھا۔ اُونچے مقامات تو درکنار، سرینگر اور لیہہ کے درمیان راستہ اتنا خراب تھا کہ مسافروں کو گھٹنوں اور پیٹ کے بل چلنا پڑتا تھا۔ کہیں بالکل تنگ راستوں پر چلنا پڑتا تھا جہاں ہر لمحہ سینکڑوں منزل گہرائی میں گرنے کا خدشہ رہتا تھا۔

۱۹۷۴ء میں لداخ کو دوبارہ سیاحوں کیلئے واگذار کیا گیا، تب سے ہر سال ہزاروں غیر ملکی سیاح لداخ آتے رہے ہیں۔ کئی غیر ملکیوں نے لداخ کی تاریخ، تمدّن اور فنونِ لطیفہ پر بصیرت افروز کتابیں لکھی ہیں۔ ریسرچ سکالروں نے لداخ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا ہے اور اُنہوں نے تھیسیس چھپائے ہیں۔

لداخ کے کئی دیہات میں چٹانوں پر براہمی، کھروشتی اور شاردا تحریریں ملی ہیں۔ مغربی ماہرین کے مطابق یہ قبل مسیح اور کُشن دور حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کئی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ پہلی یا دوسری صدی میں پائین لداخ میں کشان خاندان کی حکومت تھی۔

لداخ کے سرحدی گاؤں ٹانکچے میں ایک چٹان پر سُریانی تحریر ملی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ Nestorian نسطوری مسیحوں کا کام ہے جو یہاں سے گذرے تھے۔ اس گاؤں کے مضافات میں کئی عرب نام اور کم سے کم قرآن مجید کی ایک آیت چٹانوں پر لکھی ملی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نام آٹھویں صدی سے دسویں صدی کے درمیان لکھے گئے تھے۔

اسی طرح لداخ آئے ہوئے قدیم دَرد وں چٹانوں اور پتھروں پر گوناگوں

تصویریں بنائی ہیں۔ یہ سارے سنگ تراش گمنام ہیں۔

لداخ آنے والے بلند پایہ رشی منی، علمائے کرام اور برگزیدہ خدارسیدہ بزرگوں نے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا ہے۔ ان میں پدما سمبھاوا، ناروپا، میر سید علی ہمدانیؒ، زین شاہ ولی اور نصیب الدین غازیؒ شامل ہیں۔ ایسے بہت سارے خدا کے نیک بندے، مہم جو اور محقق آئے ہوں گے جنہوں نے اپنی سرگذشت نہیں لکھی ہے اور گمنام ہیں۔

قدیم لداخ سے متعلق مورخوں کو بہت کم مواد ملا ہے۔ چینی سیاح فاہیان، ہیون سنگ[1] اور اوکونگ نے اپنے سفرناموں میں قدیم لداخ کا ذکر کیا ہے لیکن لداخ میں ان کی آمد سے متعلق کوئی تحریری ثبوت نہیں ملا ہے۔

فاہیان نے چوتھی صدی میں لداخ کو کچھاپا یا خاچن پا کہا ہے۔ ''خا'' لداخی میں برف کو کہتے ہیں۔ خطے میں برف باری کی مناسبت سے نام پڑا ہونا چاہئے۔

ساتویں صدی میں ہیون سنگ نے لداخ کی سرحد کے پاس کلو سے لاہول کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ ''یہاں سے شمال کی جانب راستہ بڑا کٹھن ہے۔ ٹھنڈی اور برفیلی ہوائیں چلتی ہیں''۔ تب مولوسو کی قلمرو میں پہنچتا ہے۔ ہیون سنگ نے مولوسو کو ساموہو بھی کہا ہے۔ مولوسو اور ساموہو لداخ کے دو قدیم ہم نام ہیں۔

تاریخ میں پہلے پہل یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے بلاواسطہ طور لداخ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے پانچ صدی قبل لکھا تھا کہ ہندوستان کے شمال میں سونا نکالنے کی چیونٹیاں ہیں۔ انہوں نے پانچ صدی قبل مسیح لکھا تھا کہ ہندوستان کے شمال میں سونا نکالنے والی چیونٹیاں ہیں جو کتوں سے چھوٹی اور لومڑیوں سے بڑی ہیں۔ یہ زمین کو کھود کر اس کی گہرائی سے سونا نکالتی ہیں۔ دراصل یہ Marmots تھے جن کو لداخی میں پھیا کہا جاتا ہے۔ اس کا بل زمین کی بڑی گہرائی میں پایا جاتا ہے۔ ماضی میں لداخ میں دریائے سندھ کے کنارے کچھ سونا نکالا جاتا تھا۔ یہ زیرِ زمین رہنے والا پھیا

[1] ہیون سانگ

اپنے بل کے باہر مٹی کے جو ڈھیر لگاتا تھا۔ غالباً اس میں سونے کے ذرات اور کچھ سفوف ملتے ہوں گے۔

پہلے پہل لداخ میں اپنے سفر کا تذکرہ کرنے والا ایک کوریائی یاتری ہوئی چاؤ ہے۔ وہ ۷۲۷ء میں ہندوستان سے سنٹرل ایشیا روانہ ہوا تھا۔ اس نے بڑا پُولو اور دو مقامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ علاقے تنگ ہیں۔ پہاڑ اور وادیاں دشوار گذار ہیں۔ یہاں گنپے اور بھکشو ہیں اور لوگ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ تبت، بدھ مت سے انجان ہے اور کوئی گپہ نہیں ہے۔ تب بڑا پولو، بلتستان کو کہتے تھے۔

سیاحوں نے لداخ کے قدرتی مناظر کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہتوں کیلئے لداخ ایک عجوبہ تھا۔

رابرٹ شانے بہت سال پہلے کہا تھا "لداخ کی یہ بستیاں کسی اور ملک کی لگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کو قینچی سے تراش کر ایک ریگستان میں چپکا دیا گیا ہے۔"

ایولے اور مے نے ۱۹۲۶ء میں لداخ سے متعلق کہا تھا "ہم ایک ایسے ملک میں پہنچے ہیں جو کسی اور سیارے کا حصہ لگتا ہے۔ جس دنیا کو ہم جانتے ہیں اس سے یہ بالکل مختلف ہے۔"

ایک انگریز فوجی افسر میجر کومپارٹنر المعروف گنپت نے اپنی کتاب Magic Lada-kh میں لکھا ہے: لداخ بلوچستان سے ملتا جلتا ہے۔ بلوچی کہتے ہیں "جب خدانے دنیا بنائی تو بچے کھچے پتھر، مٹی گارا وغیرہ ایک ڈھیر کی صورت میں نیچے پھینک دیا۔ یہ ڈھیر بلوچستان ہے"۔ لیکن لداخ کے معاملے میں روزانہ اپنے برش اور رنگوں کی گونا گونی سے اس میں تبدیلیاں لاتی ہیں تا کہ صبح شام پہاڑوں کے بدلتے رنگ دیکھ کر لوگ خدا کو یاد کریں۔ ان پہاڑوں میں تتلی کے پر، جنگلی پھولوں، سمندر کے کہرے اور قوس قزح کی رنگت ہے۔

لداخ میں مختلف شکلوں اور رنگوں کی چٹانیں اور پہاڑ ہیں۔ کئی مقامات پر

چٹانوں میں بڑے بڑے سوراخ ہیں ۔ترکی تاجروں نے ان کو کبوتر خانہ کہا ہے۔ لارڈ ڈینمور The Pamir میں رقم طراز ہے۔"مغربی تبت (لداخ) میں وادی شایوق کو دیکھنے سے پہلے میں سوچتا تھا کہ کشمیر کے نظاروں کا ثانی نہیں"۔

غیر ملکی سیاحوں نے لداخ کو غالباً اس کی خاموش اور پُرسکون بستیوں کی وجہ سے Hermits Kingdom یا گوشہ نشینوں کی قلمرو کہا ہے۔

سطح سمندر کی بلندی کی وجہ سے لداخ کو بامِ عالم یا دنیا کی چھت بھی کہا جاتا ہے۔ سیاحوں کا دیا ہوا ایک مقبول نام (Moon land) چاند کی سرزمین ہے۔

ای ایف نائٹ آج سے تقریباً ایک سو دس سال پہلے لداخ میں لامایورو کی بودھ خانقاہ میں پہنچا تو اس کی دلی کیفیت داستانِ الف لیلیٰ کے اس مسلمان شاہزادے کی سی تھی جو بُت پرستوں کے ایک عجیب و غریب ملک میں پہنچتا ہے۔

سی ای ٹینڈل بسکو لکھتا ہے۔"خانقاہوں اور لاموں کے اس عجیب وغریب ملک سے متعلق تاثرات بیان کرنا مشکل ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِنسان تصوّرات اور خیالات سے ماورا ایک دنیا میں آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے بدن کی چٹکی لے کر دیکھوں کہ آیا جاگا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں"۔

گنپت کو لداخ اور اس کے لوگوں سے گہرا لگاؤ تھا۔اپنے تاثرات وہ ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے۔"عموماً برفانی چوٹیاں، خصوصاً لداخ میرے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔.................... یہ سپنوں اور تخیلات کا دیش ہے ....

مجھے تعجب ہے، مسٹر گاندھی لداخ کیوں نہیں آئے؟ یہاں وہ لگ بھگ وہ ساری چیزیں پا سکتے تھے جن کے وہ متلاشی ہیں۔ جب کبھی میں لداخ آیا میرا میلانِ طبع گاندھی جی کے افکار کی طرح مائل ہوا"۔

ڈاکٹر ہیبر لہیہ کی عیسائی مشنری سے وابستہ تھے۔ وہ لداخ میں بہت سال رہے۔اس کے باوجود لداخ کے رسم ورواج ان کیلئے معمہ تھے۔ موصوف اپنی کتاب

Himalayan Tibet میں لکھتے ہیں: ہم یقیناً ایک عجیب وغریب سرزمین پر آئے ہیں جہاں کا باوآدم میں نرالا ہے۔ جہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمارے نظریئے میں جو اصول دُرست ہیں وہاں ان کے اُلٹ ہیں۔

سیاحوں کیلئے لداخ کے ویران پہاڑوں، ننگے میدانوں اور عجیب وغریب رسم و رواج میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد دوسری مرتبہ دیکھنے کی حسرت رہتی تھی اور آرام وآسائشوں سے بھری پری مہذب دنیا میں پہنچ کر انہیں دلی افسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اے ای وارڈ اپنی کتاب The Tourists and sportrmans Guide to Kashmir and Ladakh میں رقم طراز ہے۔"لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں آخر کونسی کشش ہے کہ ہم کشمیر کے ہریالے مرغزاروں سے اِن بنجر بانجھ اور سرد علاقوں میں گھومنے جاتے ہیں؟ لیکن ہم پھر بھی جاتے ہیں اور بار بار جاتے ہیں۔"

گپت جب لداخ کے پہاڑوں کو پیچھے چھوٹ کر آتا ہے تو اظہار تأسف ان الفاظ میں کرتا ہے۔"تہذیب کی عشرتوں اور گوناگوں آسائشوں کی طرف پلٹ کر دیکھو گے جن کے پیچھے وہ درہ پنہاں ہے جہاں سے تم آئے ہو اور تاسف کے دھیمے دھیمے احساس سے اس طرف دیکھتے رہو گے۔"

سیاحوں نے لداخ کو شنگریلا یا آخری شنگریلا بھی کہا ہے۔ شنگریلا سمبھالا کا ہم معنی ہے۔ بودھ عقیدے کے مطابق یہ ماورائی خوبصورت جنت نما دیش ہماری اس دنیا میں کہیں پوشیدہ ہے۔

ماضی میں لداخ آنے والے سیاحوں کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی اور تجارتی مقاصد پر لداخ آنے والے برطانوی ہند کے نمائندے ان میں مور کرافٹ (۱۸۲۰ء) کپتان جی ڈی کینگھم (دسمبر ۱۸۴۱ء) الیگزنڈر کینگھم (۴۷-۱۸۴۶ء) سرہنری لارنس اور لیڈی لارنس (۱۸۵۰ء) کپتان منٹگمری جانسن

فریڈرک ڈریو وغیرہ شامل ہیں۔

کپتان جی ڈی کینگھم کو برطانوی ہند سرکار نے دسمبر ۱۸۲۱ء میں تبت پر وزیر زورآور سنگھ کی فوج کشی روکنے اور ڈوگرہ فوج کے انخلا کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیجا۔

الیکزنڈر کینگھم (مصنف لداخ) مہاراجہ گلاب سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ایک معاہدہ کے تحت لداخ اور تبت کی سرحد کے تعین کیلئے ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۷ء میں دو مرتبہ لداخ آیا۔

۲/ لداخ کے راستے چینی ترکستان وسطِ ایشیا چین، تبت، وغیرہ وقتاً فوقتاً سیاسی تجارتی اور سائنسی مہمیں روانہ ہوتی رہیں ہیں۔ان کی فہرست لمبی ہے۔ان میں فورتھ مشن ۱۸۷۳ء پامیر سے یارقند اور وسط ایشیا میں ینگ ہاسبنڈ کی سیاسی مہمات ۱۸۹۰ء لارڈ ڈینمور کی مہم پامیر ۱۸۹۲ء بیجنگ میں کپتان سرنیل ملکولم اور کپتان ویلبے (۱۸۹۶ء) کی مشن، مہم ہیڈین (۱۹۰۸ء۔۱۸۹۶) سمیت اور کئی مہمیں شامل ہیں۔ان کے علاوہ جانسن، رابرٹ شا، کیلئے بوور اور بہت سارے انگریز افسروں نے مختلف مشن پر مشرقی ترکستان کا سفر کیا۔

سلک روڑ اور صحرائے گوبی میں لوب نور اور اس کے آس پاس آثار قدیمہ کے انمول خزینے کی تلاش میں لداخ سے کئی سائنسی مہمیں گزریں۔ان محققوں میں دو اہم نام سرارل سٹین، سون ہیڈین اور رانل پیلیوٹ ہیں۔سلک روڑ پر متعدد مقامات پر ایک ہزار بدھ غاریں دریافت ہوئیں۔کئی غاروں میں سنسکرت، چینی، براہمی، کھروشتی، شاردا اور دوسری زبانوں کے متعدد مخطوطات ملے۔

۳/ قدرت کے سربستہ رازوں کا انکشاف کرنے والے مہم جو سیاح اور سروے پر آنے والی ٹیمیں اس زمرے میں بہت سارے مہم جو اور من چلے سیاحوں کے نام آتے ہیں۔

اڈولف شلیے گین ویٹ پہلا یورپی سیاح تھا جس نے ۱۸۵۷ء میں لداخ کے

اَکسائی چین اور چنگ چھنمو کے ویران اور دشوار گذار خطے کو عبور کیا اور چینی ترکستان پہنچا۔اس کے بعد متعدد یورپی محققوں اور سیاحوں نے یکے بعد دیگرے لداخ کے مختلف علاقوں، گلیشروں، جھیلوں، دشوار گذار درّوں، اُونچے پہاڑوں وغیرہ کا سروے کیا۔ جن میں چند اہم نامہ گوڈوین اسٹین، ڈریو، ٹروٹر، رچرڈ لیڈیکر، تالبوٹ، ہیورڈ شا، کیرے، ریال Rvall مسز ورک مین، فیلپوفلپس، اُجی فاروی Ujifarvy، ولیسر وغیرہ ہیں۔

چین کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۹۱ء میں دو چینی ہے ین اور لی یو آن پینگ کی سرکردگی میں دو ٹیموں نے لداخ کے اَکسائی چین اور اینگوی تھنگ کی جنوب مغربی اور شمالی مغربی سرحدوں کا الگ الگ سروے کیا۔

۴/موراوین اور کیتھولک مشنوں کے محققین

۱۸۸۵ء میں مشن نے لیہہ میں ایک شاخ قائم کی۔اس کے پانچ سال بعد ۹۱-۱۸۹۰ میں کیتھولک مشن کا قیام عمل میں آیا۔

تبلیغی مقاصد سے قطع نظر مشن کے ڈاکٹروں اور پادریوں کی زندگی ایثار، قربانی، بے لوث خدمات اور عملی تحقیقات کی ایک لمبی داستان ہے لداخیوں میں مشن کے اَرکان بڑے مقبول تھے۔اُنہوں نے زندگی کا بڑا حصہ یہاں گذارا اور کئی یہاں کی زمین میں جذب ہوئے۔

مشن سے وابستہ کئی پادریوں نے لداخی اور تبتی زبانوں میں یدِطولیٰ حاصل کیا۔لداخ کی تاریخ تمدّن، فنونِ لطیفہ اور زبان پر ریسرچ کئے اور کتابیں لکھیں۔ان میں جیکشے، فرانکی، مارکس، ریباک، ہپر، پیٹر اور والٹر اسیو مشہور ہیں۔

۵/لداخ آنے والے عام سیاح

لداخ آنے والے عام سیاحوں کی بھاری اکثریت مذکورہ بالا مہم جو سیلانیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیجے گئے نمائندوں اور افسروں سے مختلف ہے۔ یہ سیاح کے عام

مستعمل اور مسلّمہ معانی پر پورا اُترتے ہیں۔ یہ سیلانی شکار کھیلنے، بودھ خانقاہیں دیکھنے، عجیب وغریب معاشرت اور رسوم کا مطالعہ کرنے اور ذوقِ سیاحت کی تسکین کیلئے لداخ آتے تھے۔

لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں دنیا کے چند مشہور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ یہاں کا جنگلی بکرا ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اسکی کئی قسمیں ہیں۔ کسی نے لداخ کو Ovis Poli (ایک قسم کا جنگلی بکرا) اور کسی نے Ovis Ammon (مقامی نیان) کی سرزمین کہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کیل، مشکِ نافہ والا ہرن، برفانی چیتا، جنگلی یاک، جنگلی گدھا، بتتی غزال، مارخور، بارہ سنگھا، ہرگ، ریچھ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں مشکِ نافہ والا ہرن، مارخور اور بارہ سنگھا اب معدوم ہوگئے ہیں۔ کم سے کم ایک درجن شکاریوں جیسے جرنیل کینلوچ، جرنیل مسین ٹائر، کرنل ڈورانڈ، کرنل وارڈ، کرنل ہیبر جیسے برطانوی ہند کے اعلیٰ فوج افسروں اور کئیوں نے اپنے شکار کے تجربات کو کتابی صورت دی ہے۔ یورپ کے شکاری لداخ میں جنگلی بکروں کے خوبصورت اور لمبے سینگ جمع کرتے تھے جن کو وہ اپنے ڈرائینگ روم کی زینت بناتے یا برٹش میوزم اور عجائب گھروں کی نذر کرتے تھے۔ کئی لداخی جنگلی جانور یورپ کے مہم جو محققین کے ناموں سے منسوب ہیں۔ مشہور جنگلی بکرے کو Hodgrons sheep مقامی شاپو یا Uryal کو Vignes sheep اور خرگوش کی ایک قسم کو Stoliczka's Mouse Hare بھی کہتے ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں کل چارسو شکاری شکار کھیلنے لداخ اور بلتستان گئے۔ یہ مختلف پہاڑوں اور وادیوں میں پھیل جاتے تھے۔

یورپی شکاریوں اور مقامی غیر ذمہ دار شکاریوں نے لداخ کے جنگلی جانوروں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ آج کل جنگلی جانوروں کا شکار ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

لداخ آنے والے بہت سارے یورپی سیاح یہاں کی بودھ خانقاہوں،

مورتیوں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں، ناچ اور نغموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ لداخ میں دستیاب چینی پیالیاں، اژدھا، مور دوسرے بیل بوٹوں والے چینی کپڑے، تبتی برتن، تانبے کی چائے دانیاں، قالین، چینی ترکستان کا ریشم اور دوسری مصنوعات سیاحوں کو لداخ کھینچتی تھیں۔

۱۹۴۸ء کے بعد لداخ میں بیرون ملکوں کے سیاحوں کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی۔ تاہم کئی غیر ملکی اجازت لے کر لداخ آئے اور کبھی کبھی ذوقِ سیاحت کسی کو اجازت لئے بغیر کھینچ لایا ہے۔ جو دورِ رفتگان کی یاد دلاتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں چند امریکی اور انگریز سیاح جن میں دو عورتیں بھی تھیں، پائن کے جنگلات سے ہوتے ہوئے وادیٔ وردوان کے درّے سے خطرناک گلیشیر پر چل کر پا پیادہ اچانک کرگل پہنچے جہاں سے ان کو واپس کر دیا گیا۔

وسطِ ایشیا سے تجارتی تعلقات منقطع ہونے کے بعد تجارتی لحاظ سے لداخ کی افادیت ختم ہو گئی ہے۔ جن شاہروں پر صدیوں تک اونٹوں اور گھوڑوں کی ٹنٹناتی گھنٹیاں بجتی تھیں اب وہ خاموش ہیں۔ نمک کی تھیلیاں اور اُون کے گٹھے اُٹھائے ہزاروں بھیڑیں سر جھکائے اور گرد وغبار اُڑاتی نظر نہیں آتیں۔ نغمہ سرا تاجروں کے گانے سنائی نہیں دیتے لیکن ان کی یادیں باقی ہیں۔ اُن سیاحوں کی کتابیں، یادداشتیں اور سفرنامے موجود ہیں جو اُن راستوں پر چلتے تھے۔ یہی تحریریں ماضی کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔

آزادی سے پہلے لداخ آنے والے تقریباً تمام مغربی اور غیر ملکی سیاحوں نے لداخیوں کے چال چلن کی تعریف کی ہے اور انہیں خوش اخلاق، شریف، راست باز، خوش مزاج، قانع اور امن پسند بتایا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خطّے میں جرائم کی وارداتیں نفی کے برابر ہوتی ہیں۔ چوری چکاری نہیں ہوتی اور لوگ اپنے گھروں کو تالا نہیں لگاتے۔ تاہم لگ بھگ سبھوں نے لکھا ہے کہ لوگ بہت کم نہاتے دھوتے ہیں اور

گندے رہتے ہیں۔ البتہ کئیوں نے اس کا سبب لداخ کی سخت سردی کو قرار دیا ہے۔ کئی مشاہدوں میں لکھا ہے کہ لداخی جسمانی طور صفائی سے نہیں رہتے لیکن اپنے گھروں، گلی کوچوں اور ماحول کو صرف ستھرا رکھتے ہیں۔

موجودہ لداخیوں پر اِن کا اُطلاق نہیں ہوتا۔ آج کل لداخی صاف ستھرا رہتے ہیں۔ مادّی طور خوشحالی کی وجہ سے اُچھا پہنتے ہیں البتہ ایک اوسط لداخی کے کردار سے متعلق دُو رائیں ہوسکتی ہیں۔

سبھی غیر ملکیوں کا یہ متفقہ تاثر ہے کہ لداخی بڑے خوش وخرم رہتے ہیں ان کی سرشت میں مزاح اور ظرافت ہے۔ یہ ناچ گانے کے شوقین ہیں۔

الیکزنڈر کینِنگھم لکھتا ہے۔ یہ بڑے ملنسار ہیں۔ ہر واقعہ ان کیلئے دعوت کا ایک بہانہ ہوتا ہے جو ہنگاموں پر ختم ہوتا ہے۔۔۔ عموماً مے نوشی کی محفل جمتی ہے، مے نوشی سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں۔ زنانہ رقاصاؤں کا ناچ تفریح کا ایک بڑا حصہ ہے۔ .... بچے کے جنم، نام رکھائی، شادی بیاہ وغیرہ پر (رقص وسرور کی) محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

ملکی اور غیر ملکی سکولروں نے لداخی گیتوں کو پسند کیا ہے اور بہت سارے گیتوں کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرانکی نے قدیم اور زمانہ وسطی کے متعدد گیتوں کو انگریزی جامہ پہنایا ہے۔ لداخی شاعروں سے متعلق وہ اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ''لداخ کے لوگ شاعری کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں'' لیکن شاعری اور قومی ادب کو نشو ونما پانے کے مناسب طور اجازت نہیں دی گئی۔ تاہم ان گیتوں کا اعلیٰ معیار اس بات کا غماز ہے کہ اگر لداخی ادب اور شاعری کو آزادانہ طور پر پھیلنے پھولنے کا موقع ملتا تو ان لوگوں کی ادبی صلاحیت انتہائی کمال کو پہنچ پاتی۔ ڈاکٹر فرانکی نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ شاعری اور ادب کو کس نے اور کیوں نشو ونما پانے نہیں دیا۔ ایک اور پادری ایچ ہینلون H.Hanmlone نے سو

سے زیادہ لداخی گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ان میں پوریک، چنگ تھنگ، زنسکار اور نوبراہ کے گیت ہیں۔اس لحاظ سے یہ لداخی خطّے کے نمائندہ گیت ہیں۔

ایک انگریزی خاتون جینت رضوی کھیتی باڑی کے مختلف مرحلوں پر گائے جانے والے لداخی گیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ یہ گیت سب سے زیادہ توانا اور غنائی خصوصیات کے حامل ہیں۔لداخی ماخذ کے حوالہ سے انہوں نے بتایا ہے کہ صرف شادی بیاہ سے متعلق ۳۲۰ گیت ہیں۔اس طرح لداخیوں نے موسیقی میں متعدد اور رُنگا رنگ دھنیں بنائی ہیں۔جینت نے موسیقی کے میدان میں لداخ کے یوگ دان کا ذکر کیا ہے۔صرف لہرنا موسیقی کی ۳۶۰ دھنیں ہیں۔لداخ کے لوگ پھولوں کے بڑے شوقین ہیں۔ بہت سارے یورپیوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے ٹوپیوں، مکانوں کی چھتوں اور عورتوں کے کانوں کی لوؤں پر پھول سجائے دیکھا۔

پولو لداخیوں کا مقبول کھیل ہے

جو صدیوں سے یہاں کھیلا جا رہا ہے۔فریڈرک ڈِریو نے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے لکھا ہے۔"لداخی پولو کے بڑے شوقین ہیں۔اُونچے مرتبہ کے لوگ بڑے چاؤ سے پولو کھیلتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ پولو کھیلنا زندگی کا ایک مقصد ہے اور اس لئے ان کو اِس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اُونچے طبقے تک محدود نہیں۔غریب سے غریب آدمی بھی اس دوڑ میں برابر کے شریک ہیں۔جس کسی کو ایک ٹٹو ملتا ہے وہ پولو کے مقابلے میں کود پڑتا ہے۔ بچے کمسنی میں ہاکی کھیلنے میں جُٹے ہیں تاکہ آئندہ زندگی میں اپنے کو پولو کے اچھے کھلاڑی بنائیں۔

پولو پر خوبصورت گیت لکھے گئے ہیں جن میں اُچھے کھلاڑیوں کی تعریف کی گئی ہے۔جی ٹی وینی نے لداخی پولو کو ہاکی آن ہارس بیک، گھورے پر ہاکی اور تھورن ٹون نے گھوڑے پر کرکٹ کا کھیل کہا ہے۔

۱۸۷۴ء میں دو انگریز کا وَلے لمبرٹ اور لیڈ یکر نے لدٰخ کے ایک گاؤں

اُبر لس میں پولوگراؤنڈ دیکھا۔ کاؤلے کو پولوگراؤنڈ دیکھ کر انگریزی شاعر چاسر کی نظم یاد آئی۔ وہ لکھتا ہے۔"اِس قابلِ دید پولوگراؤنڈ کے ساتھ ایک عمارت تھی جس کا دریچہ میدان کی طرف کُھلتا تھا، اِرد گرد شاندار اور تناور درخت کھڑے تھے۔ ہم آنکھیں بند کر کے یہ تخیّل آرائی کر سکتے ہیں کہ اس کے دریچے سے خوبصورت عورتیں اور بچے پولو سے کتنے لطف اندوز ہوتے ہونگے!"

کاؤلے نے دراس میں پولو میچ دیکھا، وہ لکھتا ہے"ایک خصوصیت یہ تھی کہ گھوڑ سوار، گھوڑے سے اُترے بغیر گیند اُٹھا کر اور اسے ہوا میں اُچھال کر ہٹ لگاتے تھے۔"

کپتان فائٹ نے ۱۸۶۰ء میں پشکیوم میں پولو میچ دیکھا جس میں پچاس سے ساٹھ کے درمیان گھوڑسواروں نے حصہ لیا۔ وہ لکھتا ہے:"کھیل کے اختتام تک کوئی کھلاڑی اپنے گھوڑے سے نہیں گرا اور نہ کسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ پولو کے کھلاڑی گھوڑے سے اُترے بغیر گیند ہاتھوں میں لیتے ہیں اور اپنی سٹک سے گیند کو فضا میں اچھالتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۸۴۶ء کے آس پاس الیکذنڈر کننگھم نے موبیک میں ایک ٹیم میں بیس کھلاڑیوں کو حصہ لیتے دیکھا۔ اَن گنت موسیقار اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔

۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور کے عزاز میں دراس میں ایک پولو میچ کی نمائش ہوئی جس میں گیارہ گیارہ کھلاڑی تھے۔

مور کرافٹ نے پشکیوم میں پولوگراؤنڈ کو ناپا۔ اس کی لمبائی ۲۰۰ گز اور چوڑائی ۳۰ گز تھی۔ لداخی پولوگراؤنڈ کو شفارن کہتے ہیں۔ یہ دردی لفظ ہے۔

لداخی پولو کی سٹائل قدر مختلف ہے۔ ایک انگریز میجر سی ڈی بروس (C.D.Bruce) نے اپنی کتاب In the footsteps of Marcopolo میں لکھا ہے۔

"ماہرین کے نقطۂ نظر سے لیہہ کے پولو کی سٹائل پر نکتہ چینی کرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں یہ کھیل ان کھیلوں میں سے ہے جو خالصتاً اصلی روپ میں ہے اور ہماری خواہش

ہے کہ یہ سدا اسی طرح رہے۔''

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم میر عزت اللہ نے لداخ میں Mountain sickness بلند مقامات کی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ قراقرم درہ عبور کرتے ہوئے اس کی پارٹی کے ارکان کو سانس لینے میں تکلیف اور متلی ہوئی تھی۔'' میر لکھتا ہے۔

''اٹک پہنچنے پر ناسازگار ہوا کا اثر ختم ہوا۔ جہاں چارا، لکڑی اور پانی کی فراوانی تھی۔''

میر عزت اللہ نے ۱۸۱۲ء اور ۱۸۲۰ء میں لداخ اور سنٹرل ایشیا کا سفر کیا تھا۔ اِس سے پہلے ۱۷۱۵ء میں فادر ڈیزی ڈیری اور اس کی پارٹی کو لداخ ہمالیائی خطے میں اُونچے درّے پار کرتے ہوئے سر میں درد اور سانس لینے میں تکلیف ہوئی تھی۔

مرزا حیدر گورکان نے سب سے پہلے لداخ میں دم گیری یعنی اکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینے میں تکلیف کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

۱۸۹۱ء میں ایک یورپی روک ہل نے لکھا ہے کہ لداخ پہاڑ کی بیماری کو لدُوگ یا درّے کا زہر کہتے ہیں۔ کئی دفعہ لوگ اس کا سبب پہاڑوں پر اُگنے والی ریوند چینی کو قرار دیتے ہیں جو خاص طور ان مقامات پر موسم گرما میں زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ لہسن، حتٰی کہ تمباکو نوشی کو بھی اس کیلئے تریاق سمجھا جاتا ہے۔ اس بیماری سے متاثر جانوروں کو بھی لہسن کھلایا جاتا ہے۔

ایک انگریز فریڈرک ڈریو نے بھی ۱۸۷۷ء میں لداخ میں اپنے سفر کے دوران ہوا کی کمی کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ بلند مقامات کے خانہ بدوش چنگپا قبیلہ کے لوگ اپنے جسم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے ہیں۔

ایک اور انگریز نائٹ نے (۱۸۹۵ء) یہ انوکھی بات لکھی ہے کہ لداخی، جو بلند مقامات پر رہنے کے عادی ہیں، جب (نشیبی) میدانی علاقوں میں آتے ہیں تو بخار کا شکار ہوتے ہیں اور جلدی مر جاتے ہیں۔

ایک اور یورپی لنڈون (۱۹۰۵ء) نے مقامی لوگوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلندیوں اور درّوں پر مقیم بھوت پریتوں کی وجہ سے برف کے تودے گرتے ہیں اور یہی ''لارُوگ'' زہریلی ہوا خارج کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

ہیّرر Harrer (۱۹۵۳ء) رقم طراز ہے کہ تبّتی اس کے مداوا کیلئے درّوں کی بلندی پر مذہبی جھنڈیاں اور Cairns یعنی پتھروں کا مینار نصب کرتے ہیں، (اس مینار پر دھارمک جھنڈیاں اور جانوروں کے سر ہوتے ہیں) تبت اور لداخ دونوں میں یہ مرّوج ہے۔

ڈُونکن (۱۹۶۰ء) نے بھی لاڈُوگ کا ذکر کیا ہے اور یوں رقم طراز ہے:

''اونچے درّوں پر زہریلی ہوا کی موجودگی کا تذکرہ ہے جن کا بھاپ اُٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ اِس سے نمٹنے کیلئے لہسن چبایا جاتا ہے۔''

کینیڈا کی ایک خاتون جُوڑِتھ میٹبر فر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بلندی کے اثرات پر تحقیق کرنے کیلئے لداخ آئی تھی، اپنے تھیسیز میں لکھتی ہے کہ لداخی دردِ سر، متلی اور سانس میں تکلیف کے اسباب درّوں پر اُگنے والے چند پھولوں کی بُو کو قرار دیتے ہیں جن سے چند لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ یہ شکایت جون، جولائی اور اگست کے مہینوں میں کی جاتی ہے، جب یہ پھول پوری طرح کھلتے ہیں۔ .... لداخی لاڈُوگ یا لرُدوگ کے علاج کیلئے تیز کالی چائے، خرگوش کا گوشت، مٹھائیاں، روٹی اور پانی کے ساتھ سوکھی خوبانیوں کے سفوف کے استعمال کی تجویز کرتے ہیں۔

متعدد سیاحوں نے لکھا ہے کہ لداخ میں عورتوں کو پوری آزادی حاصل ہے۔ وہ گھر کی مالکن ہے اور اسے پورے اختیارات حاصل ہیں۔

سیاحوں اور ریسرچ سکالروں نے لداخی بودھوں میں مرّوج Polyandry (کثیر الازدواج جس میں ایک بیوی کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں۔) کا ذکر کیا ہے۔ کئی مغربی سیاحوں نے کثیر الازدواج کو ظالمانہ اور بداخلاقی سے تعبیر کیا ہے

تاہم ایک یورپی سکالر کرسٹو فر بریکس پرٹیلسن نے اسے انسانی اورفطرت کا Interaction باہمی عمل کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ یقیناً کوئی مرد یا عورت عمداً اسے پسند نہیں کرے گی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں بودھوں کی آبادی میں اضافہ نہ ہونے کی وجہ کثیر الازدواج کو قرار دیا گیا ہے۔ زمانہ حال میں بودھوں نے اس کیخلاف پُرزور مہم چلائی ہے جس کا دُور رس نتیجہ نکلا ہے۔ نیز مادی خوشحالی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے Polyanday کی رسم اُب تقریباً ختم ہوگئی ہے۔

ڈنیری ڈیری (۱۷۲۰ء)، ولیم مور کرافٹ (۲۱۔۱۸۲۰ء) الیکنڈر کننگھم (۱۸۴۲ء) جان ایف میلے نن (۱۸۶۵ء) پرنس پیٹر (۱۹۳۸ء) اور دوسرے کئی سیاحوں نے لداخ میں مرّوجہ کثیر الازدواج کا ذکر کیا ہے۔

پرنس پیٹر نے کثیر الازدواج کی وجوہات دگرگوں ماحول، بنجر اور سرزمین کے سبب پیداوار میں کمی بتایا ہے: جس سے آبادی میں اضافہ کا سدباب ہوسکتا ہے۔ تاہم اُن دنوں بھی سبھی Polyandry کے حق میں نہیں تھے۔ وہ لکھتا ہے چند معاملات میں کنبے کے ڈھانچہ کے سبب پولینڈری ممکن نہیں ہے۔ چند معاملات میں اِسے نامناسب قرار دے کر مسترد کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں خاص کر لیہہ میں اچھے پڑھے لکھے، اُمراء اور ہندوستان کے میدانی علاقوں میں سفر کرنے والوں میں پولی بینڈری کیخلاف منفی رجحان پایا جاتا ہے۔

کئی یورپیوں نے آرغون مسلمانوں کے کردار پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور انہیں دھوکے کا باز اور جھوٹے قرار دیا ہے۔ تاہم کئی یورپیوں نے آرغون کا دفاع کیا ہے۔ آرتھر نیوے لکھتا ہے۔ "یہ کہا گیا ہے کہ آرغون کو اپنے ماں او باپ ودنوں کی برائیاں ورثہ میں ملی ہیں جبکہ دونوں کی خوبیوں سے یہ محروم ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی رائے نہیں ہے جو اچھی طرح سے لداخ کو جانتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ آرغون نے اپنی ذہانت اور قوت سے اچھی پوزیشن حاصل کی۔"

Imprial Gazetter of India (مرتبہ' سر والٹر لارنس) میں یہ ریکارڈ ہے کہ لیہہ کی مخلوط النسل لوگوں کا شبھا و لداخ میں اطمینان بخش ہے اور بہت سارے مسافروں نے آرغون کی اچھی صفتوں کی تعریف کی ہے۔

اسی طرح ایک اور انگریز ہملٹن بوور، آرغون کے بارے میں لکھتا ہے:" میرے خیال میں انہیں بداخلاق کہنا حق بجانب نہیں جیسا کہ چند لیکھکوں نے انہیں کہا ہے۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ کپتان رمزے نے ڈکشنری آف ویسٹرن تبت میں ان کی تعریف کی ہے۔"

یورپیوں نے بطور قلی اور رہبر لداخیوں خاص طور پر آرغون کی بڑی تعریفیں کی ہیں اور یہ اعتراف کیا ہے کہ آرغون وہیرون اور قلیوں کے بغیر اُس زمانے میں وسطِ ایشیا، تبت، پامیر وغیرہ میں سفر اور سروے کرنا مشکل تھا۔

آرغون کے علاوہ کئی لداخی بودھوں نے بھی یورپی محققوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ سر فریڈرک ڈریو جو چار سال لیہہ میں وزیر وزارت رہا، لکھتا ہے:" اگر لداخیوں کو مناسب وقت اور موقع فراہم کیا جائے یہ تو سیکھنے کا اچھا مادہ رکھتے ہیں۔"

لارڈ ڈینمور نے رایل جیوگرافیکل سوسائیٹی کے سامنے اپنی مہم کی روئداد سناتے ہوئے ان الفاظ میں لکھا ہے۔"اس سے پہلے مجھے کبھی ایسے جفاکش، عمدہ اور فرمان بردار آدمیوں کی خدمت حاصل نہیں ہوئیں"۔ ینگ ہسبنڈ نے گلوان رسول کی کتاب Servants of the Sahibs کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ افراد مہم جوئی کے اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے اِن کے مالکان ہیں۔

کپتان ایچ ایچ ڈیزی:" کارواں میں کام کرنے کیلئے موزوں ترین افراد لداخ کے آرغون ہیں۔ یہ ترکستان کے باشندوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔"

معتدد سیاحوں نے قدرے حیرت سے یہ لکھا ہے کہ لداخی گنپوں کے مذہبی لوازمات اور روم کے رومن کیتھولک عیسائی کی عبادت میں گہری مماثلت ہے۔ انہوں

نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ رسومات لداخ چین سے نسطوری عیسائیوں نے لائی تھیں جہاں سینٹ تھامس نے عیسائیت پھیلائی تھی۔ تاہم لداخی بودھ سکالر اس مفروضہ کو مسترد کرتے ہیں۔

سنٹرل ایشیا سے تجارت سے متعلق برطانوی ہند سرکار نے انیسویں صدی سے پورا ریکارڈ رکھا ہے۔ جو نیشنل آرکائیوز دہلی، جموں و کشمیر سرکار کے محافظ خانوں وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ لیہہ میں گرمیوں میں تعینات برٹش جوائنٹ کمشنر تجارتی اُمور کا اُفسرِ اعلیٰ تھا۔ وہ لداخ کی سرحد پر روسی اور چینی افواج کی نقل و حرکت اور ان حکومتوں کی سیاسی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھتا تھا۔

تجارتی لحاظ سے جب لیہہ کی افادیت تھی تو اُن دنوں آج کے روپیہ کی قیمت کے مناسب سے کروڑوں روپے کی تجارت ہوتی تھی۔ اگر چہ لداخی اس تجارت میں شریکِ کار نہیں تھے لیکن کارواں کی آمد پر لداخیوں کو ضروری چیزیں دستیاب ہوتی تھیں۔

کارواں پہنچنے پر لیہہ بازار میں بڑی چہل پہل اور مختلف نسلوں اور خطوں کے لوگوں کی ریل پیل رہتی تھی۔ سیاحوں نے انفرادی طور کارواں کی آمد کا ذکر کیا ہے۔ الیکزنڈر کننگھم نے' جو ۱۸۴۶ء میں لداخ آیا تھا لکھتا ہے: ماضی میں لیہہ مختلف قوموں اور نسلوں کے تاجروں کا سنگم تھا۔ یہاں ترک، تبتی، پنجابی، کشمیری، ہماچلی، افغان' حتیٰ کہ سائبیریا اور ایشیاء کے دُور دراز خطوں کے لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگوں کے ساتھ ہمسایہ ملکوں اور خطوں کے سکے بھی ملتے تھے۔ ان میں روسی' وسطِ ایشیا، بخارا اور کوکنڈ کے سونے کے سکے' چین اور نیپال کے چاندی کے ڈلے یا سکے' رام پور کے تابنے کے سکے' مغلیہ حکومت کے روپے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نانک شاہی اور گووند شاہی روپے شامل تھے۔ لداخ کا اپنا سکہ تھا' جو جو' کہلاتا تھا۔

نویں صدی کی ایک تاریخی دستاویز' حدود عالم' میں لکھا ہے کہ تجارت نے لداخ کی مالیات پر اچھا کردار ادا کیا ہے۔

لداخ پشمینہ کیلئے مشہور ہے۔ مقامی پشمینہ کی پیداوار کے علاوہ مغربی تبت کے پشمینے پر لداخ کو اجارہ داری حاصل تھی۔ لداخ سے مقامی پشمینہ برآمد ہوتا تھا جہاں اس کی عمدہ شال بنتی تھی۔ مغل حکمران لداخ کے پشمینہ سے باخبر تھے اور مغل بیگمات پشمینہ کی شالیں زیب تن کرتی تھیں۔

ہند میں انگریز سرکار بھی پشمینہ پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتی تھی۔ مورکرافٹ نے لیہہ میں اپنے قیام کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کو لداخی پشمینہ فروخت کرانے کیلئے سفارتی طور کوشش کی اور زیادہ داموں کی پیشکش کی۔ کمپنی نے اس سلسلے میں ۲۱۔۱۸۲۰ء میں ایک ایجنسی بھی قائم کی۔

وزیر زورآور سنگھ کی لداخ پر فوج کشی کا ایک بڑا سبب پشمینہ پر ڈوگرہ حکومت کی اجارہ داری حاصل کرنا تھی۔

لداخ کی سردی سب پر عیاں ہے۔ کبھی کبھی سخت سردی کی وجہ سے ڈربے میں مرغ مرغیاں اور گاؤ خانے میں گائیں مری ہیں۔ گرمیوں میں گرمی ہوتی ہے تاہم رات ٹھنڈی ہوتی ہے۔ دن اور رات کے درجہ حرات میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ لداخ کی ریتلی زمین ہے۔ ریت جلدی گرم اور جلدی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ دھوپ کی بڑی اہمیت ہے۔ سورج چند لمحوں کیلئے بادلوں کی اوٹ میں چلا جائے تو سردی لگتی ہے اور اوٹ سے نکلے تو خوشگوار گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ سورج کی تعریف میں گیت لکھے گئے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کے اِس تجربے کو ایک یورپی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

Heat there is but it is not hot and cold there is but it is not cold. One Perspires and shivers at the same time.

یہاں گرمی ہے لیکن گرم موسم نہیں۔ یہاں سردی بھی ہے اور نہیں بھی۔ ایک آدمی یہاں بیک وقت پسینے سے شرابور ہوتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتا ہے۔

آگے وہ لکھتا ہے: "موسم سخت اور ناسازگار ہو بھی، لیکن لوگ اچھے ہیں۔ سفر کٹھن ہو لیکن زمین مہمان نواز ہے۔"

لیہہ آنے والے سیاحوں نے قصبہ اور اس کے محل کا ضرور ذکر کیا ہے اور کتابوں میں ان کی تصویریں شائع کی ہیں۔

ایک خاتون سیاح جین ڈنکن کے الفاظ میں لیہہ اونچے سلسلہ کوہ کے دامن میں صحرا میں ایک سبز رنگ کے فیتے کی طرح لگتا ہے۔

گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ کہتا ہے۔ "دلکش اور جاذبِ نظر مناظر کے شائقین کیلئے لیہہ میں دلکشی کا وافر سامان ہے۔"

۱۹۳۰ء میں لداخ آنے والی ایک امریکی خاتون ہنیر تا سینڈ اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتی ہے۔ "لیہہ کے لوگوں کی آنکھوں میں خوشی جھلکتی ہے جنہیں دیکھ کر ناچ اور قہقہے کا گمان ہوتا ہے۔" میجر بروس کے مطابق گرمیوں میں ہندوستان میں لیہہ جیسا دل خوش کن مقام معدودے چند ہیں۔"

ایک اطالوی محقق ڈاکٹر فیلپی جو پچھلی صدی کی دوسری دہائی میں بلتستان اور لداخ آیا تھا رقم طراز ہے۔ "سردیوں میں بھی خوابیدہ اور اُداس اُداس سکردو کے مقابلے میں لیہہ میں زیادہ ہماہمی اور گہما گہمی رہتی ہے۔"

ایک اور مشاہد کو لیہہ کی خاموش دُھلی دُھلی فضا دیکھ کر شکسپیر کے اشعار یاد آئے۔

لیہہ کی سبزیوں کی بھی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مسٹر کروپ نے یہاں تک لکھا ہے کہ لیہہ کی سبزیاں مشرقی ملکوں میں سب سے اچھی ہیں۔

۱۸۲۰ء میں مورکرافٹ جب لیہہ آیا تو فصیل کے باہر چند مکانات بن چکے تھے۔ البتہ فصیل کی حالت ٹھیک تھی۔

پہاڑی پر واقع محلہ لیہہ قصبہ کی شان ہے اور اس کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ مورکرافٹ پہلا غیر ملکی تھا جس نے محل کا خاکہ بنایا۔ اس خاکے میں محل کے بائیں

طرف دو بلند عمارتیں نظر آتی ہیں۔ یہ عمارتیں روپشو محل، یونیورسٹی اور کلون (وزیر اعظم) کی رہائش گاہ بتائی جاتی ہے۔

۱۸۹۴ء میں ایک انگریز ایڈیٹر نے لکھا ہے: "لیہہ محل قدیم مصر کا مندر Pylon کا مشابہ ہے۔"

ایک روسی سیاح فلپ یا فریموف محل کو چھوٹا پوتالا کہتا ہے۔ پوتالا لیہہ محل کے بعد تعمیر ہوا تھا۔

لداخ کے محلات اور قلعوں کے ایک مصنف اور ماہر نیل ہاورڈ نے محل کے فنِ تعمیر پر اِن الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: "محل کی متناسب دل آویز سادگی، نہایت ہی کاریگرانہ عمدگی، اس کی دیواروں کا متوازن اُبھراؤ اِسے ایک دلنشین وقار بخشتا ہے جس کی مثال پوتالا سمیت تبت کی کسی اور عمارت میں نہیں ملتی۔"

نیل ہاورڈ کے مطابق محل کی شان اس کی بیرونی ڈیوڑھی سے ہے جو لداخی آرٹ کا شاہکار ہے اور اَب تک موجود ہے۔ ڈیوڑھی کے اوپر لکڑی کا ایک شیر بنا تھا جس کو اندر اور باہر کیا جاسکتا تھا۔ دو اور شیر تھے۔ اب تیسرے شیر کا سر نہیں ہے جسے محل کے اندر اور باہر کیا جاسکتا ہے۔ بقول نیل ہاورڈ ڈیوڑھی کا سائبان سترھویں صدی کی تبتی کاریگری کا نمونہ ہے۔

نیل ہاورڈ رقم طراز ہے: "محل کی دیوار بالائی سمیت بتدریج اندر کی طرف چلی گئی ہے۔ بنیاد پر اس کی موٹائی دو میٹر اور اُوپر آدھا میٹر ہے۔ ایسے محل کا کوئی حصہ منہدم ہونے کی صورت میں اس کے دامن میں واقع مکانات کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

محل کے گرد دوہری دفاعی دیوار تھی۔ انگریز سیاح وینی نے یہ دیواریں دیکھی تھیں، ڈوگروں کے حملے میں دفاعی ڈھانچہ تباہ ہوا تھا۔

محل سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں یہ روایات کم وبیش قائم رہیں۔ پادری سمائل ریباک ۱۸۹۶ سے ۱۹۱۳ء تک تقریباً سترہ سال

لداخ میں رہے۔ وہ اپنی کتاب Broghpa Namgyal,the life of a villager میں اپنے مشاہدے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ لوسر (سالِ نو) پہ گیالپو (لداخی راجہ) اونچے خاندانوں کے افراد کو محل میں مدعو کرتے ہیں۔ کلون (وزیر اعظم) لونپو (گورنر) اور معززین راجہ کی پیشوائی کیلئے ستوق گاؤں سے جاتے ہیں اور وہاں سے جلوس کی صورت میں گھوڑوں پر لیہہ آتے ہیں۔ لیہہ اور گاؤں سے آتے ہوئے لوگ لیہہ بازار میں ان کا انتظار کرتے ہیں۔ جلوس بازار میں پہنچتا ہے اور لوگ بڑے احترام سے راجہ کو سلام کرتے ہیں اور سواریوں کے ساتھ راجہ محل میں جاتا تھا۔ ان چند دنوں کے دوران گیالپو لداخیوں کیلئے سچ مچ ماضی کا حکمران ہوتا تھا جب اس کے پاس اختیارات اور حکومت تھی۔

سال کا زیادہ حصّہ محل ویران اور خالی رہتا تھا۔ بقولِ ریباک' تب محل میں اُلو، چوہے اور چمگادڑیں ڈیرہ جماتے ہیں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے محل کو ماضی کی ایک تاریخی یادگار کے طور اپنی تحویل میں لیا ہے۔

لیہہ محل ۱۶۲۰ء میں گیالپو سینگئے نمگیل نے تعمیر کیا تھا اور تین سال میں مکمل ہوا تھا۔

مغربی آرٹ ماہرین کا خیال ہے کہ لداخ کے دیواری مصوّری اور نقاشی پر مختلف ملکوں، خطوں اور آرٹ سکولوں کا اثر پڑا ہے۔ ان میں وسط ایشیا، نیپال، ایران، تبت، کشمیر، چین، اور آرٹ سکولوں میں گندھارا، بنگال، اور بہار کے پالا، سیستا حکومت اور مغل آرٹ کے اثرات ہیں۔ لداخ نے بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ اثرات قبول کئے ہیں۔ خاص کر تبت اور کشمیر کا اثر نمایاں ہے۔ ان دو خطوں نے بھی مختلف ممالک اور آرٹ کے مکاتیب سے استفادہ کیا تھا۔

چارلس گینوڈ نے اپنی کتاب Buddhist wall paintings of Ladakh میں لکھا ہے ''لداخ کی مصوری کے سٹائل کو لداخی کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں کی مصوری پر بالواسطہ اور بلا واسطہ اثر پڑا ہے۔ کئی دفعہ دور دراز خطوں

سے لداخ کی مصوّری متاثر ہوئی ہے۔ تاہم چارلس گینوڈ یہ بھی لکھتا ہے کہ لداخ میں آرٹ کا ارتقا بالکل تبت کی طرز پر ہوا اور علاقائی اثر کی وجہ سے لداخ کا آرٹ تبت سے کچھ جداگانہ لگتا ہے۔ اسلئے اس میں اپنی انفرادیت بھی ہے۔ گنیوڈ کا خیال ہے کہ لداخی مصوّری کی سٹائل نہایت ہی پیچیدہ ہے خاص کر تبت کے آرٹ کا اثر لینے سے پہلے اس میں بڑی پیچیدگی تھی۔

ڈیوڈ ایل اسنیل گرو اور Tedeusz Skorupski ان کی تصنیف Cultural Heritage of Ladakh میں لکھتے ہیں" کشمیر میں اسلام آنے کے بعد لداخ اور اس کے آرٹ پر مغل آرٹ کا اثر رہا لداخ کے راجوں نے مغلیہ طرز کا لباس زیبِ تن کیا۔ چارلس گینوڈ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لداخ کی چند دیواری تصاویر پر مغلوں کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ خاص کر اُلچی وہار میں اویلوکیتشوار کے چوغہ اور تارا کے ہم جلیسوں سے یہ اثر نمایاں ہے۔"

صرف آرٹ میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لداخ نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس ضمن میں ایک سیاح مارکو پالیس لکھتے ہیں "لداخ کو اگر چہ کلچر کے اہم گہواروں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن یہاں کے دیہات اور لیہہ میں سفر کرتے ہوئے ایک خالص اور کھری تہذیب کے وجود کا احساس ہوتا ہے جو ہم یورپ کے ایک بڑے حصے میں نہیں پاتے۔"

دو مغربی محققین نے الگ الگ دور میں لیہہ کے چھ خاندانوں کا سماجی اور معاشی سروے کیا ہے۔ ان دو زمانوں میں ۴۳ تنتالیس سال کا فرق ہے اِن کا موازنہ کیا جائے تو دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔ ان میں ایک یونان کا پرنس پیٹر تھا جو ایک ماہر بشریات Anthropologist تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں لیہہ میں چھ کنبوں کا سماجی اور معاشی سروے کیا اور اس کے ۴۳ سال بعد انگلینڈ کے پروفیسر جے ایچ کروک اور ٹی شکیا نے انہی خاندانوں کا انہی خطوط پر سروے کیا۔ یہ موازنہ ایک

دلچسپ نقشہ پیش کرتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں لیہہ کی آبادی ۲۳۱۷ نفوس تھی۔ ان میں ۱۲۸۷ بودھ تھے، ۹۹۱ مسلمان اور کچھ عیسائی ہندو اور سکھ تھے جبکہ ۱۹۸۱ء میں لیہہ کی آبادی دس ہزار تک پہنچی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں چھ کنبوں میں فی گھر اَوسطاً ۱۱ اعشاریہ ۵ افراد تھے۔ جبکہ ۱۹۸۱ء میں ۷ اعشاریہ ۵ افرد تھے۔ یہ کنبے اب پھیل کر ۴۵ ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں سولہ شادیوں میں دس یعنی ۶۳ فیصد شادیاں Polyamdry کثیر الازدواج کی بنیاد پر ہوئی تھیں اور ۱۹۸۱ء میں ۲۵ شادیوں میں ۴ کا بیاہ کثیر الازدواج طور ہوا تھا۔

۱۹۳۸ء میں ایک خاندان کے بزرگ نے پرنس پیٹر کو شکایت کی کہ نوجوانوں میں بداخلاقی آئی ہے۔ یہ نئی نسل کثیر الازدواج کے خلاف ہے۔ ان پر ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں، ترکی تاجروں، مشنری اور سیاحوں کا اثر پڑا ہے جو ہمیشہ دیرینہ رواج کیخلاف بولتے رہتے ہیں اور ایک زوجگی کی بُری رسم پر عمل کر رہے ہیں۔ اس نے پیٹر سے سوال کیا۔" آپ لوگ یورپ میں کثیر الازدواج کے بغیر اِتنے دولت مند کیوں ہیں؟ ....اس نے یہ بھی کہا۔ گھر پر آپ کو کھانے کیلئے کافی خوراک نہیں ہے۔ اس لئے باہر جا کر نو آبادیاں قائم کرتے ہیں۔" پیٹر کو بزرگ کی بات بہت اچھی لگی۔ اُن دنوں چھ خاندانوں میں کثیر الازدواج شادیاں مروّج تھیں۔

۱۹۸۱ء میں سب کا نظریہ بدل گیا اور Polyandry کو شرمناک سمجھا جاتا ہے۔ روزگار کے وسائل کی وجہ Polyandry غیر ضروری بن گئی ۔ چھوٹے بھائی اپنی آبائی زمین پر مکانات بناتے ہیں۔ اس کیلئے زمین کا بٹوارہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑے بھائی کو قدرے زیادہ زمین ملتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں سبھی مرد کھیتی باڑی میں جُڑے تھے۔ اب چھتیس مردوں کو دوسرے نفع بخش روزگار نصیب ہیں یہ انجینئر، کلرک، استاد، فوجی اور پولیس کانسٹیبل کے پیشے اختیار کر رہے ہیں۔ دولڑکے یونیورسٹی اور کالج میں پڑھتے ہیں۔ باقی بیس بچوں کو اعلیٰ تعلیم ملنے کے امکانات ہیں۔ پچاس فی صد مرد کھیتی باڑی سے منسلک ہیں۔

ان میں ایک بزرگ حیات تھا۔ وہ اُناسی سال کا تھا اور اس کو پرنس پیٹر کی لداخ آمد اچھی طرح یاد تھی۔

رپورٹ میں لکھا ہے ان کنبوں میں بچی پیدا ہونے پر کسی کو مایوسی نہیں تھی۔ ان کیلئے لڑکا اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شادی شدہ عورتیں گھر، کھیتی باڑی اور بازار کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور بے روک ٹوک اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

ان کنبوں کے افراد نے پروفیسر جان کُروک سے کہا کہ ان کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلے سے خوشحال ہیں۔ دولت زیادہ ہے۔ روزگار ہے فصلیں بہتر ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ علاقے میں ترقیات کا کام زیادہ ہو رہا ہے۔

۱۹۳۸ء میں ان چھ کنبوں میں ۶۹ مرد تھے۔ اَب مَردوں کی کل تعداد ایک سو پانچ تک پہنچی ہے۔

جان کُروک نے اپنی سروے رپورٹ میں لکھا ہے"کھڑکیوں میں اب شیشے لگے ہیں۔ اُوپر کی منزل میں گلاس روم ہے۔ اندرونِ گھر آرائش اور سجاوٹ زیادہ ہے۔ ایک یا دو گھروں میں طالب علموں کیلئے الگ کمرہ ہے جس میں موسیقی کے کیسٹ، کھیلوں کے انعامات اور مغربی پوسٹر لگے ہیں۔

۱۹۸۱ء کے مقابلے میں اب صورت حال بالکل بدلی ہے۔ تب سے مزید ۲۳ سال گزر چکے ہیں۔ اِن کنبوں کی سماجی اور معاشی حالت میں مزید تبدیلیاں آئی ہوں گی۔

مختلف ادوار میں لداخ آنے والے سیاحوں اور محققوں میں کئیوں نے سفرنامے یادداشتیں اور کتابیں لکھی ہیں۔ ہر سیاح کو کہنے کیلئے کوئی نہ کوئی نئی بات ہے۔ ہم ذیل میں ان کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے اس مخصوص دور کے سماجی، سیاسی، تاریخی اور تمدّنی، حالات کا پتہ چلتا ہے جہاں ایک ریسرچ سکالر کیلئے ان میں قیمتی تاریخی مواد ہے۔ وہاں عام قارئین کیلئے ان میں دلچسپی کا سامان ہے۔

ڈائیوگو المیرا پہلے پہل لداخ آنے والا مغربی تھا جس سے متعلق ہمیں کچھ

معلومات حاصل ہیں۔ وہ پرتگال کا باشندہ تھا اور ۱۶۰۰ء کے آس پاس لداخ وارد ہوا تھا۔اس سے پہلے نسطوری عیسائی لداخ سے گزرے تھے لیکن ان سے متعلق دنیا بہت کم جانتی ہے۔ المیرا نے لداخ سے متعلق لکھا ہے: "اس ملک کوانوکھے عیسائی چلاتے ہیں جن کے راہب پرتگال کی یاد دلاتے ہیں"۔

اس کے بعد بھی لداخ آنے والی مغربی سیاحوں نے بُدھ مت اور رومن کھیتولک کی بہت ساری مذہبی رسومات میں یکسانیت پائی۔ لیکن ڈائیوالمیرا پہلا مغربی تھا جس نے لداخیوں کو عیسائی سمجھا۔

ترک جرنیل مرزا حیدر گورکان نے سولھویں صدی کے پہلے نصف میں لداخ پر حملہ کیا۔ ان کی تصنیف تاریخِ رشیدی، اس دور کے لداخ، کشمیر اور تبت پر روشنی ڈالتی ہے تاہم انکے بہت سارے بیانات حقائق سے میل نہیں کھاتے۔ کم سے کم لداخ کے معاملے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

مرزا حیدر نے لداخ کی بلندی اور دَم چڑھنے کا ذکر کیا ہے جس سے انسانی کی طبیعت بہت خراب ہوتی ہے۔ انسان خواہ چلتا ہو بیٹھا ہو یا آرام سے لیٹا ہو ہر حال میں اس کا دم اس طرح گھٹ جاتا ہے، گویا ایک بھاری بوجھ اُٹھائے دوڑ رہا ہو۔ اس وجہ سے آرام سے سو نہیں سکتا.......... گھوڑوں پر بھی بلندی پہ یہی حال ہوتا ہے۔

مرزا نے لکھا ہے "بہت سارے گاؤں میں سبزی صرف شلغم پیدا ہوتا ہے۔ جو چالیس روز میں پکتا ہے۔ اگر نہ پکے تو سردی اسے مار دیتی ہے اور دانہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اکثر دیہات میں گھاس صرف دو ماہ تک سبز رہتی ہے۔ ....

خانہ بدوش چنگپا کچا گوشت کھاتے ہیں۔ گھوڑوں کو بھی گوشت کھلاتے ہیں۔ بھیڑوں سے بار برداری کا کام لیتے ہیں"۔

جنگلی یاک کا ذکر کرتے ہوئے مرزا نے لکھا ہے کہ اگر یہ کسی پر حملہ کرے تو موت کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے، خواہ سینگ یا لات مارے۔ اگر اس کا موقع نہ ملے

تو زبان سے انسان کو بیس گز کے قریب ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ وہاں سے جب گرتا ہے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک یاک بارہ گھوڑوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔

لداخ کے وسائل کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے کہ حدودِ تبت میں ایک ہزار سے زیادہ فالتو آدمی گزارہ نہیں کر سکتے۔ اس سے زائد لشکر کیلئے کشمیر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

مرزا نے لداخ اور تبت میں بدھ مت کے عقائد کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

لداخ آنے والے دوسرے پرتگالی فادر انٹونیو ڈے اندوادے تھے۔ وہ پادری تھے اور عیسائیت کے پرچار کیلئے آئے تھے۔ ۱۶ مئی ۱۶۲۴ء کو فادر اندواڈے لداخ پہنچے تب گیالپو جمیانگ نمگیل لداخ کا حکمران تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اندوادے نے لداخیوں کو مادّی طور خوشحال پایا۔ گیالپو کے ساتھ اندوادے کی اچھی دوستی رہی۔

بعد میں اندوادے مغربی تبت کی راجدھانی ژھپرانگ گئے جہاں راجہ نے فادر اندوادے کو عیسائیت کی اشاعت کیلئے تعاون کا یقین دلایا۔ ۱۲/ اپریل ۱۶۲۶ء کو ژھپرانگ میں ایک گرجا کا سنگِ بنیاد رکھا۔ لاموں نے فادر اندوادے کے تبلیغی مشن کی سخت مخالفت کی جس کی حمایت لداخی راجہ نے بھی کی اسطرح اندوادے کا مشن کامیاب نہیں رہا۔

۲۵/ اکتوبر ۱۶۳۱ء کو دو اور پرتگالی پادری فادر فرانسکو ڈے ازے ویڈو اور فادر گیووانی ڈی اویسور و مغربی تبت کی راجدھانی ژھپرانگ سے لیہہ پہنچے۔ تب لداخ میں گیالپو سینگے نمگیل کی حکومت تھی۔ دستور کے مطابق وہ شہر کے پھاٹک پر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور شہر میں داخلہ ہونے کی اجازت لے لی۔ اُن دنوں لیہہ کے گرد فصیل تھی۔ راجہ نے انہیں رہنے کیلئے رہائش گاہ دی اور جو اور ایندھن دئے۔

فادر ازے ویڈو نے لیہہ سے متعلق لکھا ہے: لیہہ قصبہ پہاڑی کی ایک ڈھلان پر واقع ہے۔ یہاں آٹھ سو کنبے ہیں۔ آدھا میل دور نشیب میں دریا بہتا نظر آتا ہے

جولاہور جاتا ہے۔ (یہ دریائے سندھ ہے۔ جو قصبہ سے چار میل دور ہے۔) قصبہ میں پہاڑ سے بہتا ہوا ایک نالہ گزرتا ہے جس پر بہت ساری پن چکیاں چلتی ہیں۔ یہاں کچھ درخت بھی ہیں۔"

دونوں پادریوں کو گیالپو سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور تحفے پیش کیے جن میں کچھ کپڑے اور ہتھیار تھے۔ فادر ازے ویڈو، سینگے نمگیل کی شخصیت سے متعلق لکھتا ہے:"راجہ لمبے قدر وقامت کا ہے۔ بھورا رنگ ہے اور نین نقش میں کچھ Javanese پرتو ہے۔ شکل وشباہت سخت گیرانہ ہے۔ بال کندھوں تک گرتے ہیں۔ دونوں کانوں میں فیروزے اور ایک بڑا مونگا پہنا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی یاد دلانے کیلئے گلے میں کھوپڑی کی ہڈیوں کی مالا پہنی ہے۔ راجہ ایک منقش قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ رانی چھوٹے قد کی ایک مضبوط عورت تھی۔ آنکھیں دُکھتی ہوئی لگتی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر جیسا لباس پہنا تھا لیکن اس کی شخصیت (شوہر کے مقابلے میں) کم متاثر کن تھی۔"

دونوں پادریوں کو لداخی چائے پلائی گئی۔ بعد میں انہیں کچے گوشت کا ایک ٹکڑا اور جو کا ایک گولا دیا۔ ۷ نومبر کو دونوں لاہول کلو کے راستے واپس لوٹے۔

راجہ دے لیگس نمگیل کے عہد میں منگول اور تبتی فوج لداخ کے بڑے حصے پر قابض ہوئی۔ راجہ بز گو لپسپا ہوا ــــــ تین سال تک چھُٹ پُٹ لڑائیاں جاری رہیں آخر کار راجہ نے مغل حکومت سے امداد حاصل کرنے کیلئے سرینگر ایک وفد بھیجا۔ ان دنوں مغل شہنشاہ اورنگزیب سرینگر آیا تھا۔ ایک فرانسی سیاح فرانکوئیس برنیر بھی سرینگر میں موجود تھا۔ برنیر نے لداخی وفد کے ارکان کو دیکھا۔ اپنے سفرنامہ میں وہ اس کا یوں ذکر کرتا ہے:"لداخی راجہ نے سرینگر میں اورنگزیب کی آمد کی خبر سنی تو اپنا سفارت کار بھیجا۔ وفد نے مشکِ نافہ، ایک بڑا قیمتی پتھر، یاک کی دُمیں وغیرہ پیش کیں۔ سفیروں کے ساتھ تین یا چار گھوڑ سوار اور دس یا بارہ لمبے قدو قامت کے سُوتے ہوئے سوکھے

چہرے والے دبلے پتلے آدمی تھے۔ چینیوں کی طرح ان کے چہرے پر کم داڑھی تھی اور ہمارے بحریہ کے آدمی جیسی سرخ رنگ کی ٹوپی پہنی تھی .... میرا خیال ہے کہ ان میں چار پا پانچ آدمی تلواروں سے لیس تھے .... سفارت کار نے اورنگزیب کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور اپنے مالک کی طرف سے راجدھانی میں ایک مسجد تعمیر کرنے، اورنگزیب کی شبیہہ والا سکہ ڈھالنے اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن ہر شخص کو شبہ تھا کہ اورنگزیب کے کشمیر سے لوٹتے ہی معاہدہ کھٹائی میں پڑ جائے گا! .... وفد میں ایک لاما طبیب بھی تھا جس نے برنیر کو ایک قریب المرگ بڑے لاما سے متعلق بتایا کہ آواگون کے عقیدے کے مطابق ان کا جانشین جلدی پیدا ہوگا۔

فرانکوئیس برنیر لداخ سے متعلق زیادہ معلومات چاہتا تھا اس لئے لداخی زبان سے واقف ایک کشمیری سوداگر کے ہمراہ لاما سے ملا۔

برنیر نے لکھا ہے کہ کشمیر سے تاجر لداخ کے راستے چین جاتے اور مشکِ نافہ، صندل، ممیرہ jade وغیرہ لاتے تھے۔

منگول حملے کے بعد لداخ اور تبت کے تعلقات کشیدہ رہے اور لداخی راجہ دے لیکس نمگیل کا مغلوں سے رابطہ پڑا۔ مغل گورنر راجہ کو عاقبت محمود خان کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اس صورت حال پر چھٹے دلائی لاما سنگیس گیا ژو کو تشویش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ لداخ کے بودھ حکمران کشمیر اور اسلام کے زیرِ اثر نہ رہے۔ انہوں نے کرگیوت پاڈوگپا فرقہ کے بڑے لاما چھٹے ڈوگچین رینگبو چھے میپھم وانگیو کو دے لیکس نمگیل سے ملاقات کرنے اور سمجھانے کیلئے ۱۶۸۳ء میں لداخ بھیجا۔ ۸۴-۱۶۸۳ء کی سردیوں میں بڑے لاما نے تمسگام میں راجہ سے ملاقات کی اور دلائی لاما کا پیغام پہنچایا۔ ڈوگچین رینگبو چھے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

اِس سے پہلے اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً تبت سے سرکردہ مذہبی رہنما لداخ آئے اور تبت اور لداخ کے مابین مذہبی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات کو استوار کرنے میں اہم

رول ادا کیا۔

منگولیا کی حکومت نے لداخ کی حکومت سے تعلقات قائم کرنے کیلئے اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف کے دوران کئی وفود لداخ بھیجے۔ چین کی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لداخ منگولوں کے زیرِ اثر آئے۔ منگولوں سے تبت کی سلامتی اور وہاں چین کی حاکمیت کو خطرہ تھا۔ چین نے بھی لداخی راجہ کے پاس سفارتی مشن اور راجہ کو قیمتی تحفے تحائف بھیجے۔ لداخ کی حکومت نے منگولوں کے مقابلے میں چین سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دی۔

"اُٹھارہویں صدی کے شروع میں بھوٹان کے ایک بڑے لاما اور عالم نوانگ گیالچن لداخ آئے۔ گیالپو نیچا نمگیل نے دربار میں ان کا سواگت کیا اور اپنے تخت کے پاس بٹھایا۔ گیالپو، کلون، وزراء اور مذہبی علما نوانگ گیالچن کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے۔

لاما نوانگ گیالچن نے راجہ کی طرف سے ان کے اعزاز میں دی گئی پہلی ضیافت کا ذکر کیا ہے "کھانے کی پلیٹیں آنے لگیں اور سوویں پلیٹ تک یہ سلسلہ چلا۔ گوشت کا کوئی آئٹم نہیں تھا۔ کھانے کی ساری قسمیں پھلوں وغیرہ سے تیار کی گئی تھیں"۔

فادر ازے ویڈو کی آمد کے چوراسی سال بعد دو اِطالوی پادر فادر اپولیٹو ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے لیہہ آئے۔ وہ ۷ امئی ۱۷۱۵ءکو سرینگر سے نکلے تھے اور چالیس روز کی مشقت خیز مسافت کے بعد ۲۶ جون ۱۷۱۵ءکو لیہہ پہنچے۔

اُن دنوں لیہہ سرینگر کا راستہ بڑا خراب تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "کشمیر سے لہاتہ (لیہہ) چالیس دن کا سفر ہے، جو ماسوائے پیدل طے نہیں ہوسکتا ہے۔ راستے کا زیادہ حصہ بلند ترین اور نہایت ہی خطرناک پہاڑوں کے ساتھ ہے جس پر بیک وقت ایک سے زیادہ آدمی سفر نہیں کرسکتا۔ کچھ مقامات پر پہاڑ برف کی پسیوں اور موسلا دھار بارش سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور راستہ بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ مسافر جانتا نہیں تھا کہ

کہاں پیر رکھے۔ایسی حالت میں ہمارے رہبروں میں ایک رہبر ایک کلہاڑی لے کر آگے آگے چلتا تھا اور پیر رکھنے کیلئے جگہ بناتا تھا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے تھام کر پیر برابر نشان پر میرا پیر رکھوانے میں مدد دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک تنگ راستہ آیا۔ کئی مقامات پر پہاڑ پر برف جمی ہوئی اور پھسلنے کا خدشہ رہتا۔ پھر یخ لبستہ تنگ راستہ مسدود ہو جاتا............تھوڑی سی لاپروائی سے ڈھلوان راستے سے نیچے گرنے کا ڈر رہتا تھا اور دو پہاڑوں کے تنگنائے میں بہنے والی نشیبی نالے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔"

بہت ساری کشمیری جو پشمینہ خریدنے لداخ آتے تھے، راستے میں ہلاک یا معذور ہو جاتے تھے۔"

فادر ڈیزی ڈیری نے بلتستان کو پہلا چھوٹا تبت کہا اور لیہہ کو دوسرا تبت کہا ہے۔ لیہہ آ کر ان کو معلوم ہوا کہ تیسرا تبت بھی ہے۔جسے مورخوں نے اصلی تبت یا تبتِ بزرگ کہا ہے۔ لیہہ کو وہ لہاتا کہتے ہیں اور قصبے کا نقشہ یوں کھینچا ہے"لیہہ قصبہ ایک بڑے میدان میں ہر طرف پہاڑوں سے گھرا گاؤں نے بھرا پُرا ایک پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ہے جو بڑے لاما کی رہائش گاہ اور بڑے محل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بڑی اور عمدہ عمارتیں ہیں ان کے اوپر چوٹی کے پاس واقع ایک بڑے قلعے کا سائبان ہے۔ساتھ میں دوسرا قلعہ ہے۔نشیب اور دونوں کناروں پر قصبہ فصیل اور دفاعی پھاٹکوں کے ہالے میں ہے۔

لداخ سے متعلق وہ لکھتے ہیں"سارا ملک پہاڑی ہے۔ پیداوار بہت کم ہوتی ہے، آبادی کم ہے۔ یہاں جَو پیدا ہوتا ہے۔ تھوڑی سی گیہوں بھی اُگتی ہے۔ پھلوں میں زیادہ تر خوبانیاں ہیں۔ دوسرے ملکوں سے تجارت کم ہے۔ تجارت ایک عمدہ قسم کی اُون، معمولی سا سونا پیدا کرنے والی ریت اور مشکِ نافہ تک محدود ہے۔ (مصنّف وسطِ ایشیا سے کارواں آنے سے پہلے لہاسہ گئے تھے اور لداخ کی تجارت سے متعلق ان کی علمیت محدود لگتی ہے) درخت اور ایندھن بہت کم ہیں۔ مویشی بہت ہیں۔ لوگوں

کی خاص خوراک بُھنا ہوا جَو کا کھانا اور گوشت ہے۔ پسندیدہ مشروب چھنگ ہے۔ چائے دن میں کئی دفعہ پی جاتی ہے۔ اُن کا لباس اُون کا بنا ہوا ہے۔"

ڈیزی ڈیری نے قصبہ میں بہت سارے کشمیری تاجروں کو دیکھا جو اُون پشمینہ کا کاروبار کرتے تھے۔ انہیں مسجدیں بنانے اور مذہبی آزادی تھی۔

لوگوں کے چال چلن سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ لوگ مزاجاً مغرور نہیں ہیں بلکہ نرم طبع، خوش اخلاق، ہشاش بشاش اور نیک ہیں، البتہ انہوں نے داخلے کے پُل پر تعینات چُنگی کے ملازمین کو لالچی اور ظالم بتایا ہے۔ وہ نقد روپیہ کے علاوہ بڑے کٹھور پن سے تمباکو، کھانڈ اور کپڑے بھی بٹورتے تھے۔

ڈیزی ڈیری نے بتایا ہے کہ علاقے میں متعدد گپنے ہیں جن میں بڑی تعداد میں لامے مقیم ہیں جو ایک بڑے لاما کے تحت رہتے ہیں........لداخ میں بڑا قصبہ نہیں ہے۔ صرف گاؤں ہیں۔

۱۷۸۱ء کے اختتام یا ۱۷۸۲ء کے شروع میں ایک رُوسی سیاح فلپ یافرے موف لداخ کے راستے ہندوستان روانہ ہوا۔ بخارا میں اس کو کرغیزیوں نے بطورِ غلام بیچ دیا تھا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ لداخ آیا۔ لیہہ قصبہ سے متعلق اس کے تاثرات:

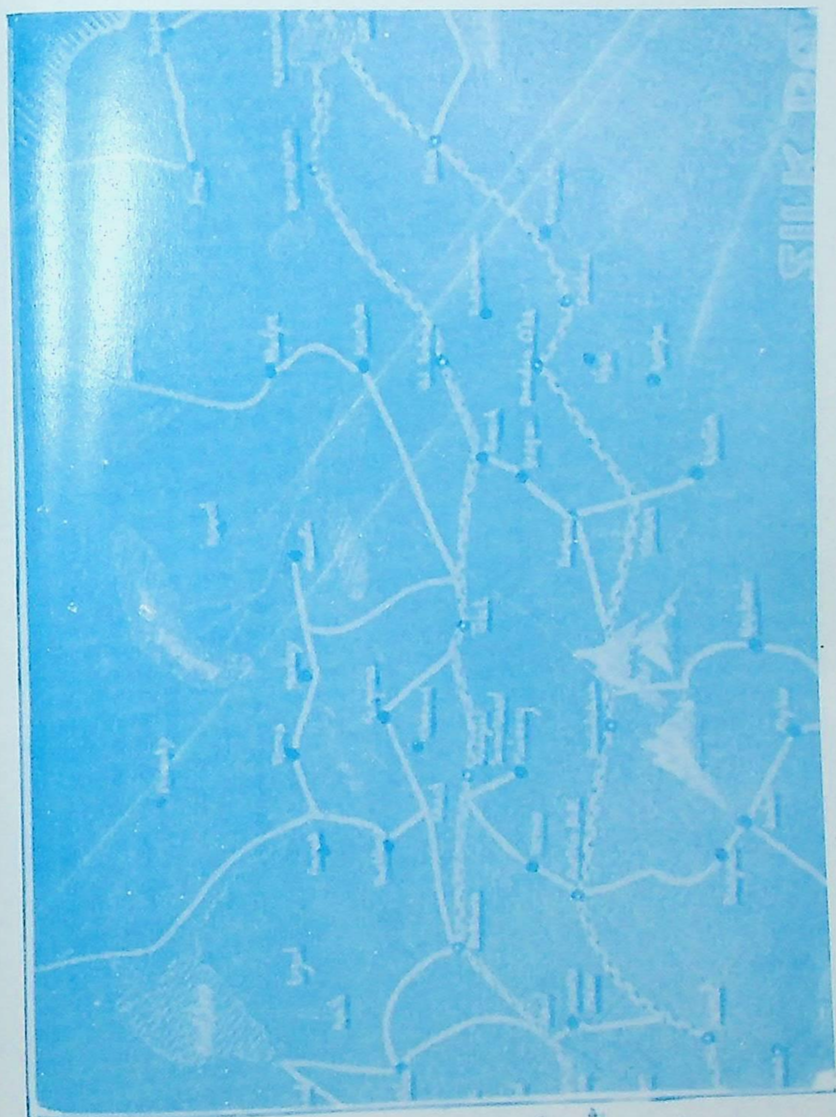
" لیہہ ایک دریا کے پاس ایک پہاڑی کے ڈھلوان پر واقع ہے کافی بڑا ہے اور اس کا رقبہ بخارا کے نصف کے برابر ہے۔ مکانات خالص پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔"

اس کے تیرہ یا چودہ سال بعد ۱۷۹۵ء میں جارجیا کا ایک سیاح رافیل ڈینی بیگوف لیہہ سے گزرا شاہ جارجیا نے اس کو کسی کام پر جارجیا بھیجا تھا۔ وہ ترکی کے راستے ہندوستان آیا اور مدارس، کلکتہ ہوتا ہوا کشمیر پہنچا جہاں سے لداخ آیا۔ سرینگر سے لیہہ پہنچنے میں بیس روز لگے۔ لیہہ سے متعلق وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

" لیہہ اونچے پہاڑوں کے ہالے میں پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں تھوڑی جئی کے سوا کچھ بھی نہیں اگتا۔ لوگ غریبی کی وجہ سے جئی کو پیستے ہیں۔ اس سے دودھ میں

شاہراہ ابریشم کے بعض اہم پڑاؤ





شاہراہ ریشم (سلک روٹ) کا ۱۸۶۶ء میں تیار کردہ نقشہ

شاہراہ ابریشم ..... اہم پڑاؤ

☆ تاریخی قلعہ لداخ



☆ لداخی شادی کا ایک منظر

بھگو کر گائے کا کچھ مکھن ڈال کر اُبالتے ہیں اور یہی ملغوبہ اُن کی واحد خوراک ہے۔

یہاں ایک لاترین رسم Polyandary ہے اِن سے پیدا بچے کا نام سب سے بڑے بھائی کے نام پر رکھا جاتا ہے۔

راستہ بڑا پتھریلا ہے اور مسافر اس کی شکایت کرتے ہیں

لیہہ سے وہ چینی ترکستان روانہ ہوا۔

۱۸۱۴ء میں ایک یورپی جس میں بیلائی فریز ر James Ballie Fraser کشمیر سے لیہہ آیا اس کے مطابق لیہہ بازار میں کشمیری مسلمانوں کی بارہ یا تیرہ دکانیں تھیں تاہم کوئی ہندو بنیا نہیں تھا۔ گاؤں کے لوگ آٹا گھی، اناج اور کھانے پینے کے اشیاء بازار میں بیچنے لاتے تھے۔

اس نے تین میلوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلا چنگ دوس کہلاتا ہے۔ یعنی تبتیوں کے اجتماع کا میلہ جو کاتک یا اکتوبر میں منایا جاتا ہے۔ اس میلے کی تجارتی افادیت تھی۔ دوسرا میلہ دوسمو چھے ہے جو آج بھی منایا جاتا ہے۔ وہ اسے تینوں میں سب سے بڑا میلہ بتاتا ہے اور پھاگن یا فروری میں منایا جاتا ہے۔ تیسر رو پہلا یا فصل کٹائی کا میلہ ہے جو بھادوں یا اگست میں منایا جاتا ہے۔

رو پہلا میلہ شے میں منایا جاتا ہے۔ شاید مصنّف کی سیاحت کی دوران لیہہ میں بھی منایا جاتا ہو۔

جمیز فریز رلکھتا ہے: ان میلوں میں یارقند (یارقند سے مراد یہاں مشرقی ترکستانی یا موجودہ شین جیانگ ہے۔ لداخ میں بھی مشرقی ترکستان کو یارقند کہتے ہیں۔ اگر چہ یارقند مشرق ترکستان کے چھ بڑے شہروں میں ایک ہے) سے آئے ہوئے مسلمان لہاسہ کے لاما، امرتسر اور پنجاب کے ہندو، کشمیر اور دوسرے مقامات کے تاجر بڑی تعداد میں اپنا مال بیچنے لاتے ہیں۔ یہاں سے وہ مغربی تبت کے سرمائی صدر مقام گرتوق جاتے ہیں۔

۲۴ ستمبر ۱۸۲۰ء کو دو یورپی ولیم مور کرافٹ اور جارج ٹریبیک ایک بڑی پارٹی کے ہمراہ لداخ پہنچے۔ اسکی پارٹی میں تقریباً ساٹھ آدمی تھے جن میں چودہ مسلح گور کھے تھے۔

لیہہ کی ساری آبادی انہیں دیکھنے بازار، گلیوں، دیواروں اور چھتوں پر اُمڈ پڑی۔ مور کرافٹ نے بھیڑ میں لداخیوں کے علاوہ یارقندی تاجروں او پگڑی بندھے کشمیریوں کو دیکھا۔ ستمبر میں یارقند سے کارواں پہنچتے تھے۔

یکم اکتوبر کو کلون (وزیر اعظم) نے مور کرافٹ کو مدعو کیا۔ لیہہ کے لوگ پھر ایک دفعہ قصبے کی گلیوں، چھتوں اور دیواروں پر مور کرافٹ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے جمع ہوئے۔ کلون نے مور کرافٹ سے مصافحہ کیا اور صحت کا حال پوچھا اور عمر دریافت کی۔ موسم کا تذکرہ کیا پھر انگلینڈ کے بادشاہ کا نام پوچھا اور سوال کیا کہ روس اور چین کے رنجیت سنگھ کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں؟

کیا آپ روم گئے ہیں؟ کلون کے سوال میں تجسس تھا۔

لداخیوں کے نزدیک اُن دنوں رُوم دنیا کا سب سے بڑا اور طاقت ور ملک تھا۔ چنانچہ لداخی میں ایک کہاوت ہے۔ روم تو چیگ، یُول تو چیگ، یعنی آدھی دنیا روم اور آدھی باقی دنیا ہے۔ رومن Empire سے زیادہ یہ ottoman Emprie سلطنت عثمانیہ لگتا تھا جب عرب ممالک سمیت مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک تُرکی میں شامل تھے۔ مور کرافٹ نے روم کا مطلب ٹرکی کو لیا لیکن ۱۸۲۰ء میں ٹرکی ایک کمزور ملک تھا اور Sick Man of the Europe یورپ کا مردِ بیمار بن رہا تھا۔ اس لحاظ سے لداخیوں کا جغرافیہ کمزور تھا۔ اس دور میں لداخ میں رسل ورسائل کی سہولت کا فقدان تھا اور لداخ کا بیرونی دنیا سے رابطہ کم تھا۔ اس لئے جانکاری حاصل کرنا مشکل تھا۔

پھر کلون اصلی مطلب پر آیا اور بولا ”گرتوق سے تبت کے ایک افسر کا خط آیا ہے اور پوچھا ہے کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ کشمیر کے سکھ گورنر نے دھمکی دی

ہے کہ ان انگریزوں کو زیادہ شہہ نہ دو۔ رنجیت سنگھ ناراض ہو جائے گا۔ سکردو کے حکمران احمد شاہ نے پوچھا ہے کہ آپ لوگ کون ہیں اور کس لئے لداخ آئے ہیں؟ بشا ہیر کے راجہ نے بھی اس ضمن میں خط لکھا ہے۔

تب ایک بزرگ خواجہ شاہ نیاز نے ؟ جو کشمیر کی سکھ حکومت سے نالاں ہو کر لداخ آئے تھے، بولے، "لداخ آزاد ملک ہے اور یہ کسی ملک کے زیرِ نگیں نہیں ہے۔"

مور کرافٹ نے اپنے ساتھ چیچک کی روک تھام کیلئے بہت سے ویکسین لائے تھے۔ اس نے کلون کو ٹیکے کے فائدے بتائے لیکن کلون نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

باتوں کے دوران کلون اپنا سجاوٹ کیا ہوا حقہ پیتا رہا۔

مور کرافٹ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نسل کشی کیلئے رکھے گئے گھوڑوں کا سپرنٹنڈنٹ تھا، جارج ٹریبیک جرمن تھا۔ لداخیوں نے ان کو چھوٹا اور بڑا صاحب کے نام سے یاد کیا ہے۔ لداخ سے ان کو گھوڑے خریدنے کیلئے بخارا جانا تھا لیکن اجازت نہیں ملی۔ چین کی حکومت ان کو اپنے علاقے سے گزرنے کیلئے اجازت دینے کے حق میں نہیں تھی۔

مور کرافٹ کو لداخ میں لگ بھگ دو سال گزارنے پڑے۔ اس دوران اس نے لداخ کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور خطے کے نظام حکومت، سیاسیات، تمدن، تجارت، قدرتی وسائل اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ مور کرافٹ نے لداخ کے اجناس، سبزیاں، میوے، معدنیات، جنگلی جانوروں، پرندوں، مچھلیوں، لباس، خوراک، رہن سہن، فیشن وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کے مشاہدات اور بیانات معتبر اور مستند لگتے ہیں۔

ان دنوں چینی ترکستان (مشرق ترکستان) سے خربوزہ اور ناشپاتی اور کشمیر سے انگور لداخ درآمد ہوتا تھا۔ لداخ سے سالانہ چھ سو من سوکھے پھل لہاسہ برآمد ہوتے تھے۔ تب لداخ میں تمباکو کی کاشت ہوتی تھی۔ آج تمباکو اُگایا نہیں جاتا۔ چنگ تھنگ

کے دریاؤں اور شایوک کی ریت میں سونا پایا جاتا تھا۔

مورکرافٹ رقم طراز ہے۔ تمام دریاؤں اور نالوں میں مچھلیوں کی بھرمار ہے لیکن لوگ بدھ مت کی تعلیم کے مطابق مچھلیاں نہیں پکڑتے ہیں .... خطے میں زیادہ دولت نہیں ہے لیکن جو بھی ہے، مساوی طور بٹی ہوئی ہے۔ آبادی کے بڑے حصے کو آرام اور فراغت نصیب ہے۔

طرزِ حکومت سے متعلق وہ لکھتا ہے۔ راجہ مطلق العنان نہیں ہے۔ اسے رُوسا اور زُعماء آسانی سے معزول کرسکتے ہیں. تاہم اس کے جانشین کا شاہی خاندان سے ہونا لازمی ہے۔

لوگوں کے کردار سے متعلق مورکرافٹ کا مشاہدہ ہے کہ لداخی عمومی طور شریف، دیانت دار، خوش اخلاق، صاف گو اور ڈرپوک ہیں۔ عورتیں خوش مزاج اور طبعاً ہنسی مذاق کرنے والی ہیں۔ طعن و تشنیع تقریباً نہیں جانتی ہیں۔

لداخی عورت کے فیشن سے متعلق وہ لکھتا ہے۔ ایک لداخی عورت اپنے پورے لباس اور لوازمات میں یورپ کی کسی بھی راج دھانی کی فیشن ایبل عورتوں میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔.......... چہرے کا نکھار اور رنگت کیلئے عورتیں ایک نباتاتی بیج شوقلو استعمال کرتی ہیں۔

سماجی زندگی میں اونچ نیچ سے متعلق وہ لکھتا ہے: عام لوگوں کی ٹوپیاں عموماً کالے رنگ کے کپڑے کی بنی ہیں۔ یہ ٹوپی چھوٹی ہوتی ہے اور اس کے اوپر کا حصہ لٹکایا جاتا ہے. جبکہ روساء اسے سیدھا رکھتے ہیں۔

مورکرافٹ کو لداخ کا بیت الخلا کا نظام بڑا پسند آیا اور اسے لداخ سے باہر بھی مروّج کرنے کی تجویز کی۔

لداخی رسوئی کی دھوئیں سے اسے بڑی کوفت ہوتی تھی جس سے آنکھوں کی بیماریاں ہوتی تھیں۔ اس نے دھوئیں کے اخراج سے تعلق لداخ کے وزیر اعظم کو ایک

چمنی کا نقشہ پیش کیا لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔

اُن دنوں لداخ میں کوڑھ کا مرض عام تھا۔ مور کرافٹ.............................. نے کرگل کے حالات بھی لکھے ہیں۔ تب وہاں پر ہر گاؤں میں مکتب تھا جہاں ایک آخون بچوں کو قرآن ناظرہ اور دینیات پڑھاتا تھا۔ کرگل کے ہر گاؤں میں ایک یا دو آدمی ایسے نکلے جو فارسی اور ہندوستانی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ اُن دنوں کرگل سے زیادہ اِس کے قریب واقع گاؤں پشکیوم زیادہ اہم تھا۔

لیہہ میں اپنے قیام کے دوران مور کرافٹ کو ایک روسی یہودی آغا مہدی کی سرگرمیوں کا پتہ چلا۔ اس کا اصلی نام میکھتی رائے نوف تھا۔ روسی وزارتِ خارجہ کی ہدایت پر دہ کئی مرتبہ لداخ آیا تھا اور کشمیر بھی گیا تھا۔ زار روس کی طرف سے اس نے لداخی راجہ کو خط لایا تھا۔ کلون نے یہ خط مور کرافٹ کو دکھایا۔ مور کرافٹ نے روس کی سرگرمیوں کو لداخ میں روسی توسیع پسند پالیسی کا پیش خیمہ قرار دیا۔

پھر لیہہ خبر پہنچی کہ آغا مہدی دوبارہ لداخ آرہا ہے اور راستے میں ہے لیکن قراقرم پر پُراسرار طور اس کی موت ہوئی اس کا ساتھی محمد ظہور لیہہ پہنچا۔ اس کے پاس روس کے شہنشاہ الیکزنڈر اوّل کی طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام ایک خط تھا۔ اس پر رُوس کے وزیرِ خارجہ کاؤنٹ یسے لیرودڈ کا دستخط تھا۔ لیکن یہ خط مہاراجہ تک نہیں پہنچنے دیا گیا مور کرافٹ نے سوماڈی کوروس سے روسی زبان سے اس کا لاطینی میں ترجمہ کرایا اور انگریز سرکار کو کلکتہ بھیجا۔

مور کرافٹ لداخ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھتر چھایا میں لانا چاہتا تھا۔

ماضی میں راجہ سے لے کر پرجا تک سبھی اپنے پیالی جیب میں ساتھ رکھتے تھے۔ مور کرافٹ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ گیالپو نے ایک روز مور کرافٹ کو محل مدعو کیا۔ خیر خیریت اور سفر کے احوال پوچھے۔ لداخی چائے سے تواضع کی راجہ نے خود چائے پینے کیلئے اپنی جیب سے پیلے رنگ کی چینی پیالی نکالی۔ گورنر کا غاسترین نے

شاہ بلوط کی لکڑی بنی پیالی نکالی ،جس کے کناروں پر چاندی کا پترا جڑا تھا۔

دراس میں مور کرافٹ کی ملاقات ہنگری کے سکالر اور ماہرِ لسانیات سوماڈی کو روس سے ہوئی ۔ وہ تحقیقی کام کیلئے سنٹرل ایشیا جانا چاہتا تھا۔مور کرافٹ نے سوما کو مشورہ دیا کہ وہ کلاسیکل لداخی تبّتی کا مطالعہ کرکے اور تبّتی بدھ مت اوراس کے علوم پر تحقیقی کام کرے جو تبت اور لداخ دونوں میں مروّج ہیں۔مور کرافٹ نے سوماڈی کوروس کو کچھ مالی مدد کی اور کلون سے سفارش کرکے سوما کیلئے لداخ کے زنسکار کے زنگلا گنپہ میں ریسرچ کی سہولیت فراہم کی ۔جون ۱۸۲۳ء سے اکتوبر ۱۸۲۲ تک سوما نے زنگلا گنپہ میں ایک لاما سے کلاسیکل لداخی تبّتی سیکھی۔سوما اور لاما دونوں نو مربع فٹ کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔سخت سردی تھی اور اندھیرے کے بعد روشنی کا انتظام نہیں تھا۔سوما نے لداخ اور تبت کے علمی خزینے سے استفادہ لینے میں خاص دلچسپی لی اور اپنی محنت سے مذہبی صحیفے کنگیور اور ان کی تفاسیر ستنگیور پر بصیرت حاصل کی ۔انہوں نے بودھی لغت پر بھی کام شروع کیا۔وہ اپنی رپورٹ لے کر سوباتھو کی انگریز فوجی چھاؤنی پہنچا۔لارڈ ایمہرسٹ نے مزید تحقیقی کام کیلئے ماہانہ پچاس روپے کا الاؤنس منظور کیا۔

۱۸۲۷ء میں وہ زنسکار کے کالم گنپہ پہنچا اور اپنی علمی ریاضت جاری رکھی ۔ ۱۸۳۱ء میں وہ اپنے قیمتی مسّودوں کو لے کر کلکتہ آیا۔لارڈ ولیم بنٹنگ نے اس کا الاؤنس بڑھا کر دوگنا کردیا ۔ایشیاءٹک سوسائیٹی بلڈنگ میں ایک کمرہ دیا اور چھپائی کیلئے ساری لاگت دی۔

۱۸۳۴ء میں سوماڈی کوروس کی مرتب کردہ بودھی انگریزی لغت اور تبّتی گرمیم شائع ہوئے۔سوما نے کنگیو اور ستنگیور پر تبصرے اور لداخی ادب پر مضامین لکھے۔اس طرح سوما نے سب سے پہلے دنیا کو تبّتی علوم اور مذہب سے روشناس کیا۔

اگست ۱۸۳۵ء میں ایک انگریز افسر جی ٹی وینے سکردو پہنچا جہاں وہ سکردو

کے راجہ احمد شاہ کا مہمان رہا۔ وہاں سے وہ لداخ آیا۔ وزیر زور آور سنگھ نے لداخ پر قبضہ کیا تھا اور اس کی فوج لداخیوں پر مظالم ڈھا رہی تھی۔ ویٖنے نے لکھا ہے۔" ڈوگرہ سپاہی (ڈوگرہ کی جگہ ویٖنے نے سکھ لکھا ہے) لداخیوں کو بھیڑ بکریوں کو طرح ہانک رہے ہیں اور ان سے بدسلوکی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ویٖنے سے بھی برا برتاؤ کیا۔ کہیں وہ رُکنا چاہتا اور کسی لداخی سے گاؤں کا نام پوچھنا چاہتا تو سپاہی جواب دہینے نہیں دیتے تھے۔" اس سے پہلے ویٖنے ایک بلتی کے ہمراہ لداخ کے ایک سرحدی گاؤں سیکو بُوچن پہنچا تو بڑے لاما نے ان کا استقبال کیا۔ بڑے لاما کا خیال تھا کہ وہ لداخیوں کو ڈوگروں کی غلامی سے آزادی دینے آئے ہیں۔

راجہ گلاب سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ ویٖنے لداخ جائے۔ لیہہ میں جی ٹی ویٖنے کو مقامی لوگوں سے بالکل ملنے نہیں دیا گیا۔ ویٖنے جب بازار جاتا تو لوگوں کو پہلے ہی بازار سے بھگایا جاتا تھا۔ ایک پٹھان ویٖنے سے ملنا چاہتا تھا اس کو مارا پیٹا۔ ویٖنے اپنے خیمے میں دو لاموں سے بدھ مت سے متعلق سوالات پوچھ رہا تھا انہیں خیمہ سے نکال دیا۔ ویٖنے کے نوکر کے خیمے پر مستقل طور پر ایک پہرہ دار رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں رکاوٹ ڈالی۔ ویٖنے نے لکھا۔" مجھے یقین ہے ہر لداخی مجھے مدد کرتا لیکن کسی کو اس کی جرأت نہیں تھی۔"

لداخ کا معزول راجہ لیہہ کے پاس ایک گاؤں ستوق میں مقیم تھا۔ ویٖنے اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن ڈوگرہ فوج اس کی راہ میں مانع تھی۔ ایک روز اس نے راجہ کو گھوڑے پر دیکھا ہے۔ ویٖنے نے اپنا گھوڑا اُس کی طرف بڑھایا لیکن سکھ افسر جان سنگھ نے راجہ کو اپنا راستہ لینے کیلئے کہا۔

ایک روز ویٖنے اپنے لداخی منشی علی محمد کے ساتھ راجہ کے محل میں زبردستی گھُس گیا۔ جب دو ڈوگرہ سپاہیوں نے کچھ مزاحمت کی تو ویٖنے میان سے تلوار نکالنے لگا۔ سپاہیوں نے مزید مزاحمت نہیں کی۔ ویٖنے راجہ کے پاس پہنچا جو ایک سائیان کے نیچے

ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ وینے نے سلام کیا اور اس کے پاس بیٹھا۔ ابھی اس نے راجہ سے بات کرنی شروع ہی کی تھی کہ جان سنگھ وہاں آدھمکا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ راجہ نے وینے کو اپنا تعاون دینے پر رضامندی ظاہر کی اور وینے باہر نکل آیا۔ دوسری صبح راجہ نے وینے کو ایک خلعت بھیجی۔

بعد میں وینے کو معلوم ہوا کہ لداخ پر قابض ہونے کے بعد گلاب سنگھ کی ایک بڑی خواہش بلتستان پر قبضہ کرنا تھا۔

مئی ۱۸۴۷ء میں گورنر جنرل لارڈ ہارڈینگ نے تبتی سرحدی کمیشن قائم کیا اور تین اہلکاروں میجر الیکزنڈر کننگھم، کپتان ہلوی سٹریچی اور ڈاکٹر تھامسن...... کو سروے اور تحقیقی کام کیلئے لداخ بھیجا۔ خفیہ طور انہیں جاسوسی کا کام بھی سونپا۔ مشن کی تکمیل کے بعد تینوں نے برطانوی ہند سرکار کو اپنی خفیہ رپورٹ دی۔ الیکزنڈر کنگھم نے Ladakh کے نام سے ایک تحقیقی اور علمی کتاب لکھی۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن نے Westrn Himalaya and Tibet کے نام سے لداخ کے پیڑوں، جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں پر ایک کتاب تصنیف کی۔ اس نے سارا لداخ دیکھا اور سکردو بھی گیا۔ ۲/اکتوبر ۱۸۴۷ء کو وہ لیہہ پہنچا۔

تھامس تھامسن نے لکھا ہے کہ لداخ کے ہر گاؤں میں سفیدہ اور بید کے درخت ہیں۔ ۱۹/اکتوبر کو لیہہ میں سورج گرہن دیکھا گیا۔ اس موقعے پر دمامے بجائے گئے تاکہ سورج پر قابض آسیب کو خوفزدہ کیا جائے۔

تھامسن ڈاکٹر بھی تھا۔ اس دوران ایک گاؤں سپول میں تیس افراد فالج سے مرگئے۔ ان میں بچے بھی تھے۔

تھامس تھامسن کیمطابق لیہہ کے علاوہ دیہات میں زورآور سنگھ کے حملے کا اثر بہت کم نظر آتا تھا۔

الیکزنڈر کننگھم نے اپنی کتاب LaDakh میں لداخ کے جغرافیہ نظام

حکومت، تاریخ، مذہب، زبان، تجارت، سماجی زندگی، لداخیوں کی جسمانی ساخت، شکل وشباہت اور رنگ ونسل پر روشنی ڈالی ہے۔ مجرموں کو سزاؤں میں موت، دُرّے مارنا، ملک بدر کرنا اور قید شامل تھے۔ گنپوں کی بے حرمتی یا بے رحمی سے قتل کیلئے سزائے موت تھی۔ اس کیلئے مجرم کو صلیب پر چڑھایا جاتا تھا یا ہاتھ پیر رسی سے باندھے گلے میں ایک بھاری پتھر ڈال کر دریائے سندھ میں پھینکا جاتا تھا۔ ملک بدر کے معتوب مجرم کے ماتھے پر ایک انچ لمبا کُتا چھاپ لوہا داغا جاتا تھا۔ مجرم کو دماموں کی ایک مخصوص دُھن بجاتے، سیٹیاں بجاتے، سنگ باری اور غلاظت پھینکتے ہوئے جلاوطن کیا جاتا ہے۔

کننگھم نے لکھا ہے کہ آرغون مسلمان گزشتہ چند سال سے مرغیاں پال رہے ہیں جو شروع میں انہوں نے کشمیر سے لائی ہیں۔ .... مقامی طور پٹو، کمبل اور تنبو بنائے جاتے ہیں۔

مصنّف نے بیس لداخی بھیڑیں شملہ سے لیں جہاں سے وہ انگلینڈ بھیجی گئیں انہیں شاہزادہ البرٹ کو پیش کیا گیا۔ لندن کے زولوجیکل گارڈن میں ان کی نمائش ہوئی۔ بعد میں انہیں شائقین میں تقسیم کیا گیا۔

کننگھم نے اپنی آمد سے پہلے لداخ کی خومدن جھیل کے بار بار پشتے ٹوٹنے سے سیلاب کے نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۲۶ء ۱۸۳۳ اور ۱۸۴۲ء میں خومدن نے تین مرتبہ لداخ کے علاقہ نوبراہ میں تباہی مچائی تھی اور دریائے سندھ میں پانی چڑھا تھا۔ نوبراہ میں ۱۸ مکانات بہہ گئے تھے اور ۸۳ آدمی، ۱۸ گھوڑے ۱۴ بیل اور ۱۰۴۰ بھیڑ بکریاں سیلاب سے مرگئی تھیں چھوربت اور خپلو میں بھی جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔

خومدن کے سیلاب کا پانی دریائے سندھ میں جانے سے کراچی تک اس کا اثر پڑتا تھا۔ ۱۸۱۲ کے سیلاب سے کٹک کے علاقے میں بڑا نقصان ہوا تھا۔

ایک خاتون مسز ہاروے ۱۸۵۰ء کی گرمیوں میں کلو کے راستے لداخ پہنچی۔

اس کے ہمراہ ایک انگریز فوجی کپتان بھی تھا۔ ٹھکسے میں گنپہ کے لاموں نے گنپوں کے موسیقی کے آلات بجا کر انکا سواگت کیا۔ لوگوں نے دمامے بجائے۔ لیہہ کے تھانیدار بستی رام کالڑ کا ان سے ملنے آیا۔ ۲۰ جولائی کو وہ لیہہ پہنچے۔ ایک سرکاری اہلکار نے ان سے دریافت کیا کہ ان کے اعزاز میں توپ کے کتنے گولے داغے جائیں؟ کپتان نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مہاراجہ برطانوی ہند سرکار سے بڑا ہراساں تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ پس پردہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک متوازی حکومت چلا رہا تھا۔ کئی معاملات میں انگریزوں کو بالادستی حاصل تھی۔ لیہہ میں تعینات وزیر وزارت کو یہ ہدایت ہونی چاہئے کہ لداخ آنے والے افسروں کی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں رکھی جائے۔ لداخ روانگی سے پہلے متعلقہ افسر ریذیڈنٹ یا دوسرے ذرائع سے مہاراجہ کی سرکار کو اطلاع دیتا تھا تاکہ اس کیلئے گھوڑوں، رہائش وغیرہ کے معقول انتظامات ہوں۔ لیہہ میں وزیر اور دوسرے سرکاری افسران معمولی انگریز افسروں اور ان کی بیویوں کی خوشنودی ڈھونڈنے کیلئے کوشاں رہتے تھے۔

مسز ہاروے لکھتی ہے: لوگ مہاراجہ گلاب سنگھ سے بڑے نالاں نظر آرہے تھے"۔ تاہم کنینگھم کے مطابق صرف روسا اور اُمرا نالاں تھے۔

مسز ہاروے کے مطابق لیہہ کے قلعہ میں تین سو سپاہی تھے۔ لداخی معزول راجہ کا پوتا راجکمار جگمت دیسکیو نمگیل ان سے ملنے آیا۔ وہ پندرہ سال کی عمر کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تھانیدار بستی رام بھی آیا۔ کمرے میں ایک ہی کرسی تھی جس پر راجکمار بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی کرسی پیش کی۔ راجکمار ظالم حکمران کے سامنے کانپنے لگا۔ رانی کی خوش سلیقگی کی مسز ہاروے نے تعریف کی ہے جس نے پُرنم آنکھوں سے مسز ہاروے کو اپنی مصیبت بھری کہانی سُنائی۔

مسز ہاروے کا سفرنامہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ مصنفہ رقم طراز ہے: اُن دنوں لداخ میں صرف چقمق اور پٹو بنائے جاتے تھے۔ وہ مصوّر بھی تھی۔ ایک روز وہ

قصبے کی تصویر بنانے جاتی ہے۔ اپنا تجربہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔"۱۱/اگست کی صبح میں اپنے کیمپ سے ذرا دور محل اور اس کے نیچے قصبے کا خاکہ بنانے لگی۔ دو منٹوں میں ایک بڑی بھیڑ نے مجھے گھیر لیا اور میری نشست اور زمین پر بچھائی ہوئی میری شال سے ایک گز کے اندر تک آئی۔ آدھا درجن سپاہی اس بڑے گندے اژدھام کو دُور رکھنے میں ناکافی تھے۔ دھوپ میں بڑی شدت آئی اور مجھے اپنا خاکہ اُدھورا چھوڑنا پڑا۔"

لیہہ سے روانگی سے پہلے انہیں لوک ناچ دکھایا گیا جس میں سو کے قریب مردوں اور عورتوں نے حصہ لیا۔ لاموں نے مکھوٹے پہن کر دھارمک ناچ دکھایا۔

واپسی پر دراس میں سر ہنری لارنس سے ملاقات ہوئی۔ وہ لیہہ جا رہا تھا۔ جولائی ۱۸۵۲ء میں ایک سیاح انڈر یولیتھ اڈمنر لداخ آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے" جب سے لداخ میں اس کے جائز حکمران نہیں رہے، ظلم اور بے اعتنائی سے لداخ افسوسناک حد تک بدلا ہے۔ لیہہ قصبہ کے بڑے بازار کی چند خستہ دکانیں اور ان میں رکھا مال دیکھنا چاہیئے۔ بازاروں اور گلیوں میں عورتوں کی بڑی تعداد اور کام کے انتظار میں بیٹھی لگتی ہیں، کئی عورتوں نے بھاری بوجھ اُٹھایا ہے۔ دوسری عورتیں اور کام کے انتظار میں بیٹھی لگتی ہیں۔ مردوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ بڑی تعداد میں گندھک اور سہاگہ کی کانوں پر کام کرتے ہیں. اس لئے کھیتی باڑی اور دوسرے کام لیہہ اور اسکے آس پاس کی عورتیں کرتی ہیں۔

ایک انگریز فوجی افسر کرنل فریڈ مارکھم ۱۸۵۴ء میں شکار پر لیہہ پہنچا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس سلسلے میں سر ہنری لارنس نے گلاب سنگھ کو پہلے لکھا تھا کہ کرنل کا اچھی طرح سواگت کیا جائے۔ حکام توپوں کی سلامی دینے کیلئے بے تاب نظر آتے تھے۔ تاہم کرنل نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے. وہ ایک شکاری کی حیثیت سے آیا ہے۔

بزگو میں سابق کلون کی بیوی نے کرنل کو دعوت دی۔ زور آور سنگھ کی مہم تبت

میں اس کے شوہر کو تبتیوں نے قیدی بنالیا تھا تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔کلون کی بیوی راستے سے ہر آنے جانے والے یورپیوں سے اپنے شوہر کی رہائی کیلئے درخواست کرتی تھی۔

گیا میں مارکھم کا لداخیوں سے پالا پڑتا ہے۔ وہ ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔"جتنا زیادہ ہمارا لداخیوں سے رابطہ بڑھا میں ان کو زیادہ پسند کرنے لگا۔ان کی عادات میں سادگی ہے اور طبعاً احسان کرنے والے ہیں۔"

گیا میں سردی تھی۔وہ لکھتا ہے۔"جب جون میں یہاں (گیا گاؤں) پانی جمتا ہے تو سردیوں میں کیا عالم ہوگا؟" تاہم لیہہ پہنچ کر سخت گرمی کی شکایت کرتا ہے۔

ایک انگریز فوجی افسر کپتان نائٹ جولائی ۱۸۶۰ء میں لداخ کی سیاحت پر آتا ہے۔۲۷ جولائی کو وہ سرینگر سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔پن دراس کے پاس کسی مقامی آدمی سے کسی جگہ کا فاصلہ پوچھا جاتا تو جواب میں تھوڑی دور یا نزدیک بتاتا۔تھوڑی دور کا مطلب عام طور پر چار میل اور نزدیک کم سے کم پانچ میل ہوتا۔ دوسرے یورپیوں کو بھی اس ضمن میں ایسا ہی تجربہ ہوا ہے۔پن دراس کے پاس نائٹ نے چار لداخی دیکھے جن کی ٹوپیوں پر پھول لگے تھے اور کمر بند میں بنسریاں، چاقو اور تمباکو کی چھوٹی تھیلیاں وغیرہ باندھے تھے نائٹ لکھتا ہے ''بیس سال پہلے گلاب سنگھ کے حملوں کے نشانات ہر جگہ نظر آتے ہیں مکانات اور قلعے گرد وغبار اور کوڑا کرکٹ میں بدل گئے ہیں...... لیہہ City of Dead ''مُردوں کا شہر'' لگتا تھا۔حال میں مرے ہوئے اور پہلے مرے ہوئے لوگوں کے بہت سارے شمشان نظر آرہے تھے۔ مختلف اطراف میں ہڈیاں، بال وغیرہ بکھرے نظر آرہے تھے۔"

کرگل سورو گاؤں میں بھی نائٹ کو جنگ کا نفسیاتی اثر دیکھنے میں آیا۔اُس کو دیکھ کر عورتیں گھروں سے نکل آئیں اور سامنے کے پہاڑ میں غائب ہوگئیں۔ بہت ساری عورتوں نے اپنے بچے اُٹھائے تھے۔جلدی ہی سارا گاؤں لوگوں سے خالی ہوگیا۔

نائٹ نے لیہہ بازار میں بہت سارے کُتے، غلاظت اور بے کار لوگوں کو دیکھا۔

بقولِ نائٹ لداخی مسلمان نوجوان اور یورپ کے رئیسوں کی طرح پگڑی باندھے لمبے چوغے پہن کر اِترا اِترا کر چلتے تھے۔ان کو دیکھ کر نائٹ کے بونڈ سٹریٹ کا بونڈیاد آیا۔

دراس سے آگے نائٹ نے ایک پیڑ پر مٹی کا بنا ایک حقّہ دیکھا جو زمین سے پانچ فٹ کی اونچائی پر تھا۔تمباکو نوش اپنا تمباکو استعمال کر کے یہاں حقہ پی سکتا تھا۔

پشکیوم میں نائٹ نے پولو میچ دیکھا۔

مئی ۱۸۶۰ء میں ایک یورپی شکاری ارتھر برینک لین لیہہ پہنچا۔ وہ شکار کیلئے آیا تھا۔تھانیدار بستی رام سخت بیمار تھا اس نے بوڑھے تھانیدار کو کچھ کونین اور برانڈی دی۔

چنگ چھنمو میں ہر سال کئی انگریز افسر جنگلی یاک کے شکار کیلئے آتے تھے انہیں مقامی شکاریوں کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ وہ لکھتا ہے: جب سے یورپی کشمیر پہنچے ہر ایک قلی اپنے کو شکاری بتاتا ہے۔لداخ کے ایک شکاری پلجور کی اس نے بڑی تعریف کی ہے۔پلجور بڑا ہنس مکھ تھا۔ گاتا تھا' جب یورد میں پلجور مجھ سے جدا ہوا تو میں نے بڑی خالی خولی محسوس کیا۔

وہ دوسرے یورپیوں کی طرح لکھتا ہے کہ اُن دِنوں ڈوگرے لداخیوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔

اُنہی دنوں یا ۱۸۶۰ء سے کچھ مدّت پہلے ایک انگریز ڈبلیو وِلسن لیہہ آیا۔ ذیل کے اقتباسات اس دور کی تصویر کے چند رُخ پیش کرتے ہیں "ٹانکچے سے جب میں لیہہ پہنچا تو میرے نوکر بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ حکام میرا بڑا خیال رکھنے لگے۔ گورنر بستی رام میرے سفر کو کامیاب بنانے کیلئے بڑا کوشاں تھا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔لیہہ قصبہ میری توقع سے چھوٹا تھا۔ اس میں چند دکاندار تھے۔ یارقندی کلو اور کنور کے چند سوداگر بھی تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈوگروں کی حکومت میں تجارت بہت کم ہوئی

ہے۔ تجارت کی ایک شے افیون تھی جو شمال سے آتی تھی اور یارقند جاتی تھی۔ اس کے بدلے میں چرس اور چاندی فراہم ہوتے تھے۔ چرس بھی افیون کی طرح نشیلی ہے۔"

مصنف کئی اور یورپیوں کی طرح لداخیوں کو Tartar تا تار کہا ہے اور لکھتا ہے:" تمام Tartar قصبوں اور گاؤں کی طرح لداخ لیہہ ڈور سے اچھا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قریب سے اس کا نظارہ مایوس کرتا ہے.......... مکانوں پر سفیدی کی گئی ہے دروازوں اور کھڑکیوں پر سرخ، نیلے اور پیلے حاشیے چڑھائے گئے ہیں" ولسن گنپوں کی شاندار عمارت سے متاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے: لیہہ قلعہ میں چھ اور نو پاؤنڈ رتوپیں ہیں اور کئی سوڈوگرہ سپاہی ہیں۔

ولسن لیہہ کے کاردار کے گھر جاتا ہے جہاں اس کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ دوسری شام ایک ادھیڑ عمر کی عورت چند خادماؤں کے ساتھ اس کے پاس آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس کے قیدی شوہر کو تبتیوں سے چھڑالیں۔ ولسن عورت سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تاہم صاف صاف کہتا ہے کہ اسے چھڑانا اس کا یا کسی یورپی کا بس نہیں ہے۔

لداخیوں کے چال چلن سے تعلق وِلسن لکھتا ہے: یہ لوگ بھلے مانس اور سچے ہیں۔ اپنے کام میں وفادار ہیں۔ مہمان نواز، حلیم اور خوش اخلاق ہیں۔

۱۸۶۲ء میں فریڈرک ڈریو پہلے پہل لداخ آیا۔ بعد میں ڈِریو لداخیوں کیلئے جانا پہنچانا نام بنا۔ برطانوی انگریز سرکار کی ایما پر وہ مہاراجہ کی طرف سے لیہہ میں منتظمِ اعلیٰ تعینات ہوا۔ جواُن دنوں وزیرِ وزارت کہلاتا تھا اور چار سال اس عہدے پر فائز رہا۔ عام لوگ اس کی کارگذاری سے مطمئن تھے۔ اس کی کتاب J and K Territories لداخ پر ایک اچھی تصنیف ہے۔

لیہہ قصبہ سے متعلق اس کا تاثر ملاحظہ ہو: یہ انوکھا قصبہ سرسبز باغوں اور اناج کے کھیتوں کے پہلو میں چٹانوں سے گھرا ہوا ہے جس کے پس منظر میں اُونچے پہاڑ ہیں

موسم گرما کی صبح کی دھوپ کی چمک اور روشنی میں نہاتا ہوا منظر جب مجھے یاد آتا ہے تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔"لداخی چائے اور چھنگ بہت پیتے ہیں۔ عورتوں کو اچھی سماجی آزادی ہے۔ متمول خاندانوں کے سوا زیادہ تر بودھ کنبوں میں کثرت اَزدواج کا رواج ہے"۔

لداخی میں ڈوگروہ نسل کے چند لوگ تھے جن کو غلام زادہ کہا جاتا تھا۔ ڈریو جب ۱۸۷۱ء میں دوبارہ لداخ آیا تو ان کی تعداد کم تھی اور انکی کی حالت خستہ تھی۔

۱۸۶۲ء میں سروے آف انڈیا کا ایک افسر کپتان تھامسن جارج منٹگمری لیہہ آیا۔ منٹگمری نے لیہہ میں مشاہدہ کیا کہ لیہہ سے ہندوستان کے باشندے بلا روک ٹوک لہاسہ اور مشرقی ترکستان آجا سکتے تھے۔ اس نے سوچا کہ کسی ہندوستانی کو سروے کے ضروری آلات کے ساتھ خفیہ طور سنٹرل ایشیا اور تبت بھیجا جائے تو وہ اپنا کام نبھا کر آ سکتا ہے۔ منٹگمری کی تجویز کو اُفسرانِ بالا نے منظوری دی۔ اس نے ایک شخص محمد حمید کو ۱۸۶۳ء میں لیہہ سے ضروری آلات کے ساتھ یارقند بھیجا۔ محمد حمید نے یارقند اور کئی مقامات کی بلندیاں، عرض بلد اور طول بلد کو ناپا۔ واپسی پر وہ قراقرم پر چل بسا تاہم منٹگمری نے اس کے سارے کاغذات حاصل کئے۔

بعد میں منٹگمری نے لداخیوں کے بھیس میں ضروری آلات کے ساتھ لوپچق مشن وغیرہ کے ہمراہ تبت جاسوس بھیجے اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر صحیح وسلامت لوٹے۔ **Kashmir Papers,British Interverntion in Kashmir** کے نام سے تین انگریزوں کے مقالوں کو ایک کتاب میں یکجا کیا گیا ہے جس میں مہاراجہ کی حکومت کی بدنظمی اور اس کے حکام کے مظالم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مقالے ۱۸۶۸ سے ۱۸۹۰ء سے متعلق ہیں۔

کنگڑا کے ڈپٹی کمشنر نے لکھا ہے کہ اپنے پورے سفر کے دوران میں نے لداخ میں مہاراجہ کی سرکار کی زیادتیاں، خود حکمران کا لالچی پن، سفاکی اور اس کے تمام

اَرباب ِاختیار کی انتہائی بدعنوانیاں کی واحد کہانی سنی‘‘

دوسرے پیپر میں لکھا: مہاراجہ لداخ میں اپنے افسروں کو کنٹرول میں لانے کی بساط نہیں رکھتا اور یہ فرض کرنا نامناسب نہیں ہے کہ وہ اس طرح کشمیر میں بھی انہیں قابو میں رکھنے کے قابل نہیں ہے۔

رپورٹ میں تاجروں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ ہے۔ مہاراجہ اور اس کے حکام تاجروں پر ظلم کرتے ہیں اور ناجائز پیسہ بٹورتے ہیں۔ تاجران بھاری محصولات سے بھی نالاں تھے۔

آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق' جسے برٹش جوئنٹ کمشنر نے مرتب کیا ہے۔ یارقند سے ہر سال ۵۰۰ من چرس آتی تھی۔ ایک سیر چرس تین روپے میں ملتی تھی۔ ۳۰۰ من چرس لداخ میں استعمال ہوتی تھی ۔ باقی پنجاب وغیرہ جاتی تھی۔ ہر سال چار ہزار من تمباکو لداخ درآمد ہوتا تھا۔

چینی سرکار کو افیون کی درآمد سے تشویش تھی۔ ایک مرحلے پر اس کی درآمدات پر پابندی لگادی جبکہ پنجاب کے انتظامیہ کو لوگوں کے چرس کے روز اُفزوں استعمال پر فکر تھی اور اس کی درآمدات کی حوصلہ شکنی کیلئے بھاری محصولات لگادئے۔

آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق لیہہ بازار میں داخلہ بلتی سرائے سے ہوتا تھا۔ یہاں بہت بلتی نظر آتے تھے۔ یہ جگہ آج بھی بالکھانگ کے نام جانا جانی جاتی ہے ۔ جس کا مطلب بلتی گھر یا سرائے ہے۔ بعد میں داخلہ کے راستے پر ایک بڑا پھاٹک لگایا گیا۔

ہر سال یارقند سے کارواں اور تبت سے چنکپا تاجر لیہہ پہنچے ۔ کارواں کے ساتھ ترکی عازمینِ حج بھی ہوتے جو کشمیر کے راستے حج بیت اللہ کیلئے جاتے تھے اور واپس بھی اسی راستے سے آتے تھے۔ عازمین حج میں کچھ عورتیں اور بچے بھی ہوتے۔ برٹش جوئنٹ کمشنران کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا تھا۔ قارئین کی معلومات کیلئے سال ۱۸۷۶ء کا ریکارڈ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

ترکی تاجر	۶۱۷	عازمین حج	۷۲
تاجروں کے نوکر	۸۵۸	عورتیں	۱۱
باربردار گھوڑے	۲۶۲۳	بچے	۷
سواری کے گھوڑے	۱۸۰	کل افراد	۱۱۶۵
باربردار گدھے	۵۷۰		
تبّتی نمک لدے گھوڑے	۲۰۵		
یاک	۳۷۲		
باربردار بھیڑیں اور بکریاں	۵۶۲۰		
باربردار قلی	۲۵۳		

۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں ڈوگلس فورسیتھ کی قیادت میں لیہہ کے راستے دو اُہم تجارتی مشن یکے بعد دیگرے یارقند روانہ ہوئے۔ مشن کے ہمراہ کئی سائنس دان اور ماہرین تھے۔ ۷۴-۱۸۷۳ء کے مشن میں ایک ماہر طبقات الارض فرڈینینڈ سٹولز لداخ کے مورگو نام کے مقام پر ۱۹ جون ۱۸۷۲ء کو چل بسا۔ لیہہ میں ان کی نعش کی تدفین ہوئی۔

فورستھ کے ایک مشن کے دوران چھ ہزار گھوڑے والے باربردار، منشی قلی وغیرہ تھے جن میں بہت سارے لداخ کے باہر سے لائے گئے تھے۔ تب لیہہ میں اشیائے خوردنی کی قلت سے قحط پڑا۔

۱۸۷۳ء میں برطانوی ہند کا ایک سائنس دان ایچ ڈبلیو بیلیو Bellow سفارتی اور سائنسی مشن پر کاشغر جانے کیلئے لیہہ پہنچا۔ لیہہ کے وزیر جانسن نے لیہہ سے ۵۰ میل آگے سپول میں اس پیشوائی کی۔ لیہہ پہنچنے پر اس کے اعزاز میں لیہہ قلعہ سے توپوں کی سلامی دی۔ برٹش جوئنٹ کمشنر رابرٹ شا نے لیہہ میں اسکا استقبال کیا جہاں لیہہ بازار میں فوج کے ایک دستہ نے سلامی دی۔ جانسن سائنسدان کے ہمراہ یارقند کی

سرحد شہید ولہ تک گیا۔ کاشغر میں بیلیو فورسَتھ مشن کے اُرکان میں شامل ہُوا لگتا ہے۔ اُن دنوں مشرقی ترکستان میں یعقوب بیگ کی حکومت تھی۔ برٹش انڈیا یعقوب بیگ سے تجارتی اور سیاسی تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔ یعقوب نے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۶ء تک گیارہ سال حکومت کی۔ اس کے دو بیٹوں میں تخت کیلئے لڑائی ہوئی چین نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور دوبارہ مشرقی ترکستان پر قابض ہوا۔ یعقوب بیگ مارا گیا۔ بعض لوگوں کیمطابق زہر کھا کر ۱۸۷۶ء میں خودکشی کی۔ ترکی مسلمانوں نے ۱۸۶۴ء اور اسکے بعد کئی دفعہ خونریز بغاوتوں کے بعد یعقوب بیگ کی قیادت میں حکومت قائم کی تھی۔

بیل لیو نے اس سفر کے دوان لداخی سماجی زندگی کا کچھ مشاہدہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: "ایک لداخی کیلئے اس کی پیالی بڑی چہیتی ہے۔ یہ اس کے سینے سے چمٹی رہتی ہے اور ہمیشہ کام دیتی ہے۔ پانی پینے Porridge دلیا اور ستو کھانے کیلئے پیالی استعمال ہوتی ہے۔

نوبراہ میں ۱۸۴۲ء میں جھیل خومدن کے پشتے ٹوٹنے سے جو نقصان پہنچا تھا بل لیو نے تیس سال بعد اس کے نشانات دیکھے۔

کاشغر سے واپسی پر جانسن نے چھونگ تھاش سے آگے دریائے شایوک کے پاس ایک اور مرتبہ سائنسدان کا خیر مقدم کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی طرف سے ٹین بند یورپی کھانے، شمپین، شیری اور دوسری اقسام کی شراب بھیجی گئی تھی۔

۱۷ جون کو وہ لیہہ پہنچا۔ برٹش جوئنٹ کمشنر کپتان مولے نے لیہہ سے دو تین میل آگے بیل لیو کا استقبال کیا۔ لیہہ قلعہ سے سلامی میں توپ کے پندرہ گولے داغے گئے اور سپاہیوں کے علاوہ مقامی لوگوں نے روایتی طور اس کا سواگت کیا۔ آنے یا نہ آنے کیلئے مقامی لوگوں کی مرضی کو داخل نہیں تھی۔ اُس زمانے میں انگریز افسروں کی بڑی ناز برداری ہوتی تھی۔

اس کے چند روز بعد سٹولزیکا کی نعش لیہہ پہنچی۔

۱۸۷۳ء میں ایک سیاح انڈرو ویو ولنس زنسکار پہنچتا ہے۔ اس نے خطے سے متعلق بہت کم معلومات دی ہے۔ وہ انہی کتاب The Abode of snow میں استنبول سے یارقند کے ایک سفیر کی لیہہ آمد سے متعلق لکھتا ہے۔ لداخ میں اس کی آمد کا بڑا چرچا ہے یورپ میں اس نے بہت سامان خریدا۔ لیہہ سے وہ یارقند روانہ ہوتا ہے۔ ولنس نے سنا کہ سامان کی باربرداری کیلئے اُس نے تین ہزار قلی لئے تھے۔ اس کے ساتھ کشمیر سے افسر اور سپاہی بھی تھے۔

۱۸۷۴ء میں دو انگریز کاؤلے لمبرٹ اور لیڈ یکر سرینگر سے ہوتے ہوئے لیہہ آئے۔ سسپول میں کوتوال اور سپاہی نے ان کی خیمہ گاہ کی صفائی کرنے سے انکار کیا۔ کولے آپے سے باہر ہوا اور سزا دینے کیلئے ایک ڈنڈا کاٹا جس نے بقول لمبرٹ صورت حال بدل دی، جس کو کاؤلے کے دوست لیڈ یکر نے ایک پرانی نظم میں معمولی رد و بدل کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔ لیڈ یکٹر کاؤلے کو ڈینیل کہتا ہے۔

"ڈینیل نے ڈنڈا کاٹنا شروع کیا
ڈنڈا سپاہی کو ڈرانے لگا
سپاہی کوتوال کو دھمکی دینے لگا
اور کوتوال نے ایندھن وغیرہ لانا شروع کیا۔"

عام طور پر لداخیوں کے ساتھ یورپیوں کا برتاؤ اچھا ہوتا تھا۔ وہ گھوڑوں کا کرایہ اور کھانے پینے کی چیزوں کی پوری قیمت ادا کرتے تھے۔ شکایات مقامی اور غیر مقامی ملازموں سے تھیں جو لوگوں کو بڑے ہراساں کرتے تھے۔ لہیہ کے وزیر جانسن نے سال ۱۸۸۰ کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ سال ہذا کے دوران کچھ پابندیوں کی وجہ سے صرف تین یورپی سیاح لداخ وارد ہوئے جس سے مقامی لوگوں میں مایوسی پھیلی ہے۔

سیاحوں سے قلیوں کا دکان داروں، گھوڑے والوں اور اُن گاؤں والوں کو مالی فائدہ تھا جہاں سے سیاح گزرتے تھے۔

راستے میں کاؤ لے لمبرٹ نے بہت سارے لداخیوں کو پرئیر ویل گھماتے دیکھا۔ وہ اپنا تاثر یوں بیان کرتا ہے:" پرئیر ویل مفید ایجاد ہے۔ جو بولتے، چلتے، کھاتے اور سواری میں استعمال کرتے ہوئے ثواب کمایا جا سکتا ہے۔"

اُن دنوں جانسن لداخ کا وزیر تھا۔ اس نے لیہہ بازار میں پولو میچ کا اہتمام کیا جسے کاؤ لے لمبرٹ اور یورپیوں نے پسند کیا۔ بعد میں لوک ناچ دکھایا۔ کاؤ لے کو یہ پسند نہیں آیا۔ وہ اپنا ردِعمل یوں بیان کرتا ہے۔" بھلا اسے ناچ کیسے کہا جائے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ناچ ہے۔ اسے مُردے کے گرد لگایا ہوا چکر کہا جائے، تو زیادہ موزوں رہے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ہماری پارٹی کے ایک فرد نے تو یہ ناخوشگوار بات تک کہی کہ یہ رقاص جتنے جتنی جلدی مر جائیں، اتنا بہتر رہے گا۔"

۱۸۷۶ء میں جے سی مورے اینسلے نام کے سیاح اپنی بیوی کے ہمراہ لداخ کی سیاحت پر آئے۔ وہ لکھتا ہے۔" لداخی عورتیں بالوں کی زیادہ چٹیائیں بناتی ہیں جنہیں کمر کے نیچے جوڑا جاتا ہے۔"

۱۸۸۵ء میں لیہہ میں موراوین مشن قائم ہوا۔ مشن نے اپنے قیام کے ایک سال بعد لیہہ میں پہلا سکول کھولا اور لداخ میں علم کا اُجالا پھیلانے میں اُچھا کردار ادا کیا۔ ۱۸۸۷ء میں لیہہ میں ایک ڈسپنسری کھولی۔ یہ لداخ میں پہلی ایلو پیتھک ڈسپنسری تھی۔

پادری ہیڈ مے نے جرمن سے دو تین کلو آلو اور کئی قسموں کی سبزیوں کے بیج لائے اور لیہہ اور کیلانگ میں ان کی پہلی دفعہ کاشت کی۔ مشن نے سردیوں میں زیر زمین سبزیاں محفوظ رکھنے کے طریقے سے لداخیوں کو روشناس کیا۔ لداخ کے فنِ تعمیر پر بھی مشن کا اثر ہے۔ مکانوں میں بڑی کھڑکیاں اور روشن دان بنانے کا رواج مشن نے ڈالا۔ جراب، دستانہ وغیرہ کی بُنائی بھی مشن کے پادریوں نے سکھائی۔ مشن کے پادری والٹر اسبو نے لیہہ میں پہلے پہل دستکاریوں کا ایک مرکز کھولا۔ لیہہ کے مسلمانوں نے پہلے پہل ۱۸۹۸ء میں پادری سموئل ریباک کے تعاون سے ایک سکول کھولا۔ پہلے

پہل لداخ میں گراموفون، پیٹرومکس، کیمرہ، پریشر کوکر، سلائی مشین وغیرہ موراوین مشن نے لائے۔

موراوین مشن نے ۱۹۰۴ء میں 'لداخ گی اخبار' کے نام سے ایک اخبار اجراء کیا جس کے ایک حصے میں خبریں دوسرے میں سلسلہ وار کہانی اور تیسرے میں لداخی کہاوتیں چھپتی تھیں۔

مشن کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لداخی زبان، ثقافت، تمدن اور تاریخ سے دنیا کو آگاہ کیا۔ اس ضمن میں مشن کے پادریوں نے تحقیق اور ترجمے کا کام کیا۔ اہم تاریخی یادگاروں کو منظرِ عام پر لایا۔ اور مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

۱۸۸۷ء میں روسی نژاد کے ایک قلم کار نکولس نوٹو ویچ نے اس اعلان سے ہنگامہ پیدا کیا کہ اس نے لداخ کے ہمس گنپہ میں ایک صحیفہ دیکھا جس میں تبت میں حضرت عیسیٰ کی آمد کا تذکرہ ہے۔ جب اس کی کتاب The unkonwn life of Jesus Christ فرانسیسی میں چھپی۔ تو ساری دنیا میں سنسنی پھیلی۔ جلد ہی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ موراوین مشن کے پادریوں نے ہمیس گنپہ کے انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا جس نے نوٹو ویچ کے بیان کو سراسر غلط قرار دیا۔ آگرہ کالج سے پروفیسر ڈوگلس تصدیق کے لئے لداخ آیا۔ اس کو بھی یہی جواب ملا اور نوٹو ویچ کے بیان کو ایک شوشہ قرار دیا۔ یہ بات ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی ہوتی، اگر رام کرشنا مشن کے نائب صدر سوامی ابھیدا انندا نے یہ تحریری بیان نہ دیا ہوتا کہ انہوں نے بھی یہ صحیفہ ۱۹۲۲ء میں ہمس گنپہ میں دیکھا جس کی تصدیق ۱۹۳۹ء میں دوسر کردہ خواتین الزبتھ کاسپری اور مادر گلوریا نے بھی کی۔ اول الذکر منٹسوری سکول کی بانیوں میں تھی اور مادر گلوریا ورلڈ فیلوشِپ آف faith کی صدر تھی۔ تب سے تصدیق اور تردید کا سلسلہ جاری ہے اور اس صحیفے کی تلاش میں سیاح وقتاً فوقتاً ہمس گنپہ کا چکر کاٹتے ہیں۔

انگریز ریذیڈنٹ کی پہل پر ۱۸۷۵ء میں لیہہ میں ایک ڈاک خانہ کھولا گیا۔ کشمیر

اور لداخ گزیٹر کے مطابق رسل و رسائل کے لئے سونمرگ سے لیہہ تک ۳۲ منزلیں مقرر کی گئی تھیں۔ سردیوں میں سونمرگ سے مٹائن تک مزید سولہ ہرکارے تعینات کئے جاتے تھے۔ گرمیوں میں سرینگر سے لیہہ ڈاک پہنچنے میں سات روز لگتے تھے۔ جبکہ سردیوں میں پندرہ یا اِس سے زیادہ دن لگتے تھے۔ زیادہ تر خطوط ملازموں، یورپیوں اور چند تاجروں کے ہوتے تھے۔

۱۸۸۸ء میں لداخ کا وزیر پنڈت رادھا کشن تھا۔ قصبے میں چار سو مکانات تھے اور بازار میں دکانوں کی تعداد ایک سو تیس تھی۔ جس میں پچاس دکانیں سارا سال کھلی رہتی تھیں۔ باقی دکانیں جولائی سے ستمبر تک کھولی جاتی تھیں۔

گزیٹر کے مطابق ان دنوں لیہہ اور نوبرا میں آباد صرف مسلمان مرغیاں رکھتے تھے۔ لداخ میں کاغذ' ایک پودا Astrogabes Strictus کی جڑوں سے بنایا جاتا تھا۔

راجہ امر سنگھ کی رانی کے انتقال پر ۳۰ ستمبر ۱۸۸۸ء کو لیہہ کے وزیر وزارت پنڈت رادھا کشن کے حکم پر لیہہ میں دکانیں بند رہیں۔ برٹش جوئنٹ کمشنر ایچ رمزے نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت کے مترادف ہے اور ۱۸۷۰ء کے تجارتی معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ رمزے کا یہ بھی کہنا تھا کہ لیہہ ایک آزاد قصبہ ہے۔ عموماً ستمبر میں لیہہ میں کارواں ہوتے ہیں۔

وزیر نے جواب دیا کہ دکانیں بند کرانے کا اختیار وزیر وزارت کو ہے۔ شاہی خاندان کے کسی فرد کے مرنے پر سوگ میں دکانیں بند کی جاتی ہیں۔ آج تک کسی برٹش جوئنٹ کمشنر نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ وزیر نے مزید لکھا کہ ۱۸۷۰ء کے تجارتی معاہدے تحت مہاراجہ نے کچھ مراعات دینا مان لی تھیں لیکن ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ سے مہاراجہ دستبردار نہیں ہوا ہے۔

رمزے نے شاہی یا Royal لفظ استعمال کرنے پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ اس

کے لئے صحیح لفظ Ruling family ہے۔

وزیر رادھا کشن نے لکھا کہ آئندہ وہ Royal کا لفظ استعمال نہیں کرے گا۔

۱۸۸۹ء ایک انگریز، ہملٹن بوور کو ایک افغان داؤ د محمد کی گرفتاری کا کام سونپا گیا۔ بوور مشرقی ترکستان میں شکار کے لئے آیا تھا۔ داؤ د نے انٹر ویوڈلگیشن کو قراقرم پر قتل کیا تھا۔ پنتیس سالہ ڈلگیشن پہلے ایک تاجر تھا اور لیہہ اور یارقند کے درمیان تجارت کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا۔ بعد میں کاشغر میں برٹش کونسل کا آفیسر انچارج مقرر ہوا تھا۔ لیہہ کا ایک شخص شمس الدین داؤ د محمد کو جانتا تھا۔ بوور نے اس کو اپنے ساتھ لیا۔ ایک سال پیچھا کرنے کے بعد بوور اور شمس الدین مفرور مجرم کو سمرقند میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کارکردگی کے لئے شمس الدین کو لیہہ میں ایک تقریب میں برٹش جوئنٹ کمشنر ایچ رمزے، نے تین ہزار روپے انعام اور سند دی اور مناسب ملازمت میں لینے کے لئے ڈوگرہ حکومت کو سفارش کی۔

ہملٹن بوور ۱۸۹۱ء میں لیہہ سے خفیہ سفر پر تبت روانہ ہوا۔ لداخیوں کو اپنے ساتھ کام پر لیتے ہوئے یہ ہدایت دی کہ وہ یہ نہ پوچھیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ تاہم لیہہ آئے ہوئے تبتیوں کو پتہ چلا کہ بوور کی منزل لہاسہ ہے۔ بوور کے ساتھ چھ آرغون تھے۔ سفر میں بوور اور انگریز ڈاکٹر اپنا بھیس بدل کر لداخی لباس پہنتے ہیں تاکہ انہیں نہ پہچانیں۔ تبت میں جگہ جگہ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ پارٹی میں کوئی یورپی تو نہیں۔ وہ نفی میں اس کا جواب دیتے ہیں۔

دوسرے بہت سارے یورپیوں کی طرح آخر کار بوور بھی پہچان لیا جاتا ہے اور وہ لہاسہ نہیں پہنچتا ہے۔

مئی ۱۸۹۱ء میں ایک اور انگریز ای۔ ایف نائٹ لداخ آیا۔ اس کی کتاب Where three empires meet اس زمانے کے بلتستان اور لداخ پر ایک دلچسپ معلوماتی تصنیف ہے۔ نائٹ نے بیان کیا ہے کہ بندوبست افسر کی

اصلاحات کی وجہ سے سیاحوں اور نجی طور سفر کرنے والوں کے لئے گھوڑے کا کرایہ اور رسد کے دام میں اضافہ کیا گیا تھا۔ خود غرض اور دھوکے باز مسافرانِ احکام سے بچنے اور کم روپیہ خرچنے کے لئے جعلی کاغذات سے کام لیتے تھے۔ ایک ملازم کے پاس بہت سارے کاغذات تھے۔ اس نے ای۔ ایف۔ نائٹ کو ایک چٹ دکھائی جس پر کسی فوجی کپتان نے لکھا تھا 'یہ آدمی سب سے بڑا چور اور بدمعاش ہے۔ ایسے لوگوں سے مجھے شاذ ہی پالا پڑا ہے۔

زوجی لا پر لداخی قلی برف سے اپنی آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لئے مقامی طور بنی عینک استعمال کرنے لگے۔ جس کی کمانی لکڑی کی بنی تھی اور رنگین شیشے کی جگہ گھوڑے کے بال بروئے کار لائے گئے تھے۔

زوجی درّے کے بعد دوسری اہم منزل کرگل تھی۔ بقولِ نائٹ "لداخ کے لوگ وادیٔ کرگل کو دنیا میں زرخیز ترین علاقہ سمجھتے ہیں"۔

نائٹ نے دیکھا۔ سیاحوں کا روایتی طور استقبال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں عموماً عورتیں برتنوں اور تھالیوں میں خشک پھل، آٹا، دودھ، لسی، دہی وغیرہ لے کر سیاحوں کی راہ میں راستے کے کنارے کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک غریب آدمی گلدستہ پیش کرتا تھا۔

مصنّف نے لیہہ بازار میں بچوں کو کرکٹ کی قسم کا کھیل کھیلتے دیکھا۔ بلے کی جگہ پولو کی سٹک استعمال کرتے تھے اور گیند لکڑی کی بنی تھی جو پولو میں استعمال ہوتی تھی۔

نائٹ نے مشاہدہ کیا کہ لداخ کے پالتو جانور چھوٹے ہیں۔ اس کے برعکس جنگلی جانور بڑے ہیں۔ غیر ملکیوں کو جانوروں میں لداخ کی بکری سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔

نائٹ نے دیکھا، لیہہ اور آس پاس کے دیہات میں رات کو چوکیدار گشت کرتے ہیں۔

نائٹ کی آمد سے چند سال پہلے گنبوں کے ٹیکس میں اضافہ کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ اس کا سخت ردّعمل ہوا تھا اور لوگوں نے احتجاجی مظاہرے کئے تھے۔

برٹش جوئنٹ کمشنر تر کی تاجروں اور مقامی لوگوں کے مابین جھگڑوں اور تنازعوں کی ثالثی کرتا تھا اور فیصلہ صادر کرتا تھا۔

نائٹ نے رومی کلیسا اور لاموں کی مذہبی رسومات میں بڑی یکسانیت دیکھی۔

مصنف کے مطابق ان دونوں مسلمان عورتیں اپنی ٹوپیوں پر سکے اور سنگار پتیاں سجاتی تھیں، غالباً یہ علاقہ کرگل کی عورتیں ہوں گی جو ماضی قریب تک سجیلی ٹوپیاں پہنتی تھیں۔

ان دنوں لیہہ بازار میں اُفواہ گرم تھی کہ روس نے افغانستان پر فوج کشی کی ہے۔

گلگت کے پاس کشمیر کے علاقے پر Kanjutis کے حملے کی خبر بھی گرم تھی جسے گلگت میں تعینات انگریز ایجنٹ کرنل ڈُورانڈ نپٹ رہا ہے۔

اُن دنوں سامان کی نقل وحمل کے لئے فوج لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بیگار پر گلگت لے جاتی تھی۔ لوگ اس سے بڑے ڈرتے تھے۔ نائٹ نے اس کا ذکر کیا ہے۔" پچھلی خزاں میں گاندربل کے پاس سپاہیوں نے بہت سارے لداخیوں کو گھات لگا کر پکڑا تھا اور گلگت بیگار پر لے گئے تھے۔"

نائٹ نے لکھا ہے۔"کشمیر واپسی پر ہر پڑاؤ پر بچے گلدستہ لے کر پہنچتے اور مصنف کو پیش کرتے تھے۔"

انہی دنوں ایک انگریز افسر لارڈ ایرل آف ڈینمور روسی فوج کی سرگرمیوں اور نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لئے کشمیر سے لداخ روانہ ہوا۔ ۱۰ رمئی ۱۸۹۲ء کو وہ بالتال پہنچا جہاں دراس کے تھانیدار نے ڈینمور کو پانچ روپیہ کا نذرانہ پیش کیا جسے چھو کر واپس کیا جاتا تھا۔ اس رسم کو 'ڈالی' کہا جاتا تھا اور یہ بڑے آدمیوں کیلئے مخصوص تھی۔ ڈینمور نے پانچ روپے کو چھوا اور واپس لینے کیلئے اشارہ کیا۔ انجان آدمی اسے اُٹھالیتا تھا۔ ڈینمور لکھتا ہے۔" ہندوستان میں اس رسم کو Touch and remit کہا جاتا ہے۔"

گاؤں میں لوگ آٹا، چاول، سوکھی خوبانی، اخروٹ وغیرہ کی شکل میں ڈالی پیش

کرتے جن میں کچھ مُٹھی میں لے کر واپس کئے جاتے تھے"۔

دراس سے پہلے پن دراس کو دیکھ کر ڈینمور Western I Sles of Scotland میں اپنا گھر یاد آیا۔ پہاڑیاں، چٹانیں، گھاس، ٹٹو، سبھی وہاں کے مناظر پیش کررہے تھے۔ خربو کے پاس وزیر کی طرف سے ایک لداخی سکالر منشی چھرنگ سپلگیس اور دو آدمیوں نے ڈینمور کا خیر مقدم کیا۔ منشی سپلگیس کئی زبانیں جانتا تھا اور لداخ کی تاریخ پر نظر تھی۔

ڈینمور نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ لیہہ کی آبادی موسم سرما میں تین ہزار رہتی ہے اور گرما میں چار ہزار تک پہنچتی ہے...... لیہہ بازار کے دونوں طرف سفیدہ کے درخت ہیں...... زور آور سنگھ قلعہ میں ۳۵۰ باقاعدہ ڈوگرہ فوج ہے۔ اس کے علاوہ ۵۰ بے قاعدہ اور ۷۰ لداخی سپاہی ہیں۔ چھشوت کا قلعہ حال میں گرالیا گیا تھا۔ لداخی لداخ کو دنیا کی ناف کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لداخ دنیا کے مرکز میں ہے۔

لداخی بودھوں کے ایک سماجی عقیدے کا ذکر کرتا ہوا ڈینمور رقم طراز ہے"اگر ایک تاجر کو لداخ سے لمبے سفر پر یارقند یا کاشغر جانا ہوتا اور وہ اپنی حفاظت اور مال کی فروخت میں اچھا منافع چاہتا ہے، تو وہ اپنے علاقے کے لاما کے پاس جاتا ہے۔ اس سے منتر تراشی ہوئی پتھر کی ایک سل خریدتا ہے۔ اسے احترام سے منے دیوار پر رکھتا ہے اور اس پورے اعتماد کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتا ہے کہ اس کی خواہش پوری ہوگی۔ اچھی فصل کے لئے بھی ایسی سلیں خرید کر منے دیوار پر رکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح بے اولاد والدین اس یقین کے ساتھ سلیں منے پر رکھتے کہ انہیں بچوں والا ایک بھرا پُرا خاندان نصیب ہوگا"۔

پامیر کے سفر کے دوران ڈینمور نے قراقرم درہ کے پار ایک گھاٹی میں انسانوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھے۔ ڈینمور نے اس بے نام وادی کا نام لداخی میں "روسپا لونگپا" ہڈیوں والی وادی رکھا۔ ۱۸،۲۵۰ فٹ بلند ایک درّے پر اس نے

ایک تتلی دیکھی ۔اس کا نام 'پیما پشر ے لا' یا تتلی درّہ رکھا۔

قراقرم کے دامن میں اُسی نے ایک جگہ دیکھی جسے ''اُبلتی چائے کا نالہ'' کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک یارقندی کو چائے پینے کیلئے پانی نہیں اُبلا تھا تو اس نے سارے کنگھے چائے ابالنے کیلئے جلا ڈالے تھے جو اُس کا واحد سامانِ تجارت تھا۔

اس سفر کے دوران ایک مرتبہ اس کے ایک لداخی ملازم شکور علی کو کھانسی ہوئی ۔ ڈینمور نے اس کو کھانے کے لئے لوزینجیس دئے۔ یہ میٹھے تھے ۔شکور علی نے اس کا ذکر دوسرے لداخیوں کے سامنے کیا۔ آدھا گھنٹہ بعد یہ خبر آئی کہ باقی قلیوں کو بھی کھانسی کی شکایت ہے ۔ڈینمور نے سبوں کو درجن بھر لوزینجیس دِیئے۔ ڈینمور لکھتا ہے: لداخیوں کو میٹھی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔''

۱۸۹۴ء کی گرمیوں میں ایک شکاری ایف ۔ای۔ ایس ایڈیر شکار کیلئے لداخ پہنچا۔ اس نے یہاں جنگلی جانوروں کے غول دیکھے اور شکاریوں کو ٹرافیوں کے ساتھ واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ ٹرافیوں میں جنگلی بکروں، جنگلی یاک وغیرہ کے سر تھے ، جنہیں ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کیلئے لے جاتے تھے۔

پاندراس کے پاس ایڈیر کو تین ''سرخ'' ریچھ نظر آئے ۔تبت کی سرحد کے پاس ہنلے گاؤں میں اس نے جنگلی بکرا ناپو کے کئی ریوڑ دیکھے۔

مصنّف نے بتالیس قسموں کی تتلیوں کے نام دئے ہیں۔ یہ تتلیاں ایڈیر کو اپنی سیاحت کے دوران نظر آئیں۔

ان دنوں لداخ میں پختہ پل خال خال تھے ۔آمد و رفت کے لئے دریاؤں پر جھولا پل تھے جو بید کے درخت کی ٹہنیوں سے بنائے جاتے تھے۔ چھوٹے دِل کے لوگ اسے پار کرنے سے ڈرتے تھے ۔مصنّف کے ایک دوست کے خدمت گار کو آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ پیر باندھ کر ایک قلی نے پیٹھ پر اُٹھا کر پل پار کیا۔

لیہہ میں موراوین مشن کے ہاں مہینوں کے بعد ایڈیر کو سلاد اور پھول گوبھی کھانے کو

ملی۔ وہ ان کے ذائقے کی تعریف کرتا ہے۔ مشن کے پادری اپنے باغ میں سبزیاں اُگاتے تھے۔

لیہہ میں اُس نے دھات کا بنا افیون کا پائپ دیکھا۔ اُن دنوں لداخ میں چرس اور افیون عام دستیاب تھیں اور متعدد لوگ ان منشیات کے عادی ہو گئے تھے۔

۱۸۹۴ء میں مشن کا ایک ڈاکٹر احمد شاہ لیہہ آیا۔ وہ چار سال لداخ میں رہا۔ اس نے لداخ سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔

احمد شاہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اُس نے لیہہ میں فٹ بال اور لان ٹینس سے لوگوں کو روشناس کیا۔

لوگ چیچک کا ٹیکہ نہیں لگاتے تھے اور چیچک کے مریض کو کھانا اور پانی دے کر الگ رکھا جاتا تھا۔

احمد شاہ نے لیہہ میں خودکشی کی ایک واردات کا ذکر کیا ہے جو نومبر ۱۸۹۵ء کو پیش آئی۔ جس آدمی نے خودکشی کی اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی کیلئے جہیز کا سامان نہیں تھا۔ ان دنوں دلہن کیلئے سر پوش پیرق کا ہونا ضروری تھا۔

احمد شاہ نے ایک لداخی منشی سپلگیس کا ذکر کیا ہے۔ منشی لیہہ سے پانچ پڑاؤ دُور خربو گاؤں میں وزیر کی طرف سے برٹش جوائنٹ کمشنر کی پیشوائی کیلئے آیا تھا۔ احمد شاہ لکھتا ہے: لداخ میں منشی کی بڑی عزت تھی۔ انتظامیہ کی طرف سے انہیں غیر ملکوں کی رہبری کیلئے متعین کیا جاتا تھا۔ جو کوئی غیر ملکی لیہہ آتا، منشی سے ضرور ملتا تھا۔ منشی پنجابی بھی بولتا تھا۔ ان کے گھر میں لہاسہ کی نادر چیزیں برائے فروخت رکھی تھیں۔ وہ اچھا شکاری تھا۔ ان کے پاس درجن بھر انگریزی بندوقیں اور ریوالور تھے جو یورپی شکاریوں نے ان کو دئے تھے۔

وہ فورستھ مشن کے ساتھ یارقند گیا تھا اور دو مرتبہ لہاسہ روانہ ہوا تھا۔ چندن منشی اور سانو منشی ان کے ہم عصر تھے۔ یہ پنجابی اور اُردو زبانیں جانتے تھے۔ مصنف کو لیہہ

کے وزیر نے انہیں بطور مترجم فراہم کیے۔

ایک انگریز اے ای وارڈ نے The Tourists and Sportmans Guide of Kashmir and Ladakh کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں لداخ کے جنگلی جانوروں، پرندوں اور پھولوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وارڈ ۱۸۹۴ء میں لداخ آیا تھا۔ اس کے دو سال بعد کتاب شائع ہوئی۔

وارڈ نے لکھا ہے، سردیوں میں لیہہ میں دو تہائی دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ پنجابی دکاندار بھی سردیوں میں نہیں رہتے ہیں۔

۱۸۹۶ء میں ڈاکٹر ارتھر نیوے اور ٹینڈل بسکو لداخ آئے۔ دونوں نے زندگی کا بڑا حصہ کشمیر میں گزارا تھا۔ ٹینڈل بسکو نے سرینگر میں بسکو سکول قائم کیا تھا۔ اس ادارے نے وادی کشمیر میں علم کا اجالا پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لداخیوں کے کردار سے متعلق ارتھر نیوے کے تاثرات "لداخی قانع اور شادماں نسل ہیں۔ یہ جھگڑالو نہیں ہیں اور نہ انتقام لینے والے ہیں۔ شاذ و نادر ہی یہ جوئے ہی شراب چھنگ کے اثر میں آتے ہیں۔"

نیوے لداخ سے متعلق لکھتا ہے: "لداخ ایک انوکھی پُر کشش جگہ ہے۔ کشمیر کے شاداب حسن سے یہ بالکل عاری ہے، تاہم اس کے اونچے رتیلے میدانوں اور ناہموار گرینائیٹ کے لمبے پہاڑوں میں اپنا حُسن ہے جو بھی کبھی وہاں گئے ہوں تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

دراس سے متعلق وہ رقم طراز ہے: "دراس ایک ویران اور بلند مقام ہے لیکن اس کی اپنی کشش ہے۔" نیوے دراس کے پہاڑوں کی رنگارنگی سے متاثر لگتا ہے۔

ڈاکٹر نے لداخ کے پھولوں، پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے اُن دنوں مسلمان لیہہ میں مُتعہ کرتے تھے۔

ٹینڈل بسکو نے بھی اپنا دلچسپ سفرنامہ لکھا ہے۔ برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ٹرینچ سرینگر سے لیہہ کے سفر میں ان کے ساتھ تھا۔ راستے میں کئی گاؤں میں برٹش جوائنٹ کمشنر کا استقبال کیا گیا۔ مولبیک میں لاموں نے موسیقی کے آلات بجا کر سواگت کیا اور ایک پولو میچ کا اہتمام کیا۔ راستے میں انہوں نے پانی اور ہاتھ سے چلنے والے پریئر وہیل دیکھے۔ حصولِ ثواب کیلئے بودھ پریئر وہیل کو ہمیشہ حرکت میں رکھتے تھے۔

بسکو لداخی لباس سے بڑا متاثر ہوا۔ مردوں نے اپنے کمر بند سے چاقو، افیون کے پائپ، بٹوہ، قلم دان، دوات، چابک اور چق مق باندھے تھے۔

لیہہ سے ۷ میل آگے بہت سارے لوگ برٹش جوائنٹ کمشنر کی پیشوائی کیلئے آئے تھے۔ بعد میں قصبہ کے بازار میں شاندار استقبال ہوا جن میں سکول کے بینڈ، گنپوں کے موسیقی کے آلات اور مقامی آبادی کا ''کلچور'' روایتی سواگت شامل تھا۔

بسکو نے بھی لکھا ہے کہ بودھوں کی پوجا عیسائیوں سے ملتی ہے۔

ایک انگریز افسر ایچ زیڈ دارا ہ ۱۸۹۶ء میں شکار کیلئے لداخ آیا۔ وہ لکھنو میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ منشی سپلگیں کے حوالے سے اس نے لکھا ہے کہ جنگلی یاک اور مرگ antilope چنگ چھینمو Burhal اور Uryal لیہہ کے نزدیکی نالہ اور رومبق اور Ovis ammon شاپو خرنق میں پائے جاتے ہیں۔

منشی کی سفارش پر اس نے ایک مقامی شکاری راپسا نگ کو اپنے ساتھ لیا۔ داراہ نے راپسانگ کی تعریف کی ہے۔

ان دنوں لیہہ میں موہن لال نام کا ایک دکاندار تھا جس کی دکان پر ساری چیزیں دستیاب تھیں۔

داراہ جگہ جگہ سے ڈاک اور اخبارات لانے کیلئے لیہہ قلی بھیجتا تھا اور حالات سے آگاہ رہتا تھا۔

جون ۱۸۹۸ء میں ایک انگریز فوجی افسر لیفٹینٹ کرنل سر وسیجینلڈ

رنکین (Sir R. Rankeen) لیہہ آتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ہیڈ کلرک بطور مترجم آیا ہے۔ وہ لاہور یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ وہ سکردو بھی جاتا ہے۔ جہاں وزیر اس سے ملنے آتا ہے۔ حسبِ معمول وزیر گورے کرنل کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ کرنل سے روس کی توسیع پسند پالیسی کی بات ہوتی ہے۔ ان دنوں لیہہ۔ سکردو اور لیہہ۔ سرینگر تار کا نظام ہے جس سے مواصلات میں سہولت ہے۔

دریائے سندھ کو دیکھ کر کرنل نے لکھا ہے۔ بلاشبہ وہ دن زیادہ دُور نہیں جب چین کا راستہ کھلے گا۔ تبت کے وسائل کے استعمال سے مشرقی تجارت کو تحریک ملے گی اور ایک عمدہ صبح قدیم دریائے سندھ جاگے گا اور یہ دیکھے گا کہ اس پر سے تبتی سونا، چینی ہاتھی دانت، اناج سینکڑوں جہازوں میں لدے لیہہ سے برفانی چیلاس ہوتے ہوئے کراچی پہنچیں گے۔

ظاہر ہے کرنل نے چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں سے بھرا تیز و تند سندھ نہیں دیکھا تھا۔

ستمبر ۱۸۹۸ء میں لیہہ قصبہ کو خوبصورت بنانے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کیلئے برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ٹرینچ نے کئی تجویزیں رکھیں۔ اس سلسلے میں ایک منصوبہ بنایا گیا جس کے تحت قصبے کی تنگ گلیوں میں بہتری لانے اور پولو گراؤنڈ جانے کیلئے تنگ گلی کو کشادہ کر کے ایک نیا بازار بنانا شامل تھا۔ سکیم کے نئے نقشے میں ڈسپنسری کیلئے ایک نئی جگہ کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ٹرینچ کا بنایا ہوا نیا بازار آج بھی موجود ہے۔

بازار اور گلیوں کو ہفتے میں ایک مرتبہ صاف کیا جانے لگا۔ قصبے کے لوگوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ گرمیوں میں اپنے مکانات اور گلیوں کی مہینے میں کم سے کم ایک مرتبہ صفائی کریں۔

موسمِ بہار کے آغاز میں زمیندار اپنے کھیتوں میں لینے کیلئے بیت الخلا کی کھاد گلیوں میں نکالتے ہیں۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ یہ کھاد گلی میں دو یا تین دن سے زیادہ نہ رہے۔

مضافات کی صفائی کی نگرانی کا فریضہ قصبے کے کوتوال کو سونپا گیا۔
حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کیخلاف تحصیلدار جرمانہ عائد کرتا تھا۔
۱۸۹۹ء کے آس پاس لداخ آنے والے ایک اور شکاری سی ای ایم رسل نے شکار کے احوال لکھے ہیں۔تب ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں شکار کیلئے کئی قوانین وضع کیے تھے۔لداخ میں جنگلی جانوروں کو ہانک کر شکار کیا جاسکتا تھا۔نسل کشی کے موسم میں شکار کی اجازت نہیں تھی۔

شکاری جانور مارنے کی حد قائم کی گئی تھی۔اس کے مطابق ایک شکاری چھ کیل، دو ناپو، چار شاپو، چار Lurhel۔ چار مرگ، دو غزال، دو ہانگل (کشمیری بارہ سینگا) اور ایک میرو مار سکتا تھا۔ چیتے، ریچھ، سور وغیرہ کے شکار کیلئے کوئی تعداد مقرر نہیں کی گئی تھی۔لائسنس فیس ساٹھ روپے تھی جسے سرکار کو سالانہ تئیس ہزار روپے کی آمدنی تھی۔ رسل لکھتا ہے کام پر لئے ہوئے مقامی شکاری اور ملازم لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور کرایہ وغیرہ ادا نہیں کرتے۔

موراوین مشن کے ڈاکٹر اے ہیبر اور کیھتلین ہیبر پہلے پہل ۱۹۰۲ء میں لداخ آئے۔ان کی کتاب The Himalayan tibet لداخ پر ایک دلچسپ کتاب ہے۔قارئین کو اس کتاب میں اس زمانے کے لداخ سے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔لداخ سے متعلق وہ لکھتے ہیں: اس خطے کے ساتھ ہمارے بارہ سال تعلقات کے باوجود ان دلچسپ لوگوں کے بارے میں ہم سطحی معلومات ہی حاصل کر سکے ہیں، پوری جانکاری نہیں۔ہم دکھ کے ساتھ صرف اس یقین پر ان کو چھوڑ کر جاسکتے ہیں کہ مستقبل ہمیں اس وسیع موضوع کو زیادہ فراغت اور قابلیت سے نپٹنے کیلئے یہاں لائے گا۔

ڈاکٹر ہیبر اور مسز ہیبر بارہ سال سے زیادہ لداخ رہے ہوں گے یا وہ انگلینڈ جا کر دوبارہ واپس آئے ہوں گے۔۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ اور اتحادیوں



لداخ اور لداخ سے باہر کے موراوین مشن کے پادری جنہوں نے لداخ کی تاریخ، ثقافت اور تمدّن کے مختلف گوشوں کو منوّر کرنے میں مقدور بھر حصہ ادا کیا۔



۱۹۵۰ء سے قبل کا فوٹو

کی فتح پر لیہہ میں منعقدہ چار روزہ تقریبات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔لیہہ میں پہلی دفعہ پٹاخوں، راکٹوں اور آتش بازی کی پھلجڑیوں کا مظاہرہ ہوا۔وزیر کے بنگلے کے سامنے بڑا سا الاؤ جلایا گیا۔پولیس کے دو سپاہی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ پٹاخوں کے ڈھیر کو آگ لگ گئی تقریباً نصف درجن لوگ زخمی ہوئے۔پولیس کے ایک سپاہی نے چوری سے اپنی جیبوں میں کچھ پٹاخے اُٹھائے تھے۔جنہوں نے آگ پکڑی۔وہ پاس کے نالے میں جا کر لیٹ گیا۔اس دوران اس کے بدن کے مختلف حصوں سے راکٹ اور آتش بازی کی پھلجڑیاں نکلنے لگیں۔دوسرے زخمی علاج کیلئے آئے۔یہ آدمی ہفتوں بعد آیا۔وہ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

اس موقعے پر جرمنی کے بادشاہ کیسر کا پتلا جلایا گیا۔ایک روز شہر میں گھوڑ سواروں کا جلوس نکلا۔اس میں سرکردہ شہریوں کے علاوہ سرکاری ملازم شامل تھے۔ جن میں تحصیلدار، ڈاک بابو، تار بابو، چرس افسر اور داروغہ تھے۔

ہیبر اور کیتھلین ہیبر لکھتے ہیں:"لداخی پھولوں کے بڑے شوقین ہیں۔چھتوں اور جھروکوں پر صندوقوں میں پھول رکھے ہوئے ہیں۔کپڑے پر بٹن ہول نہ ہونے کی وجہ سے کان کی لو پر پھول رکھتے ہیں۔"

انہوں نے زوجی لا پر گونا گوں پھول دیکھے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے ستر اقسام کے پھول گنے۔

مصنفین نے تیر اندازی کے تیوہار اور گھوڑ دوڑ کا بھی ذکر کیا ہے۔ان دنوں لداخ میں حقہ نوشی عام تھی۔عورتیں بھی حقہ پیتی تھیں۔بہتوں کو نسوار کے استعمال کی عادت تھی اور جیب میں نسوار کی ڈبیہ رکھتے تھے۔

اُن دنوں مسلمان ترکی ٹوپی او پگڑی باندھتے تھے ہیبر اور کیتھرائن ہیبر نے لکھا ہے کہ لداخی بڑے صحت مند ہیں اور بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ڈاکٹر ہیبر نے ۱۹۲۵ء میں اس بنا پر استعفےٰ دیا کہ کام کا بوجھ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کیلئے کُل وقتی مشن

کے ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا جواز نہیں ہے۔

ہمیس میلہ پر وزیر اور افسروں کی لڑکیاں بچے بہوئیں وغیرہ بند پالکیوں میں میلہ جاتے تھے۔ غیر ملکی اپنے ساتھ بیٹھنے کیلئے کرسیاں لیتے تھے۔ اس کیلئے ہمس گنپہ کا منیجر باقاعدہ درخواست کرتا تھا۔

ہیبر نے لداخی عورتوں کے مہنگے سرپوش پیرق کا ذکر کیا ہے اور پیرق پر کانوں سے جڑے کھال کے ٹکڑوں سے متعلق یہ روایت بیان کی ہے کہ لداخ کی ایک رانی کو کان کا درد ہوا اس نے بھیڑ کے بچے کی کھال کے ٹکڑے دونوں کانوں سے لگا دئے۔ درباری خواتین نے اس کی تقلید کی پھر یہ عام لوگوں تک پہنچا اور فیشن بن گیا۔

بچوں اور بڑوں کے کھیلوں میں فٹ بال، بھیڑیا اور بھیڑ کا بچہ، آنکھ مچولی، بادشاہ اور وزیر کا کھیل Hopscotch سات سمندر یا پہلا دوجا اور کرکٹ کی قسم کا ایک کھیل شامل تھا۔ مٹی کے تین ڈھیر بنا کر ان پر تین لکڑیاں کھڑی کی جاتیں اور گیند کپڑے کی بنی ہوئی تھی۔

ایک زمانہ میں گھوڑ سوار ایک زندہ بھیڑ کو اُٹھا کر گول تک لینے کا کھیل کھیلتے تھے جو کوئی اسے گول کے پار لینے میں کامیاب ہوتا، اُسے اچھی ضیافت دی جاتی۔ گھوڑ سواروں میں بھیڑ کیلئے چھین جھپٹ ہوتی۔ اس کھیل میں یارقندی حصہ لیتے تھے۔ ہیبر کے زمانے میں اس کھیل میں مُردہ بھیڑ استعمال ہوتی تھی۔

ہیبر نے لداخ کے درد قبیلہ بروقپا کے احوال لکھے ہیں "بودھ بروقپا مُرغ مرغیاں نہیں پالتے ہیں، انڈے نہیں کھاتے، گائے کا دودھ نہیں پیتے اور اس کا مکھن استعمال نہیں کرتے ہیں"۔ دوسرے مغربی سکالر فرانگی، آر۔ بی شا، فلیپی، ڈینیلی، ڈریو، بی ڈلف، جیٹمر وغیرہ نے بروقپا اور ان کے تمدن اور رسوم پر روشنی ڈالی ہے۔

لداخ کے راجہ اور رانی کے ساتھ ان کے تعلقات تھے اور ایک دوسرے کو دعوت دیتے تھے۔ کرسمس پر رانی کو گراموفون کے ریکارڈ سنائے جاتے۔ رانی کبھی "

میجک لنٹرین دکھانے کی فرمائش کرتی تھی۔

کتاب میں ماہرِ طیورٗ بی اوسمسٹن کی ۱۹۲۳ء میں لداخ آمد کا ذکر ہے۔ اوسمسٹن نے ۶۷ قسموں پرندے دیکھے تھے۔ ان میں طوطی، رام کنگرا، چنڈول، کوئل، کھنجن، دیّا، گُرسی، تیتر، دھومرا، کالا باز وغیرہ کے نام دیئے ہیں۔

مصنفین لکھتے ہیں کہ لداخ میں ماہرین حیاتیات، طیور، ارضیات، آثارِ قدیمہ اور دوسرے ماہرین آتے ہیں۔

سالانہ لوپچق اور چاپا تجارتی اور سفارتی مشن اور دوسرے پرائیویٹ مشنوں کے سامان کی نقل وحمل کیلئے لوگوں کو مفت باربردار جانور فراہم کرنا پڑتے تھے۔ لیہہ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ یا برٹش جوائنٹ کمشنر نے ۱۹۰۲ء میں یہ معاملہ انگریز سرکار کے سامنے اُٹھایا اور لکھا کہ عام لوگوں سے مفت کام نہیں لینا چاہئے۔

تبت اور لداخ کے درمیان ایک معاہدہ کے تحت لوپچق مشن ہر سال لہاسہ جاتا تھا اور تبت سے ہر تیسرے سال چاپا کے نام سے ایک سفارتی مشن لداخ آتا تھا۔

لوپچق مشن کو علاقہ لداخ میں آنے جانے میں ۲۷ روز لگتے تھے اور اس کیلئے تین سو کے قریب گھوڑے اور دوسرے باربردار جانور اور کئی قلی مطلوب تھے۔ اسی طرح تبت سے آنے والا چاپا مشن کو اٹھارہ منزلوں کیلئے ۲۵۷ گھوڑے اور یاک مفت فراہم کرنا پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ کئی کمپنیوں کی طرف سے بھی نجی تجارتی اور سفارتی مشن بھیجے جاتے تھے۔ عام لوگوں پر یہ ایک بڑا بوجھ تھا اور اس کا فائدہ چند ایک افراد کو ہوتا تھا۔

ریاستی سرکار کے ساتھ طویل خط وکتابت کے بعد ۱۹۰۴ء میں انگریز سرکار نے یہ فیصلہ دیا کہ لوپچق اور چاپا سفارتی مشن کے زیرِ استعمال آئے باربردار جانوروں کا کرایہ ان کے مالکان کو کشمیر دربار ادا کرے گا اور پرائیویٹ تجارتی مشن کے اخراجات ان کے مکان برداشت کریں گے۔

وزیرِ وزارت کی رپوٹ کے مطابق لوپچق پر ایک بار بردار جانور کیلئے یومیہ چھ آنے کے کرایہ کے حساب سے کل ۲۹۰۵ روپے ۱۴ آنے خرچ آتے تھے اور اِسی شرح کرایہ سے چاپا کے اخراجات ۱۸۶۶ روپے ۴ آنے تھے۔

۱۹۰۴ء کی گرمیوں میں لداخ سیاحت پر آنے والی ایک خاتون جین ای ڈنکن نے اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ وہ بہت سارے انگریزوں کی طرح اُردو جانتی تھی، انہیں دنوں ہمیس میلہ لگا تھا۔ میلے پر چار یا پانچ یورپی اور ایک اُمریکی خاتون مس کینڈل تھی' جو پیشے سے لیکچرار تھی' چار یورپی انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، ائر لینڈ اور آسٹریلیا سے تعلق رکھتے تھے۔

مصنفہ لکھتی ہے کہ سفر میں وزیر کا اجرا کردہ پروانہ کام آتا ہے جس میں گھوڑا اور کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنے کی ہدایت ہوتی ہے۔

جین ای ڈنکن رقم طراز ہے: "سبھی لوگ مرد، عورتیں، بچے ماتھے پر ہاتھ لے کر جوُلے کہتے ہیں۔ لداخ میں پولیس کے صرف تین کانسٹیبل ہیں۔ ایک لیہہ میں تعینات ہے۔ اس کا فریضہ برٹش جوائنٹ کمشنر کے آگے آگے چلنا ہے۔ وہ چور کو پکڑ کر تھانہ لے جاتا ہے جو غیر مقامی ہوتا ہے۔"

...... کپتان پیٹرسن جوائنٹ کمشنر تھا۔ میلے تماشے میں وردی پوش ملازم اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔..........

لداخی انگریزی دوائیوں کیلئے ترستے ہیں اور اندھا دھند اِن کا استعمال کرتے ہیں مصنفہ ایک ڈاکٹر تھی۔ لوگوں نے اکثر اس سے دوائیاں مانگیں۔

وزیر کی طرف سے لیہہ میں یورپیوں کیلئے ناچ تماشے کا اہتمام کیا گیا جس میں لاموں نے دھارمک ناچ بھی دکھایا۔

لیہہ میں نوادرات کی دو دکانیں تھیں جن میں ایک کا مالک ایک مقامی مسلمان حاجی نصر شاہ تھا۔ دکان کی بہت ساری اشیاء لہاسہ اور یارقند سے لائی گئی تھیں۔

موراوین مشن میں ڈاکٹر شا اور ڈاکٹر مارکس تھے۔ڈاکٹر شا نے مصنفہ کو بتایا کہ لیہہ میں شمال یورپ کی ساری سبزیاں جیسے مٹر، پھلی، گوبھی، سلاد، پیاز، گاجر، چقندر وغیرہ اُگتی ہیں۔

لیہہ میں جین ڈنکن نے سُنا کر ۱۹۰۵ء میں ایک ہزار ترکی حاجی لداخ کے راستے وطن لوٹنے والے ہیں۔ روس اور جاپان کی جنگ کی وجہ سے یہ لداخ آنے پر مجبور تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بہت سارے حاجی راستے میں فوت ہوئے۔

مصنفہ چنگ تھنگ بھی گئی واپسی پر پانچ اور سیاح لداخ پہنچے تھے۔ اِن میں تین عورتیں تھیں۔ لداخ سے وہ بلتستان گئی راستے میں پرنس آف Orleans کو دیکھا جو لداخ کے راستے روس جا رہا تھا۔ لیہہ سے کئی سرکاری ملازمین پرنس کے انتظامات کیلئے خلسے آئے تھے۔

اس اثناء میں ایک انگریز لڑکی اسبیلا ایل بشپ لیہہ پہنچتی ہے۔ جب وہ لیہہ پہنچی تو چند ہی دکانیں کھلی تھیں لیکن کارواں پہنچنے سے پہلے شہر کی آبادی تقریباً دوگنی ہوگئی۔ لداخ آنے والے گوناگوں لوگوں میں منے پا (مذہبی منڈلی) آچے لہا مو (کلچرل منڈلی) درویش، فقیر، عازمین حج، وغیرہ شامل تھے Among the Tilbetans (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) میں وہ لکھتی ہے: نوبراہ میں ہندرگاؤں کے لوگوں نے ازبیلا سے پوچھا۔ یورپی عورت ہمیشہ کیوں لکھتی اور سینے پرونے کا کام کرتی رہتی ہے؟ کیا وہ بہت غریب ہے؟ یا اس نے (لکھنے اور سینے پرونے کا کام کرنے کیلئے) حلف اُٹھایا ہے؟

ابسیلا کے مطابق لیہہ میں لوگ وزیر کے حکم کے باوجود اپنے بچوں کو موراوین سکول نہیں بھیجتے تھے۔ پادری ریڈسلوب اور ڈاکٹر کارل مارکس والدین سے ملے اور انہیں ترغیب دی کہ وہ بچوں کو سکول بھیجیں۔ اس کا اچھا نتیجہ نکلا۔

اردبیلا لکھتی ہے مشن کے اسپتال اور ڈسپنسری میں سردیوں میں اوسطاً سو مریض

آتے ہیں۔ گرمیوں میں مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ .... لداخی عورتیں ساٹھ پونڈ وزن کا بوجھ اُٹھا کر درّوں کو پار کرتی ہیں۔ ان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ لداخی سال میں ایک دفعہ نہاتے ہیں۔ تہواروں کے بغیر شاذ ہی کپڑے بدلتے ہیں۔

ان دنوں لیہہ میں ڈاک بابو جولدن نام کا لداخی تھا۔ بقولِ مصنّفہ وہ اپنی دیانت داری اور سچائی کیلئے مشہور تھا۔

نوبراہ کے بعد وہ ۱۳ ہزار فٹ سے زیادہ بلند گاؤں روپشو روانہ ہوئی۔ جہاں اُس نے خانہ بدوش چنگپاؤں کے تین ساتھ راتیں گذاریں۔

از بیلا بشپ کو لیہہ کے خوبصورت آسمان، رنگ اور ثقافت سے لگاؤ کی وجہ سے لداخ سے واپس جانے کا دُکھ تھا۔

۱۹۰۵ء میں برٹش جوائنٹ کمشنر نے وزیر کے نام ایک خط میں یاددہانی کرائی کہ حسب وعدہ ملازمین سے (گاؤں میں) اپنے دورے کے دوران کسانوں کو کھان پان کی اشیاء کے دام ادا کرائیں اور گھوڑے وغیرہ کے استعمال کیلئے ان کا کرایہ کسانوں کو دیں۔ وزیر اپنے تمام ملازموں کو اس حکم پر عمل کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ تحصیلدار اور نائب تحصیلدار کو لکھتا ہے کہ اپنے ماتحتوں سے ان پر عمل کرائیں۔ اگر کرایہ یا اشیاء کی قیمت ادا نہ کرنے کی کوئی شکایت موٌصول ہو تو وہ یہ اس کی نوٹس میں لائیں۔

مہاراجہ اور اس کے حکام لداخ میں اپنی آمدن بڑھانے کے چکر میں رہتے تھے۔ کبھی اون، کبھی سوڈا (جو نوبراہ میں دستیاب تھا) اور کبھی چھنگ پر ٹیکس عائد کرنے کا منصوبہ بناتے۔ کبھی لیہہ میں کسٹم کا دفتر کھولنے کی تجویز رکھتے۔ ملازمین اکثر وسطِ ایشیا کے تاجروں کو ہراساں کرتے تھے اور ان سے روپیہ بٹورنے کیلئے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ ایسے میں برٹش جوائنٹ کمشنر مداخلت کرتا تھا جس سے لداخی اور یارقندی مصیبتوں سے بچ جاتے تھے۔

ڈیوڈ فریزر نام کا سیاح ۱۹۰۶ء میں زنسکار سے لیہہ پہنچا۔ انہی دنوں یارقند

سے کارواں پہنچے۔ وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ جب کارواں آتا ہے تو لیہہ بازار 'الف لیلیٰ' کی یاد دلاتا ہے۔ اُن دنوں یارقند سے درآمدات کا ایک تہائی حصہ چرس تھی جس کی مالیت تین لاکھ روپے تھی۔ اس پر سو فیصد ٹیکس تھا۔ چرس سے پنجاب کے لوگوں کو بڑا نقصان پہنچ رہا تھا، تب حکومت نے ٹیکس چار سو فیصد گُنا بڑھایا۔

ایک سیاح C.M.Enriquez رقم طراز ہے۔ لیہہ Cosmopolitan جیسا عالمی شہر نہیں ہے۔ اس کے دلفریب بازاروں کی چہل پہل کا منظر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

..........لیہہ کی عورتیں خوبصورتی اور پوشاک میں گاؤں کی عورتوں سے بہت بہتر ہیں۔ وہ سبھوں سے کھُلتی ہیں اور صاف گو ہیں۔ مصنف نے لداخی اخلاق کی تعریف کی ہے۔ جسمانی گند کی بُرائی کی ہے..................رومی کلیسا اور لداخی لاموں میں کئی باتوں میں مماثلت پائی ہے اور بتایا کہ گھنٹیاں، تسبیح اور تبرکات ایک جیسے ہیں۔

Enriquez کے لیہہ میں قیام کے دوران قحط کا سا عالم ہوا تھا اور بازار میں آٹا نایاب ہو گیا تھا۔

سون ہیڈین سویڈن کا ایک سرکردہ محقق اور مہم جو تھا۔ وہ چار مرتبہ لداخ آیا تھا جہاں سے وہ تبت اور سنٹرل ایشیا گیا۔ ان کی تصنیف Trans Himalaya (تین جلدیں) ان کے مہم جویانہ سفر اور تحقیقی کارناموں پر بصیرت افروز روشنی ڈالتی ہے۔

۱۸۹۸ء میں ہیڈین کو رایل جیوگرافک سوسایٹی نے Founder ایوارڈ اور ۱۹۰۳ء میں وکٹوریہ ایوارڈ عطا کیا۔

ہیڈین کا انتقال ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو سٹاک ہوم میں ہوا۔

وہ لداخ میں آخری مرتبہ ۱۹۰۸ء میں آیا اپنی تبت کی مہم کیلئے انہیں لیہہ میں پچیس ملازموں کو بھرتی کرنا تھا۔ یہ خبر سن کر اس لمبے اور مشکل سفر پر جانے کیلئے لیہہ کے بہت سارے جسمانی طور ٹھیک آدمی ایک ساتھ مہم پر جانے کیلئے ہیڈین کے

پاس آئے۔ بہتوں نے سفارش لائی تھیں۔ ۶۲ سالہ عبدالغفور نے، جس نے اس سے پہلے لمبے سفر کئے تھے، ہیڈین سے کہا کہ اگر وہ اسکو سفر میں نہیں لے گا تو سردیوں میں اس کے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ کارواں لیڈر محمد عیسیٰ کی سفارش پر ہیڈین نے عبدالغفور کو اپنی پارٹی میں لیا۔ عمر رسیدہ آدمی نے اس سفر میں اپنے ساتھ کفن لیا تو محمد عیسیٰ نے قہقہہ مارا، عبدالغفور صحیح وسلامت لوٹا اور ۵۳ سالہ محمد عیسیٰ اسی تبت سفر میں چل بسا اور وہی کفن ان کے کام آیا۔

یہ واقعہ اس دور کے لداخیوں کی غریبی اور بے روزگاری کی عکاسی کرتا ہے۔ ہیڈین لکھتا ہے ''جب وہ لیہہ سے اپنی مہم پر روانہ ہوا تو بازار میں چند بھکاری ان کے پیچھے پیچھے چلے''۔

ہیڈین لیہہ کے تین امیر تاجر حاجی نصر شاہ، خواجہ غلام رسول اور داوا شاہ کا ذکر کرتا ہے۔ حاجی نصر شاہ کے خاندان میں تقریباً سو افراد تھے۔ لہاسہ، مشگاچے، گرتوق، یارقند اور سرینگر میں ان کے مکانات تھے۔ ان کے بیٹے تجارت کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی حاجی حیدر شاہ اور عمر شاہ کا انتقال ہوا تھا۔

ہیڈین کی خواجہ غلام رسول سے ملاقات مغربی تبت کے سرمائی صدر مقام گرتوق میں ہوئی۔ خواجہ تجارت کے سلسلے میں وہاں ٹھہرا تھا۔ وہ مشرقی ترکستان سے مال منگاتا تھا اور تبت میں فروخت کرتا تھا۔ وہ کئی خانوں والے ایک بڑے تنبوں میں مقیم تھا۔ دیوان خانے میں جہاں قالین بچھے تھے، بخاری جلائی تھی۔ خواجہ اسی میں بیٹھا چاندی کے پترے لگے حقّے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تنبوں کے ساتھ ایک اور چھوٹا خیمہ تھا جس میں وہ نماز پڑھتا تھا۔ ہیڈین اور خواجہ نے فارسی میں بات چیت کی۔ ہیڈین لکھتا ہے خواجہ بڑا خوش مزاج تھا اور ہنسی مذاق کرتا تھا۔

خواجہ نے ہیڈین کو قرض پر روپیہ فراہم کیا اور ہیڈین کی سفارش پر برطانوی ہند کے وائسرائے نے خواجہ غلام رسول کو خان بہادر کا خطاب دیا۔

خواجہ غلام رسول خواجہ نصر شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخی پوچھق مِشن پر اس خاندان کی اجارہ داری تھی۔

داو دشاہ دوسر بڑا تاجر تھا۔ انہوں نے بھی ہیڈین کو مالی امداد کی پیشکش کی۔ داوا شاہ کے خاندان نے بھی لوپچق کی قیادت کی تھی۔

لداخ کے دوسرے چھوٹے تاجر خشک پھل اور کشمش تبت لیتے تھے۔

لداخی راجہ کے ساتھ لیہہ میں تعینات حکام مناسب برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں برٹش جوائنٹ کمشنر کومپ بیل نے مہاراجہ کی سرکار کو چند تجاویز پیش کی تھیں۔ اس ضمن میں اس کا جانشین ڈی جی اولیور ۱۳ جون ۱۹۰۸ کو ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم کو ایک خط بھیجتا ہے جس میں راجہ کے سماجی مرتبہ کا خیال رکھنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ وہ کپتان کومپ بیل کی تجاویز کو بھی حوالہ دیتا ہے جن میں ایک تجویز یہ تھی کہ گیالپو (راجہ) کو کوئی سرکاری کام ہو، تو تحصیلدار کو چاہئے کہ وہ راجہ کا پورا خیال رکھے۔

وزیر اعظم برٹش جوائنٹ کمشنر کا خط وزیر خارجہ کو بھیجتا ہے اور موٴخر الذکر اِسے لیہہ کے وزیر وزارت کو برائے رپورٹ بھیجتا ہے۔ وزیر جواب دیتا ہے کہ لداخ کا راجہ ضم نمگیل ایک بھلا مانس اور خوش اخلاق انسان ہے۔ راجگانِ بلتستان سے لداخی راجہ کا مرتبہ بلند مانا جاتا ہے۔ لداخی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ سال نو وغیرہ کے تیوہار پر راجہ جلوس میں شرکت کرتا ہے۔ ان اخراجات کی وجہ سے راجہ کی مالی حالت خراب ہے اور وہ مقروض ہے۔ اُن کو کارِ سرکار کیلئے وزارت یا تحصیل دفتر میں نہیں بلانا چاہئے اگر عدلیہ کا اہم معاملہ نہ ہو تو وہ اپنا معتبر بھیجنے کا مجاز ہونا چاہئے۔

مہاراجہ نے یہ تجویزیں مان لیں۔ اس دوران وزیر نے تحصیلدار کو ہدایت دی کہ وہ راجہ کیساتھ عزت سے پیش آئے اور انہیں تحصیل میں کرسی پیش کرے۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں امریکہ کا ایک ماہرِ نباتات او آر سٹیورٹ لداخ آیا لداخ

میں اس نے پودوں اور جڑی بوٹیوں کا سروے کیا۔ ۱۹۱۳ء میں سٹیورٹ ایک پارٹی کے ساتھ دوبارہ لداخ آیا۔ لیہہ کرگل کے درمیان دو اُونچے درّوں پر اُس نے ۵۴ قسموں کے پودوں کی گنتی کی۔ گلشن لا، ساپی لا اور روسی لا پر ۱۴۵ قسموں کے پودے پائے گئے۔ روپشو میں ۱۷۵۰۰ فٹ کی بلندی پر چھ (۶) اقسام کے پودے دیکھے۔

اس سفر کے دوران اس نے ۹ ہزار سے ۱۷۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ۴۷۵ قسموں کے پودوں اور جھاڑی بوٹیوں کے نمونے جمع کئے۔

لداخ سے وہ پارالاچا سے ہوتا ہوا شملہ گیا۔

سیٹورٹ نے اپنے سے پہلے لداخ آنے والے ماہرین کی فہرست بنائی ہے جنہوں نے لداخ کے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نمونے جمع کئے۔ ان میں شے لے گین ویٹ، ولیم ہے، جے ایل سیٹورٹ، ورک مینز، کونوے، ڈیزی اور ڈی فلپس شامل ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں ہندرسن اور ہیوم نے، جو فورستھ مشن کے ممبر تھے، ۴۰۰ قسموں کے پودوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ ان میں ۲۷۶ قسمیں لداخ میں پائی گئیں۔

ڈاکٹر فلپس ڈی فلپسی اٹلی کا ایک نامور محقق تھا۔ وہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں بلتستان اور لداخ آیا۔ انہوں نے کرگل میں ڈاک خانہ، تار گھر، سرائے اور ڈوگرہ قلعے کا ذکر کیا ہے۔ تب دریائے سورو پار کرنے کیلئے جھولا پل تھا۔

فلپس مارچ کے مہینے میں لیہہ پہنچا۔ جب وہ پھانک سے بازار میں داخل ہوا تو مہاراجہ کے افسران اور کوشوق کے نمائندے نے استقبال کیا۔

فلپس لکھتا ہے لیہہ بازار کے دونوں طرف پیڑ ہیں۔ بازار پولو گراؤنڈ کے طور استعمال ہوتا ہے۔ .... لیہہ ایک چھوٹی Cosmopolitan دنیا کا مرکز ہے جہاں مختلف طبقوں اور زمروں کے شہری رہتے ہیں .... لداخی عورتیں چہرے کی اچھی رنگت کیلئے بیلاڈونا بیری سے بیج اور اس کا گودا استعمال کرتی ہیں۔

فادر ڈینزی ڈیری کے حوالے سے وہ لکھتا ہے لداخی بالکل مغرور نہیں ہیں وہ

بھلے مانس ہشاش بشاش اور حلیم ہیں۔

آرغون سے متعلق فلپس نے لکھا ہے۔آرغون نام مشرق ترکستان میں عام مستعمل ہے۔ یہ لوگ چینی اور ترکی نسلوں کی اولاد ہیں۔ یہ قدیم نام ہے۔ مارکوپولو نے بھی آرغون کا ذکر کیا ہے جو جنوب مشرق منگولیا میں آباد تھے اور بودھوں اور مسلمانوں کے مخلوط النسل تھے۔

ڈاکٹر فلپس کیمطابق لیہہ ضلع کے ۱۰۸ گاؤں میں ۷۰ا چھوٹے اور بڑے گنپے ہیں۔

ایف ای پیٹر پندرہ سال سے لیہہ میں پادری تھے۔ فلپس کو لیہہ میں ایک گوشہ نشین لاما سے ملا۔ وہ ایک پہاڑی پر ایک چھوٹی سی کُٹیا میں رہتے تھے اور ایک بلی اس کی واحد ساتھی تھی۔

مصنف نے گلوان رسول کو ایک قابل ترین اور بہترین کارواں لیڈر قرار دیا ہے ، جو فلپس کیمطابق تبتی ، انگریزی، فارسی اور تُرکی زبانیں جانتا تھا۔

لیہہ میں فلپس نے کھیل تماشے اور گنپوں کے دھارمک ناچ چھمز دیکھے، اس نے ستورلوق کا میلہ دیکھا، جس میں بدی کی علامت ایک پُتلے پر گولیاں چلائی جاتی تھیں اور پھر نذر آتش کیا جاتا تھا۔ گولیاں چلانے کی شروعات جانسن کی وزارت کے زمانے سے ہوئی۔

ستورلوق کا میلہ قدرتی آفات ، لڑائیوں اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کیلئے ہر سال منایا جاتا ہے۔

مصنّف لکھتا ہے"انہیں دنوں نومبر میں سکردو میں چند غبارے چھوڑے گئے۔ جوردوق میں اترے لاموں نے اس سلسلے میں لمبی پوجا کی۔

Ashbrooke Crump اشبمورو کے کرمپ ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں لداخ آنے والے سیاحوں میں ایک سیاح خاتون تھی۔ وہ جولائی میں لداخ پہنچی۔ دوسرے سیاحوں نے اپنی سیاحت کی سرگذشت نہیں لکھی اس لئے ہم ان کے متعلق

کچھ نہیں جانتے۔ کرمپ نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے۔ لداخی بڑے خوش وخرم رہتے ہیں۔ ہمارے قافلے کے افراد خوش طبع اور خوش مزاج ہیں اور اچھی آواز میں گاتے ہیں۔

لداخی کی سبزیوں کو وہ ایشیا میں بہترین بتاتی ہے۔

امریکی صدر روز ویلٹ کے دو بیٹے تھیوڈر روز ویلٹ اور کرمیت روز ویلٹ شکار کیلئے لداخ آئے جہاں سے وہ یارقند گئے۔ دونوں بھائیوں نے East of the sun and west of the Moon (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اِس سفر کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم لداخ کے علاقے میں پہنچے تو عورتیں اور مرد جُولے جولے کہنے لگے۔ لیہہ بازار میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں حقہ پہنچایا جاتا ہے اور حقہ نوش کش پر کش لگاتا ہے۔

خواجہ عبداللہ شاہ اقسقال تھا جو برٹش جوائنٹ کمشنر کے تحت وسطِ ایشیا کے تجارتی امور کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔

لیہہ میں ان کیلئے ایک تمدّنی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں ایک گلگتی نے تلوار ناچ دکھایا۔

لداخ کے گاؤں نورلا میں انہوں نے ''منے پاشو'' دیکھا

ایک خاتون سیاح ہیلن میری بولنوئیس (Boul nois) اپنے شوہر، پانچ سالہ بچی اور چھ ماہ کا دودھ پیتا بچہ سمیت سیاحت پر لداخ آئی۔ پہلے انہوں نے ہمس کا سالانہ میلہ دیکھا۔ ۵ جولائی ۱۹۶۶ء کو وہ لیہہ پہنچی۔ اپنے سفر نامہ Into little Tibet میں وہ لکھتی ہے: لیہہ بازار خالی خالی سا تھا۔ کارواں کا موسم نہیں تھا۔ بازار میں تبتی اینٹ چائے۔ تانبے کی چائے دانیاں، چاندی کے پترے والی لکڑی کی پیالیاں، لاموں کی گھنٹی، مالا، کشکول، پریر وہیل وغیرہ دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ ایک انسانی کھوپڑی بھی فروخت کیلئے رکھی تھی۔

مصنفہ نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر فرانکی اور کرنل واڈل کی کتابوں کا بہت حوالہ دیا ہے۔ ایسے کئی سفرناموں میں فرانکی اور دوسرے تاریخ دانوں کی کتابوں کے اقتباسات دئے گئے ہیں۔

اس دوران لداخ کے وزیر کی طرف سے یورپیوں کے تفریح کیلئے ایک تماشے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مصنفہ کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ دعوت نامہ کے ساتھ تماشے کا پرواگرم منسلک ہے۔ قارئین کی دلچسپی کیلئے ہم یہاں پروگرام کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ دعا اور ڈرامہ: (سکول کے بچے پیش کریں گے)	دن کے ۳ بجے سے ساڑھے تین بجے
۲۔ بچوں کا کھل	ساڑھے ۳ سے ۴ بجے
۳۔ چائے	۴ بجے سے ساڑھے ۴ بجے
۴۔ چھمز (لاموں کا مذہبی رقص)	ساڑھے ۴ بجے سے ۶ بجے
۵۔ آرام	۶ بجے سے ساڑھے ۸ بجے
۶۔ ڈنر	۸ بجے سے ساڑھے ۹ بجے
۷۔ لمبا آدمی کا ناچ	ساڑھے ۹ سے ۹ بجکر ۴۰ منٹ تک
۸۔ مور ناچ	۹ بجکر ۴۰ فٹ سے ۹ بجکر ۵۰ منٹ تک
۹۔ شیر ناچ	۹ بجکر ۵۰ منٹ سے ۱۰ بجکر ۵ منٹ تک
۱۰۔ سانپ	۱۰ بجکر ۵ منٹ سے ۱۰ بجکر ۲۰ منٹ تک
۱۱۔ بوڑھا آدمی اور بیٹا	۱۰ بجکر ۲۰ منٹ سے ۱۰ بجکر ۲۵ منٹ تک
۱۲۔ گھوڑا سواری	۱۰ بجکر ۲۵ منٹ سے ۱۰ بجکر ۴۰ منٹ تک
۱۳۔ کشمیری پنڈٹ	۱۰ بجکر ۴۰ منٹ سے ۱۰ بجکر ۵۵ منٹ تک
۱۴۔ مور ہٹی	۱۰ بجکر ۵۵ منٹ سے ۱۱ بجکر ۵ منٹ تک

۱۵۔ تلوار ناچ ۱۱ بجکر ۵ منٹ سے ۱۱ بجکر ۱۰ منٹ تک

۱۶۔ کشتی اور امبان ۱۱ بجکر ۱۰ منٹ سے ۱۱ بجکر ۲۰ منٹ تک

تماشے کا مذکورہ پروگرام ہندوستان کو آزادی ملنے تک کم وبیش قائم رہا جو برٹش جوائنٹ کمشنر اور دوسرے مہمانوں کو وقتاً دِکھایا جاتا ہے۔ بعد میں ان میں چند آئیٹم مہیا کیے گئے اور ان کے بدلے میں نئے آئیٹم کا اضافہ کیا گیا۔ کئی سیاحوں نے بڑے چاؤ سے اس تماشے کا تذکرہ کیا ہے۔ مور ناچ، شیر ناچ اور کشتی اور امبان چین کے دین ہیں۔ ان تماشوں کو دیکھنے کیلئے اکثر لداخی آتے تھے۔

۱۹۲۲ء کی گرمیوں میں ایک اور خاتون سیاح لیلین اے سٹار لیہہ پہنچی۔ زوجی لا پر اس نے گھوڑے پر سوار ۷۵ قسموں کے خودرو پھول گنے۔ لیلین نے زوجی لا کو Rock Garden کہا ہے۔ ڈاک ہرکاروں کیلئے درّے پر ہٹس بنے تھے۔ لیلین نے خردونگ درّہ پر کئی اقسام کے پھول دیکھے۔ لیکن یہ بکھرے بکھرے تھے۔

لیہہ میں ایک شام پریذیڈنٹ کے اعزاز میں وزیر کی طرف سے ایک تماشے کا اہتمام کیا گیا۔ لیلین نے بھی یہ تماشا دیکھا۔ پروگرام وہی تھا جس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ تماشہ گاہ میں کوشوق (بڑے لاما) اور راجہ کیلئے الگ شامیانہ تھا ہندو اور مسلمانوں کیلئے الگ شامیانے تھے۔ تماشا گاہ کے درمیان میں الاؤ جلایا گیا تھا جس پر بار بار مٹی کا تیل چھڑکا جاتا تھا۔ اس کی روشنی سے سازماحول جگمگا اُٹھتا تھا۔ بقول مصنّفہ "ایک لحاظ سے روپیہ جلایا جارہا تھا کیونکہ پنجاب اور کشمیر کے ایک ٹین مٹی کا تیل بیس ڈالر میں لداخ پہنچتا تھا۔"

انہی دنوں نیانگ گنپہ کے لامے جموں سے لیہہ واپس پہنچے تھے۔ انہیں پرنس آف ویلز کو چھمز دکھانے کیلئے جموں لیا گیا تھا۔

پھر لداخ سے واپس جانے کا دن آگیا۔ لیلین اے سٹار حسرت سے کہتی ہے:

افسوس! ۲؍اگست کو ہمیں واپسی سفر پر دوبارہ روانہ ہونا پڑا۔"

تبت میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے سے پہلے لداخ سے متعدد بودھ یاترا اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کیلئے لہاسہ جاتے تھے۔ کئی بودھ مذہبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کے لداخ لوٹتے تھے۔ کچھ لوگ وہاں مستقل بس جاتے تھے چند مسلمان تجارت کے سلسلے میں تبت آتے جاتے تھے۔ لیہہ سے لہاسہ تین ماہ کا سفر تھا۔

ہر لداخی کیلئے تبت کھلا تھا۔ اِس کا فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے تبت اور یارقند جاسوس بھیجے جن کا ذکر اُوپر آیا ہے۔

لداخیوں کے تئیں تبتیوں کی نظروں میں اپنی ایک شبیہہ ہے۔ ذیل کا واقعہ اس ضمن میں ایک مثال ہے۔ الیکزنڈر ڈیوڈ نیلی ایک فرانسیسی عورت تھی۔ وہ تبت جانا چاہتی تھی لیکن یورپیوں کیلئے تبت ممنوعہ علاقہ تھا۔ ۱۹۲۳ء میں سکم کے ایک لاما یونگرن کے ہمراہ یاتری بن کر وہ لہاسہ پہنچی۔ وہ تبتی زبان جانتی تھی۔ اس نے اپنے چہرے اور بالوں کو سیاہ بنایا تھا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھے۔ اپنا تجربہ وہ یوں بتاتی ہے:

"پوتالا کا درشن کر کے جب میں نیچے اُتر رہی تھی تو مجھے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، تمہارے خیال میں یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس نے خود ہی اس کا جواب دیا۔ یہ ایک لداخی ہونی چاہیئے۔

دوسری مرتبہ جب میں چوکھنگ دیکھ رہی تھی، تب بھی میں لداخی سمجھی گئی۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔ اس عورت کو پَوِتر پانی دے دو، بیچاری دُور لداخ سے آئی ہے۔ اس کی گہری عقیدت کو دیکھو۔

میں نے اُپنے گرد مسکراتے چہرے دیکھے۔ ایک آدمی میرا بازو پکڑ کر لے گیا اور ہیرے جڑے ایک برتن سے پوتر پانی پلایا۔"

اگست ۱۹۲۴ء میں ایک روسی پی ایس نازاروف کاشغر سے لداخ کیلئے نکلا۔ اس نے روس میں کمیونسٹوں کیخلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا اور وہاں سے فرار ہوا تھا۔

تمازاروف نے اپنے سفرنامہ میں لداخ سے متعلق اپنے مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: عورتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی پیرق پہنتی ہے۔ حتیٰ کہ پانچ چھ سال کی بچیوں کے سر پر پیرق تھے۔

پیالی کے علاوہ لداخی چمچی بھی اُٹھاتے ہیں۔ عورت اور مرد کیلئے الگ الگ چمچی ہے۔ ایک سِرا شوربہ پینے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرا سِرا ستو ہلانے میں کام آتا ہے۔ یہ کمر بند سے باندھی ہوتی ہے۔

لداخی پھولوں کے شوقین ہیں۔ اپنی ٹوپیوں پر پھول لگاتے ہیں۔

ذاتی صفائی ــــــ سے یہ غافل ہیں لیکن اپنے گھروں، گلیوں اور باغوں کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔

کرگل کے لوگ بھی دیانت دار اور نیک خصلت کے ہیں۔

لیہ سے کشمیر جاتے ہوئے راستے میں نازاروف کوٹی شکل کے ڈنڈے پر سامان اُٹھائے بلتی نظر آئے جو معاش کی تلاش میں شملہ جا رہے تھے۔

۱۹۲۰ء کی دھائی میں ایک انگریز فوجی افسر میجر ایم ایل اے کامپرٹس Compartz المعروف گنپت لداخ آیا۔ وہ لداخ کا سچّا عاشق تھا۔ اس کی دو کتابیں The magic Ladakh اور The Road to Lamaland اُس دور کے لداخ کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ وہ دو دفعہ لداخ آیا لگتا ہے۔ ایک مرتبہ اُس نے پورے چھ مہینے لداخ کی سیاحت کی۔ لداخ اور Magic جادو کا لفظ بہتوں کی زبان پر رہا ہے "Magic Ladakh" ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔

میجر کا نام گنپت اس کے ماتحت ہندوستانی فوج نے رکھا تھا جب وہ ایک پیدل رجمنٹ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔

وہ لکھتا ہے: میرے لئے عمومی طور بالائی برف اور خصوصی طور لداخ دلکشی

رکھتا ہے جس کی کشش سے میں پامال ہوتا ہوں۔ دوسرے لوگ بھی انہی تجربات سے گزرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ یہ لداخ خوابوں اور تخیّلات کا دیش ہے۔

گنپت لداخیوں سے متعلق اپنے تاثرات اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے" میری نظرِ انتخاب میں لداخیوں میں تین خصوصیتیں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ خوش رہنا، دیانت داری اور کام کرنے کا جذبۂ گرمی اور سردی میں یہ ہنستے ہنستے محنت اور مشقت کریں گے۔ بھاری بوجھ اُٹھا کر لمبے فاصلے طے کریں گے۔ تھوڑی سی خوراک اور معمولی سے آرام پر وہ جیتے ہیں جس معنی میں ہم آرام و آسائش کو لیتے ہیں چاہے غریب ہوں یا امیر وہ ان سے بالکل ناواقف ہیں۔ حتیٰ کہ لداخ میں اُمارت کا جو مفہوم ہے، انگلینڈ میں اِسکے مراد غریبی ہوگی۔"

لداخی عورت سے متعلق گنپت کے تاثرات؟ لداخی عورت اپنے گھر کی مکمل مالکن ہے۔ مرد اُس کی مضبوط قوتِ بازو کے زیرِ نگیں ہے۔ اُس کے پاس اپنا روپیہ ہے۔ وہ اپنی جگہ تجارت کرتی ہے۔ اس کا لفظ قانون ہے۔"

The Road to Lama Land میں وہ لکھتا ہے:" جو کوئی لیہہ آتا ہے وہ یا تو انوکھا آدمی ہوتا ہے۔ یا عمدہ انسان۔ زیادہ تر عمدہ انسان ہوتا ہے۔ لداخ آنے والے زیادہ تر لوگ محقق، سائنسدان، فن کار، قلم کار، منتظم ہوتے ہیں۔"

ہیبر کے پاس ایک آٹوگراف البم تھا۔ جس میں بڑے دلچسپ نام تھے۔

لداخ کی معاشی حالت سے متعلق گنپت بڑی مثبت رائے رکھتا ہے اور تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے لداخ ایک خود کفیل خطہ ہے۔ یہ ہر چیز پیدا کرتا ہے۔ ....لداخ غریب نہیں۔ میں نے یہاں کوئی بھکاری نہیں دیکھا۔ کوئی بچہ بے سہارا نہیں ہے۔"

اس کے مشاہدے کے مطابق لیہہ میں ان دنوں کوئی نانبائی نہیں تھا۔ گھر میں بنی روٹی، مربہ اور مکھن استعمال ہوتا ہے۔

وہ رقم طراز ہے: "لداخ کے ایک دیہاتی کی زندگی سڑک اور اس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہے۔ وہ دھرتی کا پروردہ ہے اور زمین اس کی زندگی میں رچی بسی ہے۔ کتابوں، فلموں، سیاستدانوں ہڑتالوں، تالہ بندیوں اور دوسرے بے شمار فوائد سے یہ بے خبر ہیں جو جدید خوفناک درندہ ترقی کے دین ہیں۔ یہ فصلوں اور اپنے مویشیوں کے مسائل میں مستغرق رہتا ہے۔

لداخ میں دیہات صدیوں تک ایسے ہی رہیں گے۔ یہاں پہاڑوں کی وجہ سے جہاز اُتر نہیں سکتے۔ گاڑی نہیں جا سکتی............ عورتیں تکلی پر اُون کاتتی ہوئی چلتی ہیں............ مالا پھیرتے، پریر وہیل گھماتے، رسی باٹتے مرد اور اُون کاتتی ہوئی عورتیں عام نظر آتی ہیں۔

میلے میں جب تبتی (لداخی) عورتوں کو آئینہ، ماچس وغیرہ دکھائے جاتے تو حیران ہو جاتی تھیں۔"

گپنت کیمطابق ان دنوں صرف کرگل اور لیہہ میں دکانیں تھیں۔ راستے میں دودھ، انڈے اور چوزے کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔ کرگل قصبہ میں مٹی کا تیل، ماچس، بمبئی اور مانچسٹر کے سوتی کپڑے دستیاب ہیں۔

رنگ برنگ پہاڑوں کے پس منظر میں اس کو کرگل دلکش لگا۔

پشکیوم گاؤں کو گپنت نے اس کی بنجر بھوری پہاڑیوں اور برفانی نالوں کیلئے جواہر اور زمردی رنگ کا قیمتی پتھر کہا ہے۔

گپنت نے چقمق سے آگ بنانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن ایک لداخی نے تین دفعہ رگڑنے پر چنگاری پیدا کی۔

مصنف نے لداخ میں مکہ معظمہ سے حج کر کے آنے والے بہت سارے یارقندی دیکھے اور سفر کے دوران راستے میں مرنے والے مسافروں کی قبریں نظر آئیں۔

Mountain Magic کی مصنفہ ایوے اور ے ۱۹۲۶ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ لداخ آئی اور بے ساختہ یہ لکھا: ہم ایک ایسے ملک میں آئے ہیں جو دوسرے سیّارے کا لگتا ہے۔ جس دنیا کو ہم جانتے ہیں یہ اس سے بالکل مختلف ہے۔"

لداخیوں سے متعلق وہ رقم طراز ہے: بازار میں ہر لداخی ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ لداخی، خاص کر عورتیں بہت ہنستی ہیں۔ یہ عیاں تھا کہ بڑی غریبی اور لاعلمی کے باوجود اِن کو زندگی اچھی لگتی تھی۔ موراوین مشنری نے ہمیں بتایا کہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے یہ زیادہ سیدھے سادے ہیں......... لداخ میں میلوں پر الاؤ ہوتا ہے جس پر مٹی کا تیل چھڑکایا جاتا ہے۔"

ایوے اور ے کیمطابق اُن دنوں سرینگرتالیہہ ہر ریسٹ ہاؤس میں مختلف موضوعات پر کتابیں ہوتی تھیں جو سیلانیوں نے پچھلے پچاس سال کے دوران چھوڑی ہیں۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں تین دلچسپ اور انوکھے یورپی لداخ آئے۔ ان میں ایک عورت تھی۔ کچھ لوگ انہیں امریکی بتاتے ہیں۔ تینوں دسمبر سے مئی تک تقریباً چھ مہینے لیہہ کی ایک پہاڑی پر ایک تنبو میں رہے جس میں گرمی کیلئے بخاری جلائی جاتی تھی۔ وہ بہت کم قصبے میں آتے تھے اور پہاڑی کے اوپر سے قصبے کا نظارہ کرتے تھے۔ ان کی کتاب خطوط پر مشتمل ہے۔ جو "ژھمسکنگ" یا خانہ گوشہ نشین کے پتہ سے انہوں نے اپنے احباب اور عزیزوں کو لکھا ہے۔ خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۲۷ء میں Hamalayan letters of Gupsy Davy and ady Ba کے نام سے چھپا ہے۔ ماضی قریب تک لیہہ میں بہت سارے بزرگوں کو پہاڑی پر ان کے رہنے کا واقعہ اچھی طرح یاد تھا اور یہ رِگی صاحب یا پہاڑی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

سخت سردی میں یہ پہاڑی کی بلندی پر کیوں رہے؟ لیہہ کے باشندوں کیلئے یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ لیہہ کے اکثر لوگ کہتے تھے کہ قصبے کے ایک تارک الدنیا

بھکشو نے اپنی روحانی طاقت سے ان کو سونے کا ایک ہرن دکھایا تھا اور وہ اسی سراب کی تلاش میں وہاں ٹھہرے تھے۔ جبکہ پڑھے لکھے لوگ کہتے تھے کہ یہ یورینیم کی تلاش میں پہاڑ پر مقیم ہیں۔

اپنے خطوط میں انہوں نے لکھا ہے کہ لداخی ان دنوں لین دین میں کرنسی نوٹ پسند نہیں کرتے تھے اور چاندی کے سکے مانگتے تھے۔ فیروزہ، اُون وغیرہ ان کیلئے اہم تھے۔ مسلمان فیض کیپ پہنتے تھے۔ چنگپا اور یارقندی زبان استعمال کئے بغیر آستینوں میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے اور دوسرے قیمتی مال کی قیمتیں تعیّن کرتے تھے۔ اس کیلئے اُنگلیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

اگست ۱۹۲۵ء میں ناموررُوسی مصوّر نکولس روریک لداخ آیا۔ روریک اور اس کی پارٹی ۷ کے افراد پہاڑی کی بلندی پر واقع محل میں ٹھہرے جو قصبے کا خوبصورت نظارہ پیش کرتا ہے۔

اور ایک نے ہمس گپنہ میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق مجوزہ مخطوطے میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے جس کا ذکر ماوتیچ نے کیا تھا۔ تاہم وہ خود کسی ایسی دستاویز کو نہیں دیکھتا ہے۔

پھر ایک امریکی خاتون Henrirtta sands Merric ہنیریتا سینڈس میریک لداخ آتی ہے۔ غالباً جولائی کا مہینہ اور سن ۱۹۳۰ تھا۔

وہ لکھتی ہے :لیہہ میں غریبی کم نظر آتی ہے۔ کوئی بھکاری نہیں۔ میں آزادی سے گھومی، کسی نے میرے ساتھ دست درازی نہیں کی۔

مصنفہ لیہہ میں چھ ہفتے رہی۔ اُن دنوں لیہہ کیسا تھا؟ ہنیریتا رقم طراز ہے: بازار میں دس بجے گھومتے ہوئے میں نے دیکھا لیہہ سو چکا تھا۔ سب لوگ سو چکے تھے کسی گھر میں روشنی نہیں تھی. گھپ اندھیرا تھا۔

آگے وہ لکھتی ہے۔ میں نے پادری سے پوچھا کہ کیا میں اپنا روپیہ Yakdams میں رکھوں؟

"آپ چاہیں تو اسے باہر ڈیوڑھی پر رکھیں۔ یہ لوگ کبھی نہیں چُراتے"، پادری نے جواب دیا۔

ہنیریتا نے اپنی کتاب In the world,s Attic میں لداخی بچوں کی تصویر دی ہے۔ ان کے سر پر ٹوپیاں ہیں۔ پیر ننگے ہیں۔ پاجامے اُٹنگے اور موری پتلی ہے۔ آستین لمبے ہیں اور بے ڈھنگے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے اُن دنوں لداخ میں بڑی غریبی تھی۔

انگریز سیاح مارکو پائیس ۱۹۳۶ء میں لداخ آیا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر رابرٹ، روف بھی تھا۔ مارکو پالیس نے اپنی کتاب Peakes and lamas میں تفصیل سے اس سفر کے احوال لکھے ہیں۔

زوجی لا سے لیہہ آتے ہوئے مچوئی سے آگے منصّف نے مختلف قسموں کے جنگلی پھول دیکھے۔ دراس میں سکول کے بچوں نے انہیں ڈرل دکھایا۔ راستے میں ایک تبّتی عورت ملی جس کا خاوند لداخی تھا۔ اس کے ساتھ بیس کُتے تھے جنہیں وہ انگریز عورتوں کو بیچنے کشمیر لے جارہی تھی۔

مارکو پالیس لکھتا ہے۔ کہ وہ تبتیوں سے جلدی مانوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی محبّت میں اجنبیت محسوس نہیں کرتا ہے۔"

لداخی عورتوں کی آزادی اور اختیارات سے متعلق مارکو پالیسؔ کا مشاہدہ ہے کہ لداخ میں بیوی گھر کی حقیقی حکمران ہے۔ بچوں سے ماں باپ کے نام پوچھیں تو وہ باپ سے پہلے ماں کا نام بتاتے ہیں۔ یہاں وہ برطانوی محقق ڈاکٹر ڈی فلپس کا حوالہ دیتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ لداخ میں خاندانی اُمور میں عورت کا بڑا اثر ورسوخ ہے۔

پالیس رقم طراز ہے۔ لداخی عورت چاہئے بیٹھی ہو یا چل رہی ہو، اون کات رہی ہوتی ہے۔ یوروگنپہ دیکھ کر مارکو پالیس ٹینڈل بسکو کی طرح جذباتی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے پہلی نظر میں یوروگنپہ ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ہے۔

گاؤں کے محدود وسائل سے متعلق وہ رقم طراز ہے۔"راستے میں اگر ایک گاؤں سے متعدد مسافر گزرے تو اشیائے خوردنی کی قلت پڑ جاتی ہے۔"

سفر کے دوران جب وہ علاقہ لائن میں پہنچتا ہے تو مارکو پالیس سوچتا ہے کہ ان گاؤں کے باشندے یقیناً کرۂ ارض پر سب سے چند شادماں لوگوں میں ہوں گے۔ وہ لکھتا ہے۔"یہاں ہر آدمی اپنا خود معمار ہے۔"

لیہہ میں ان کا قیام غلام محمد داروخان کے خوبصورت باغ میں رہتا ہے۔لیہہ بازار میں لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ لہاسہ سے آئے ہیں؟

لیہہ کی جامع مسجد کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے۔"لیہہ کی مسجد محل کے نیچے ہے۔ یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے۔ مسجد کا فن تعمیر لداخی طرز پر ہے۔ بعد میں ہمارا یہ روز کا معمول بن گیا کہ ہم شام کو وہاں چلے جاتے تھے اور مؤذن کی اَذان کا انتظار کرتے تھے۔"

لیہہ سے متعلق پالیس نے اپنا یہ تاثر قلمبند کیا ہے۔"لیہہ اپنی جگہ ایک چھوٹی دنیا ہے۔......... یہ لداخ کا Nerve centre اہم ترین مرکز ہے۔ ہر لحاظ سے یہ ایک راجدھانی لگتا ہے۔......... یہاں کے سرکردہ شہریوں کا دُورافتادہ ملکوں سے رابطہ ہے۔"

لداخ کلچر میں مارکو پالیس نے اپنی انفرادیت پائی۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے:"بادی النظر میں لداخی چائے دانی اور بھوٹان یا تبت کے برتنوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن غور سے دیکھا جائے تو ایک آدمی تبت، بھوٹان اور لداخ کے برتنوں میں فرق کو پہچان سکتا ہے۔"

اسی طرح وہ خطے کی دوسری باتوں میں بھی ایک اَکھڑ پن پاتا ہے۔ جو صرف لداخ سے مخصوص ہے۔

دوسرے سیاحوں کی طرح اس نے بھی لکھا ہے کہ لداخی جھوٹ بولنا نہیں

جانتے۔ یہاں جرائم نہیں ہوتے۔

مصنف نے لداخی گھروں کی تعریف کی ہے۔ خاص کر لکڑی پر مصوری کے کام کو خوبصورت بتایا ہے۔

مارکو پالیس کی کتاب سے چند اور اقتباسات "گرمیوں میں لیہہ میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مسلمان پگڑی اور سُرخ رومی ٹوپی (فیض کیپ) پہنتے ہیں۔ تاہم لباس لداخی ہے۔

اقسقال خان محمد دین نے ہمیں اپنے دفتر میں چائے پر مدعو کیا جہاں قصبہ کے بڑے تاجر موجود تھے۔ ان میں حاجی محمد صدیق اور نونوتلیت شاہ تھے۔ حاجی محمد صدیق کی لہاسہ اور گرتوق سے تجارت تھی۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر پر دعوت دی۔

ہمارے قیام کے دوران ریذیڈنٹ کرنل ایل ای لنگ لیہہ آئے۔ سبھی سرکردہ شہری ان کے سواگت کیلئے سپتک گئے۔ سکول کے بچوں اور ملازموں نے (لیہہ میں) ان کا روایتی طور استقبال کیا۔ کرنل نے ایک دربار منعقد کیا جس میں سرکردہ شہریوں نے شمولیت کی۔

لداخ میں اپنے قیام کے دوران مارکو پالیس اور ڈاکٹر رابرٹ روف نے ہمس فیانگ اور دوسرے کئی گنپے دیکھے۔ منصف کو لداخی بدھ مت، خاص کر مذہبی آرٹ سے بڑی دلچسپی تھی۔

ڈاکٹر رابرٹ روف آدھی صدی کے بعد دوبارہ لداخ آیا۔ ۱۹۸۹ء میں انہوں نے برسٹل (انگلینڈ) میں لداخ سے متعلق منعقدہ ایک کانفرنس میں لداخ تب اور اَب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۳۶ء میں لیہہ آج کے مقابلے میں بہت چھوٹا قصبہ تھا اور شاندار نظارہ پیش کرتا تھا، مورکرافٹ نے ۱۸۲۰ء میں لداخ میں جو دیکھا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ہم نے اس میں بہت کم تبدیلیاں دیکھیں...... زراعت معیشت کا

سب سے بڑا سہارا تھی۔ مقامی دست کاریاں، لکڑی، لوہے کا کام، اُون کتائی اور بنائی عام تھی۔ تقریباً ہر چیز مقامی طور بنتی تھی۔ سڑکیں، گاڑیاں، مشین کا سامان، بجلی، نل کا پانی، ٹیلی فون اور جدید زندگی کی چیزیں نہیں تھی۔

لیہہ میں جوزف گیرگن بڑے عالم تھے۔ فیانگ گپنہ میں لاما قونچگ گیالچن ایک قابل مصوّر تھے۔ حاجی محمد صدیق اور نونو تو یت شاہ سرکردہ تاجر تھے۔

تب لوگوں کی صحت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ بچے صحت مند تھے۔ بوڑھوں میں موتیا بند اور دِل کے امراض دیکھنے میں آئے۔

ہندوستان آزاد ہونے سے دو سال پہلے ۱۹۴۵ء میں جان اے جیکسن لڑاکو ہوابازوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ کرگل آیا۔ جہاں سے وہ مولبیک تک آیا۔ اس نے اپنے سفر کی روئداد زیادہ نہیں لکھی ہے۔

دراس کے سخت جاڑے سے متعلق وہ لکھتا ہے: سردیوں میں لوگ جلے ہوئے اُوپلے کے سامنے کھانا پکاتے ہیں اور پہلے سے سٹاک کی ہوئی خواک استعمال کرتے ہیں۔ اس نے انداز لکھا ہے کہ یہاں (دراس) خاموشی کو بیچ بیچ میں بھیڑیئے کی غراہٹ Mormot کی شیر میں سیٹی اور برفانی چیتے کی کرخت آواز شاید توڑتی ہوگی۔

آزادی سے پہلے لداخ آنے والے آخری سیاح نکول سمتھ اور مورین تھے۔ یہ امریکی تھے اور ہندوستان آزاد ہونے سے ایک روز پہلے لداخ وارد ہوئے۔ کرگل میں لوگوں نے انہیں جب سلام کیا تو اپنا ردِّ عمل انہوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ "(نیویارک) ففتھ ایوینیو میں کسی نے آج تک مجھے سلام نہیں کیا۔"

کرگل میں نیوزی لینڈ کی ایک مشنری کام کرتی تھی جہاں مس ڈریو اور رائے کام کرتے تھے۔ ان کے ہاں سات سے چودہ سال کی عمر کے سولہ شاگرد تھے جو سبھی عیسائی تھے۔

دراس سے آگے مصنّف نے دیکھا کہ ایک بیمار لڑکے کو چار آدمی ایک چارپائی پر

ایک کھردرے کمبل میں لپیٹے علاج کیلئے سرینگر لے جا رہے تھے۔ یہ کئی روز سے سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے مصنّف سے دَوائی مانگی لیکن ان کے پاس کوئی دوائی نہیں تھی۔

نکول سمتھ لکھتا ہے۔ لداخی لڑکیاں اجنبیوں کی طرف دیکھتی ہیں جبکہ کشمیری اور بلتی لڑکیاں اجنبیوں کو نہیں دیکھتی ہیں اور پیٹھ موڑ لیتی ہیں۔

موراوین مشن کے پادری والٹر اسبو نے نکول سمتھ کو بتایا کہ انہوں نے کسی لداخی کو گھوڑے یا کُتے کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسبو نے کہا یہ بدھ مت کی تعلیم کا اثر ہے۔ یہ جُوں تک کو مارنا گناہ سمجھتے ہیں۔

سمتھ رقم طراز ہے آج جس طرح ہوئی جہاز کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ان دنوں لداخی اور دوسرے لوگ سرینگر سے ڈاک ہرکارہ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔

سمتھ نے سنا کہ کچھ سال پہلے لیہہ میں تونگن آئے تھے۔ (یہ کہ غیر قزاق تھے، جو ۱۹۴۱ء میں بھاگ کر لداخ آئے) ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ نومبر میں ان کو سرینگر بھیجا گیا۔ جہاں زوجی لا پہ بہت سارے برف سے مر گئے۔ جو بچ گئے انہیں شمال مغربی صوبہ سرحد میں بسایا گیا۔

لیہہ میں ایک ہندو فوٹو گرافر تھا۔ وہ ایک فوٹو کیلئے چار ڈالر لیتا تھا۔

لداخی راجہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے وہ سال میں دو دفعہ پر جا سبھا کے اجلاس میں شرکت کرنے کیلئے سرینگر جاتے ہیں۔ وہ اس سے جلدی تنگ آگئے تھے۔ وہاں جا کر حکومت کے اِشارے پر ہاتھ اُٹھانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ بیماری کے بہانے وہ کرگل سے لوٹے تھے۔

راجہ لیہہ کے کرزو باغ واپس کرنے کیلئے حکومت کو درخواست دیتے ہیں، غالباً اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔

وہ سال میں کئی دفعہ اپنے ستوق کے محل میں پوجا پاٹ کراتے ہیں اور ان پر تقریباً ان کی ساری آمدنی چلی جاتی ہے۔

سمتھ نے ایک روز دیکھا کہ والٹر اسبو سے ایک لداخی نے تھوڑی دیر بات چیت کی تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اس نے والٹر اسبو سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اسبو بولے۔ اس کو ڈر ہے کہ کہیں دوسرے کی روح اس کی بدن میں داخل ہو کر اس کو نقصان نہ پہنچائے۔

اُن دنوں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات زوروں پر تھے اور لیہہ میں طرح طرح کی افواہیں گرم تھیں۔

نکول سمتھ اُس روز سرینگر سے **جہاز** میں پرواز کرتا ہے جس روز قبائیلوں کا سامنا کرنے کیلئے ہندوستان فوج سرینگر ہوائی اڈہ پر اُترتی ہے۔

آزادی کے بعد لداخ میں غیر ملکی سیاحوں کی آمد پر پابندی لگائی گئی۔ صرف موراوین مشن کے پادری لیہہ میں رہے۔ کچھ مدت بعد غیر ملکی پادریوں کے رہنے پر بھی پابندی عائد ہوئی۔

موراوین مشن کے پادریوں نے لداخ میں اپنی لمبی مدّت کے قیام کے دوران خطے کی تاریخ، تمدّن اور ثقافت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اکثر سیاح چند روز کیلئے لداخ آتے تھے اور لداخی زندگی کا سطحی مطالعہ کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

عالم پادریوں میں اہم نامہ والٹر اسبو ہے۔ وہ ملک کی آزادی سے کچھ عرصہ پہلے لداخ سے واپس چلے گئے۔ وہ بیس سال لیہہ میں رہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے اسبو کو دلچسپ اور انوکھے خطوط آتے تھے۔

جرمن سے ایک آدمی نے اسبو کو ایک موم بتی، ایک چھوٹی سی رسی، ایک مرتبان میں شربت اور چند اسفنج بھیجے تھے۔ اس نے اسبو سے درخواست کی تھی کہ وہ ان چیزوں کو لے کر آدھی رات کے وقت اٹھارہ ہزار فٹ بلند ایک گلیشیر تک جائے۔ اسفنجوں کو رسی سے ایک نادر اور نایاب تتلی نکلے گی۔ اس تتلی کے پر سفید ہوں گے اور کناروں پر سُرخ سُرخ داغ ہوں گے۔ یہ تتلی یورپ میں پچاس ڈالر میں فروخت

ہوگی۔ اس نے مزید لکھا تھا کہ تتلی برف اور یخ میں رہتی ہے جہاں ایک مضبوط انسان بھی سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے گا۔

ایک انگریز نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ لیہہ سے چند میل دور ایک مقام پر جائے اور رسی کی مدد سے ایک چٹان پر چڑھے۔ چٹان پر ایک کھوہ میں کالے رنگ اور سرخ چونچ کے ایک نایاب پرندے نے انڈے دئے ہوں گے۔ اگر انڈے پانچ ہوں تو اُن کو اٹھالیں۔ اگر صرف چار ہوں تو اُن کو اپنی جگہ رہنے دیں کیونکہ یہ اصلی پرندے کے انڈے نہیں ہو سکتے اور انتظار کر کے دیکھیں کہ وہ مادہ پرندہ پانچواں انڈا دیتی ہے یا نہیں۔

ممبئی سے ایک پروفیسر نے ایک خاص قسم کی چند پلیٹیں پارسل سے بھیجی تھیں اور استدعا کی تھی کہ ان کو اٹھارہ ہزار فٹ بلند ایک مقام پر چار ماہ رکھ کر اسے واپس ممبئی بھیج دیں تا کہ وہ ان پلیٹوں پر کائناتی شعاعوں کا اُثر دیکھ سکے۔

ایک امریکی خاتون نے جس کا بھائی معذور تھا، اسبو کو ہمالیائی ریت بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔

Himalayan Frontiers میں ڈورتھیووڈ مین لکھتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی لداخ کو ایک قسم کا Eldorado سمجھتی تھی۔ یہ ایک ایسا تخیلی دیش ہے جہاں بکثرت سونا ملتا ہے یا جہاں دولت آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ تصوّر شاید روس کی توسیع پسند پالیسی کے بعد پیدا ہوا۔

آج سے نصف صدی پہلے عام لداخی مختلف توہمات کے شکار تھے اور ان کے خیالات انوکھے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کبھی اپنا فوٹو نہ لینے دو اِس عمر چھوٹی ہوتی ہے۔

کسی کا سایہ اپنے پر پڑنے دینا بُرا شگون سمجھا جاتا ہے۔

آپس میں بات چیت کرتے ہوئے مُنہ پر ہاتھ رکھے تا کہ دوسروں کی رُوح جسم میں داخل ہو کر نقصان نہ پہنچائے۔

کسی عورت کے چہرے پر مونچھ داڑھی ہوتو اس عورت کو خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

کسی جگہ پاگل ہوتو وہ اس بستی کیلئے نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔

جسم پر کالا داغ خوشی قسمتی اور ترقی کی علامت مانی جاتی تھی

کسی کے جسم سے بساند آئے تو اس پر دیوی دیوتا کا احسان سمجھا جاتا تھا۔

دودھ، گوشت وغیرہ کو بُری نظری سے محفوظ رکھنے کیلئے اسے کسی چیز سے ڈھک لیتے تھے۔

ان دنوں لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فرانکی ایک مرتبہ خلسے میں شادی کی ایک دعوست میں اس لئے شریک نہیں ہوا کہ دلہن بہت چھوٹی تھی، فرانکی کو یہ اعتراض بھی تھا کہ شادی کے بعد باپ کو بڑے مکان سے چھوٹے مکان میں منتقل ہونا پڑتا تھا۔ جہاں کم آسائش تھی۔

خلسے کے لوگ ایک جگہ موجود درختوں کی لکڑی بالکل استعمال نہیں کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے۔ وہاں ایک Spirit ہمزاد نے لبسیرا کیا ہے۔ درخت کو نقصان پہنچانے سے وہ ناراض ہوگا اور متعلقہ آدمی یا خاندان پر بَلا نازل ہوگی۔ فرانکی اور اُس کی بیوی نے لوگوں کے وہم دُور کرنے کیلئے وہاں سے لکڑیاں لاکر استعمال کیں۔

فرانکی نے لومڑی کی مکاری سے متعلق لداخ اور یورپ کی کہانیوں میں یکسانیت پائی۔ اور کیسر کی داستان کو Edda سے جوڑا۔ انہوں نے یورپ اور لداخ کے سرمائی تیوہاروں میں بھی مماثلث پائی۔

ایک انگریز جان بیرے لکھتا ہے لداخی انگریزوں کے نوآبادیاتی مقبوضات سے بخوبی واقف تھے اور اپنے انداز میں اس کی تشریح کرتے تھے۔ موراوین مشن کے پادری اے ڈبلیو ہیڈ لے کے حوالے سے وہ رقم طراز ہے۔ ۱۸۶۲ء میں ہیڈ لے لیہہ کے گاؤں ستوق گئے۔ وہاں دوسرے سوالات کے ساتھ اُن سے یہ پوچھا گیا کہ کیا یہ

سچ مچ صحیح ہے کہ ملکہ انگلستان کبھی نہیں مرے گی۔ وہ ہر صبح ایک نئی طاقت یافتہ جوان کی طرح جاگتی ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ ان کی یہ طاقت اور وسیع قلمرو کی مالک ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ مالکہ دیوی پلدن لہاموکی Incarnation تجسیم ہے۔

آزادی کے بعد چند سیاح لداخ آئے تھے۔ میں نے سیاحوں کی لکھی تین کتابیں دیکھیں۔ انہوں نے لداخ آمد کیلئے غالباً حکومت سے اجازت حاصل کی تھی۔ بلا اجازت آئے ایک گروپ کو کرگل سے واپس کیا گیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں Pearce Gervis نام کا ایک سیاح لداخ وارد ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ "لداخ میں عورتوں کو بڑی آزادی اور اختیارات حاصل ہیں۔"

عام لداخیوں سے متعلق اس نے اپنے تاثرات یوں قلمبند کئے ہیں: "آج یہ اپنی قسمت پر قانع ہیں۔ ایک دن جب یہ نیند سے جاگیں گے اور اس سنگلاخ بنجر زمین غریب دیش میں دولت کی فراوانی ہوگی تو کیا یہ آج سے زیادہ خوش ہوں گے؟ یہ خیال مجھے آیا ہے۔"

اگست ۱۹۵۱ء میں ایک امریکی جج ولیم او ڈوگلس لداخ کی سیاحت پر آیا۔ اس نے اپنے سفرنامہ Beyond the high Himalayas میں لداخ کی مختصر تاریخ، بدھ مت، پولیپیڈری کے تذکرکے علاوہ چند لداخی گیتوں کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔

لداخی کے سودخوروں کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے کہ ان کے احوال سن کر اُن کے بڑے لالچی قرض دہندوں کی بھی جھرجھری آئے گی۔

وہ رقم طراز ہے: میں ٹنٹناتی گھنٹیاں بندھی خچروں کے ساتھ جنوبی پھاٹک سے لیہہ میں داخل ہوا تھا۔ جہاں سے پرتگال کے پادری اذے ویڈ اور ڈی او لیویرا داخل ہوئے تھے۔ خچروں کی گھنٹی کی آواز سن کر ہر ایک دوڑتا ہوا آیا۔ ایک جراب بننے والی عورت، شلغم اور انڈے بیچنے والی عورت .... حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔

اس نے ذیل کے لداخی گیت کا ترجمہ کیا ہے:

میں جب شہر کے پھاٹک پر پہنچا انہوں نے اسے میرے سامنے بند کیا۔

اے لداخ کے گلاب ! میں تجھے سلام کرتا ہوں
میں اپنی زندگی تیری دھرتی پر نچھاور کرتا ہوں
اے لداخ کے گلاب! میں تجھے سلام کرتا ہوں

لداخیوں کے متعلق اُس تاثرات ملاحظہ ہوں۔"لیہہ کے لوگ اُن تفکرات سے نابلد لگتے ہیں جن کا میں ذکر تا ہوں ان کے پاس بہت کم چیزیں ہیں۔وہ زیادہ کی توقع بھی نہیں رکھتے۔وہ اپنی قسمت پر شاداں ہیں۔وہ دوست منش،خوش وخرم،سادہ اور سیدھے لوگ ہیں۔"

اس نے لیہہ کی آبادی چار ہزار نفوس بتائی ہے اور قصبے میں طوائف کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۵۸ء میں تین جوان یورپی عورتیں اینی ، ایُو اور مصنفہ انتونیا منالی سے زنسکار پہنچتی ہیں۔زنسکار کے قدرتی مناظر کی وہ تعریف کرتی ہیں،جہاں کہیں کہیں جنگلی پھول بکثرت اُگتے ہیں۔تاہم سفر کو وہ مشقت خیز اور صبر آزما بتاتی ہیں۔

وہ لکھتی ہیں: زنسکار میں کھانے پینے کی چیزوں کی دستیابی بہت مشکل ہے۔کچھ انڈے ملے، جنہیں ہم نے بڑی احتیاط سے استعمال کیا۔......لوگ دوائیاں مانگتے ہیں۔علاج معالجے کیلئے مریضوں کو آٹھ دن کی مسافت طے کر کے کرگل جانا پڑتا ہے......لوگوں میں غیر ملکوں کو دیکھنے کا تجسس ہے۔ہمارے کیمپ پر بڑی بھیڑ لگتی ہے۔ان کے مطابق لداخ کے دوسرے علاقوں کی طرح زنسکار میں بھی طرح جرائم نہیں ہوتے ہیں یا شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔

۱۹۷۲ء میں لداخ کو دوبارہ سیاحوں کیلئے واگذار کیا گیا اور تین چار برسوں کے اندر ہر سال ہزاروں کی تعداد میں غیر ملکی سیاح لداخ آنے لگے۔ایک مرحلہ پر یہ تعداد بیس ہزار سے تجاوز کرگئی۔ماضی میں سیاح گھوڑے پر یا پیدل،عموماً سرینگر سے

لیہہ آتے تھے۔ کچھ ہماچل پردیش کے راستے پہنچتے تھے۔ سرینگر سے لیہہ پہنچنے میں پندرہ روز لگتے تھے۔ آج ہوائی جہازوں اور گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔

آج کل لداخ آنے والی غیر ملکی سیاحوں میں ریسرچ سکالر، عالم، ادیب تاریخ نویس وغیرہ بھی ہوتے ہیں جنہوں نے ماضی کے مقابلے میں لداخ پر ٹھوس تحقیقی کام کیا ہے اور لداخ کی تاریخ تمدّن اور ثقافت کو دنیا کے سامنے بہتر طور پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان موضوعات پر بھی کام کیا ہے جن پر ماضی میں لداخ آنے والے سیاحوں کی نظر نہیں پڑی تھی۔ کئی محققوں اور سماجی کارکنوں نے لداخ کے موجودہ مسائل کی نشان دہی کی ہے اور ان کے حل پیش کئے ہیں۔ کئی خطے کی تعمیر و ترقی میں عملی طور پر شریک کار رہوئے ہیں۔

اس دوران متعدد غیر ملکی سیاحوں، صحافیوں اور مبصّروں نے لداخ کی ماحولیات، سیاسیات، لوگوں کے معاشی حالات، ثقافت وغیرہ پر اخبارات اور جرائد میں مضامین لکھے ہیں۔ ایک مقالے میں اِن کا احاطہ مشکل ہے۔

۱۹۷۶ء میں انگلینڈ کے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی کے تین ریسرچ سکالروں نے لداخ کے پرندوں کا سروے کیا اور ۶۲۰ قسموں کے پرندے پائے۔ ان میں ۱۸۱ ایسے پرندوں کا پتہ لگایا گیا جو پہلی مرتبہ لداخ میں ریکارڈ کئے گئے۔ ان میں کم سے کم دو ایسے پرندے ہیں جو ہندوستان میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک نامہ نگار لوئیس برنی نے لیہہ کے دورے کے بعد ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء میں کو ایک مضمون میں لکھا ہے: لداخ تبّتی بدھ مت کے سکالروں کیلئے تجربہ گاہ بنا ہے۔ گاؤں اور لیہہ میں گذرتے ہوئے — مجھے اکثر محسوس ہوا کہ میں پچھلی صدی میں پہنچا ہوں۔ لوگ کا لباس جداگانہ ہے اور ظریفانہ نظر آتا ہے۔ گرم ترین موسم میں بھی یہ اُونی اور مخمل کے لباس پہنتے ہیں۔........عورتیں بکری کی کھال اور سرخ کنٹوپ پہنتی ہیں جن پر زری کا کام ہے۔ زیوات بہت استعمال کرتی ہیں۔ گاہکوں کے انتظار میں عورتیں لیہہ

لداخی عورتیں .... بازار میں اون کاتتی اور گپ شپ کرتی ہوئی سبزیاں بیچتی ہیں ہندوستان میں اپنی مسلم اور ہندو بہنوں کے مقابلے میں اجنبیوں سے زیادہ گھلتی ملتی ہیں۔ جُولے اِن کی زبان پر ہوتا ہے۔ جو سلام، ہیلو، الوداع اور اظہارِ تشکّر کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

لوئیس کے مطابق یہاں فطرت اور انسان میں بقائے باہم کا اصول کار فرما ہے۔

انہی دنوں لداخ کی سیاحت پر آنے والا ایک یورپی انڈر یو ہاروے کا سفر نامہ A Journey to Ladakh میں نے پڑھا۔ کتاب میں سرینگر سے لیہہ بس میں سفر کرتے ہوئے سیاحوں کے وہ بیانات دلچسپ لگے جب وہ راستے میں مختلف چٹانوں میں کئی ہستیوں کا حلیہ ہیولا اور شکل و شباہت دیکھتے ہیں۔ مصنّف لکھتا ہے۔ "بس کی کھڑکی سے دیکھتی ہوئی ایک جرمن خاتون بولی۔ وہ دیکھو کارڈینل آف مُونیچ Munich لگتا ہے۔ لامایورو پہنچنے سے پہلے درّہ کے اوپر وہ بیتھوون کو دیکھتی ہے۔ ہیبر نے بھی ایسی شبیہیں دیکھی تھیں۔ خود اینڈریو ہاروے کو جج کوک برن کی اصلی مورت اور کارڈینل وُولزے کا خاکہ نظر آتا ہے"۔

نکی گریسٹ ماضی کے لداخ کی سماجی تفریق کا ایک رُخ پیش کرتی ہے۔ لباس لداخ میں سماجی مرتبہ کی علامت تھی۔ سکوتق یا روساء رنگے ہوئے لباس پہنتے جبکہ عام لوگ سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ جب عام لوگ رنگے ہوئے سُرخ کپڑے پہننے لگے، تو روساء بیرونی ممالک سے درآمد کئے ہوئے قیمتی کپڑے استعمال کرنے لگے۔ ان میں چین کے کمخواب اور سنٹرل ایشیا کی مخمل شامل تھی۔ کمخواب اور زربفت کے کپڑے صرف روسائ پہن سکتے تھے۔ اِسی طرح سونے کے زیورات صرف روساء کی بیویاں استعمال کرسکتی تھیں۔ وسطِ ایشیا سے درآمد شدہ مخمل اور جوتے پر بھی روساء کی اجارہ داری تھی۔ عام لوگوں کیلئے ان کے استعمال پر پابندی تھی۔

ہیلینا نورنج ہوج کی کتاب Anacient Futurl learning From Ladakh یہ بتاتی ہے کہ لداخ کا ماضی اس کے مسرّت ناک مستقبل کا ضامن ہے۔ لداخ کے باہر لوگوں کیلئے بھی اس میں مفید سبق ہے۔ ہیلینا ۱۹۷۴ء میں لیہہ آئی، جب لداخ کو سیاحوں کیلئے کھولا گیا۔ اس نے لداخ اکالوجیکل ڈیولپمنٹ گروپ اور وومین الائینس women Alliance کے نام سے یکے بعد دیگرے لیہہ میں دو غیر سرکاری تنظیمیں قائم کیں۔ یہ تنظیمیں خطے میں بڑی کامیاب ہیں اور ان سے ہزاروں لوگ وابستہ ہیں۔ ہیلینا کے تاثرات اور نجی خیالات قابلِ غور ہیں۔ وہ مذکورہ کتاب میں لکھتی ہے: جب میں پہلے پہل لداخ پہنچی تو لداخ مغرب سے متاثر نہیں ہوا تھا لیکن بڑی تیزی تغیر و تبدّل آیا۔ اس سال ۱۹۹۱ء میں، میں نے لداخ اور سپین کے دور افتادہ پہاڑوں میں ایک جیسی کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ دونوں مقامات پر خوبصورت میلی آنکھوں والی Barbie گڑیائیں اور مشین گن اُٹھائے Rambos فروخت ہوتے ہیں۔

بقولِ مصنفہ لداخی صدیوں سے جمع کردہ اپنا علم ختم کر رہے ہیں۔ وہ رقم طراز ہے۔ "لداخ میں ایک ایسا سماج تھا جہاں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایسا سماج جس میں عملی طور جرم نہیں ہوتا تھا۔ لوگ مضبوط اور صحت مند تھے۔ کثافت نہیں تھی۔ وہ اِس صورتِ حال کو مغرب کی اَندھا دُھند پیروی قرار دیتی ہے۔ دنیا میں دیہی علاقوں میں لاکھوں نوجوانوں کو جدید مغربی کلچر اپنی ثقافت سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس میں تعجب کی بات نہیں ہے۔ وہ اُوپر اُوپر جدید دنیا کے مادّی رخ کو دیکھ سکتے ہیں جس کیلئے مغربی کلچر کو فوقیت حاصل ہے۔ اچانک مغربی اثر کی وجہ سے خاص کر لداخی نوجوانوں میں احساس کمتری آیا ہے۔ وہ اپنے کلچر کو کُلی طور مسترد کرتے ہیں اور اس کی جگہ نئے کلچر کو سینے سے لگاتے ہیں۔ وہ جدیدیت کی علامتوں جیسے دھوپ چشمہ، واک مین اور بلیو جینز کے پیچھے دوڑتے ہیں.............اس لئے نہیں کہ جینز زیادہ دلکش یا آرام دہ

ہیں بلکہ یہ جدید زندگی کی علامتیں ہیں۔

وہ گاؤں کے ایک نوجوان داوا کی مثال دیتا ہے۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ تب وہ پندرہ سال کا تھا۔ سیاح آئے تو وہ گائیڈ بنا۔ پھر اپنی ٹورسٹ ایجنسی کھولی۔ ایک روز مصنفہ نے داوا کو لیہہ بازار میں دیکھا۔ دھوپ چشمہ، ٹی شرٹ، جس پر اُمریکی روک بینڈ کا اشتہار تھا، تنگ جینز اور باسکٹ بال جوتا پہنا تھا۔

میں نے مشکل سے پہنچانا؟ــــ میں نے لداخی زبان میں داوا سے کہا

کیا تھوڑا سا بدلا ہوں؟ ــــ اس نے فخر سے انگریزی میں جواب دیا

ہم ریستوران میں گئے داوا انگریزی میں بات چیت کرنے کیلئے مُصر تھا۔ داوا ہیلنا کو فخر سے بتاتا ہے کہ وہ خوب روپیہ کما رہا ہے۔ پھر وہ اپنی گرل فرینڈ کا ذکر ہوتا ہے جو ہالینڈ کی رہنے والی ہے۔

ہیلنا لکھتی ہے '' آج لداخی کسانوں کو نیپالی یا ہندوستانی قلیوں پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ آپسی تعاون کا زمانہ ختم ہوا ہے۔ ایک کسان کو اس بدلتی معیشت میں کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اُجرت زیادہ بڑھی ہے۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان تفاوت بڑھی ہے۔ اپنوں میں مرّوت ختم ہو گئی ہے۔

آج سکولوں میں ان لوگوں کی کتابیں سیکھنی پڑتی ہیں جنہوں نے لداخی میں کبھی قدم نہیں رکھا ہے۔ لداخ کا بالکل اتہ پتہ نہیں ہے۔

جب میں پہلی مرتبہ لیہہ آئی۔ یہ ایک پیارا قصبہ تھا۔ صرف دو بازاروں میں تار کول لگے تھے اور شاذونادر ہی کوئی گاڑی نظر آتی تھی۔ صرف گائیوں کی بھیڑ بھاڑ سے آمدرفت میں رکاوٹ آتی تھی۔ فضا بالکل صاف ستھری تھی۔ اتنی صاف ستھری تھی کہ وادی سے بہت دُور بیس میل یا اِس سے زیادہ فاصلے پر واقع برفانی چوٹیاں اتنی پاس نظر آتی تھیں کہ گویا انہیں چھولیں۔ قصبے کے مرکز سے ہر طرف پانچ منٹ چلنے کے بعد بڑے بڑے فارم، مکانوں کے ساتھ جوَ کے کھیت ادھر اُدھر بکھرے نظر آتے تھے۔

لیہہ کے ایک گاؤں کا گمان ہوتا تھا۔ ہر ایک ایک دوسرے کو جانتا تھا اور سلام کلام کرتا تھا۔ پچھلے سولہ سالوں میں میں نے اس گاؤں کو ایک پھیلتا ہوا شہر بنتا دیکھا ہے۔ بے روح کال کوٹھڑیوں والی ہاؤسنگ کالونیوں نے سرسبز کھیتوں کو ہڑپ کیا ہے۔

صدیوں تک لیہہ ایک پائیدار معیشت کا ضامن تھا۔ شہری اور دیہی معیشت میں فعال توازن تھا۔

نئی تہذیب کی بیماریاں جن سے لوگ روایتی طور تقریباً انجان تھے، اب عام ہوگئی ہیں۔ ان میں کینسر، ذیابطیس اور فالج شامل ہیں۔"

مصنفہ کے مطابق ذرائع ابلاغ اور سیاحت ایک فرد کیلئے نئی شبیہہ پیش کر رہی ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانا، کار رکھنا، واشنگ مشین استعمال کرنا، جدید کچن اور باتھ روم سماجی مرتبہ کی علامت ہیں۔ .... صرفیت Consumerism مرکزی کردار ادا.... کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر دل ٹوٹتا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ چیزیں خریدنے کیلئے اُن کی تعریف کی جائے، عزت کی جائے اور آخر میں اس سے محبت کی جائے۔

حالیہ سالوں میں روایتی بھائی چارہ کو جوزک پہنچی ہے اِس سے متعلق وہ لکھتی ہیں: میں نے لوگوں کو بہت سارے معاملات میں تقسیم ہوتے دیکھا ہے۔ بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت، امیر اور غریب اور بودھ اور مسلم میں خلیج پیدا ہو رہی ہے۔ لیہہ کے ماڈرن باشندے اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں دہلی یا کلکتہ کا باشندہ جیسا لگتے ہیں............ پہلے انفرادی طور ناچاقی کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ (اجتماعی نہیں) جب میں پہلے پہل لداخ پہنچی تو بودھوں اور مسلمانوں میں باہمی احترام اور اشتراک عمل دیکھ کر بڑی متاثر ہوئی۔ میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں فرقہ وارانہ تناؤ دیکھا۔ جب میں نے اپنے لداخی دوستوں سے سنا کہ وہ انسانوں کو بودھ اور مسلم کے خانوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔"

ماضی میں لداخ کے معاشی حالات پر یوں تبصرہ کیا ہے۔" پہلے لداخ خود کفیل

تھا، گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران لداخی معیشت نے لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ روائتیں طور لداخیوں نے اپنے وسائل ذہانت اور مہارت سے استعمال کئے ہیں اور ہم آرام اور سلامتی سے رہنا سیکھا ہے۔ پہلے جو کچھ ان کے پاس تھا وہ اس پر مطمئن تھے لیکن آج جتنا زیادہ ان کے پاس ہے وہ اس پر قانع نہیں۔

ہیلنا کا خیال ہے کہ لداخیوں میں اصلاح لانے کیلئے مغربی پیمانہ استعمال کرنا غلط ہے اور لکھتی ہے"لداخ شاید جو سب سے اہم سبق دے سکتا ہے۔ وہ خوش رہنا ہے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے، جو میں نے دیر سے سیکھا .... جن لداخیوں نے مغرب کا سفر کیا ہے۔ وہ وہاں بزرگوں کے تئیں بے اعتنائی کے بھیانک واقعات سناتے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگ اکیلے رہتے ہیں۔ کسی سے بات کرنا اس کے نصیب میں نہیں۔ دادی امائیں اپنے پوتے پوتیوں سے چند گھڑیوں کی ملاقات کیلئے مہینوں اُن کی راہ دیکھتی ہیں اور پھر بقولِ گیلونگ پلدن (ایک لداخی) گالوں پر ایک بوسہ پاتی ہیں۔

بقولِ ہیلنا موجودہ کلچر نے ماحولیاتی مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اگر اس کا سدّ باب نہ کیا گیا تو نا قابل تلافی نقصان ہوگا۔

ایک اور مضمون میں وہ رقم طراز ہے"آج کل لیہہ کے لوگ اپنے لئے خود کچھ بھی پیدا نہیں کرتے .... لداخ کا بڑا مفاد مغربی طرز کے Urbanisation شہری ترقیات کے خاتمہ میں ہے۔.......... ابھی بھی لوگوں کی اکثریت اپنی روحانی، ثقافی اور اقتصادی طاقت اپنی جائے سکونت سے حاصل کرتے ہیں۔ مغربی صنعتی کلچر آنے سے پہلے لوگ اپنے گیت گاتے، اپنی زبان بولتے اور اپنی خوراک کھاتے تھے"۔ ہیلنا نوربخ کے تبصرے قدرے طویل ہوئے ہیں لیکن یہ قابلِ غور ہیں۔ تاہم کئی نکتوں پر لداخی تاریخ دان اور دانشور ہیلنا سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہیلنا نے لداخ کے ماضی کو RosyPicture کے رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔ لداخی ہر معاملہ میں خود کفیل نہیں تھا۔ بہت سارے لداخی فاقہ کشی کرتے تھے۔

ہیلنا پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کثافت اور ماحول کی آلودگی کے نام پر وہ جدید ترقیات کی مخالف ہے۔

انگلینڈ کی ایک اور خاتون جینت رضوی نے Native genius مقامی صلاحیت کے عنوان سے لکھا ہے کہ لداخ کے لوگوں کا کلچر تبتّی اور غیر تبتّی عناصر کا امتزاج ہے۔ لداخی بودھوں پر تبت کے بودھ دھرم کا گہرا اثر ہے۔ مذہبی آرٹ اس لحاظ سے ایک زندہ روایت ہے کہ یہ آج بھی قائم ہے۔ لکڑی تراشی اور دھات کی برتن سازی کے ہنر کے سوا لداخ میں کسی اور فنی دستکاری کی روایت کو فروغ نہیں ملا۔ لکڑی کا کام فن تعمیر کیلئے ضروری ہے۔......... لکڑی کے ستونوں، کڑیوں اور محرابوں پر آرائشی نقش ونگار بنے ہوتے ہیں۔

دھات کا کام بھی بہت ضروری ہے۔ ہر گاؤں میں لوہار ہیں۔ سُنار لداخی عورتوں کیلئے زیور بناتے ہیں۔

تبّتی بدھ مت کے علاوہ لداخ پر خاص طور پر اسلام کا اثر پڑا اور کچھ حد تک مشترکہ کلچرل خصوصیات نے نشو ونما پائی............ مکانوں اور گنپوں کی عمارات تبت جیسی ہیں۔ فنِ تعمیر پر دونوں خطوں کی آب وہوا اثر انداز ہوئی ہے۔ تاہم لداخی ایک مضبوط ثقافتی پہنچان کے وارث ہیں تبت سے بہت کم لیا ہے۔

لداخ میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے۔ جینت رضوی نے لکھا ہے: لداخ میں دوسری تبدیلیاں آچکی بھی ہیں اور اَب بھی آرہی ہیں۔ کچھ تبدیلیوں کا سبّب لداخ اور بیرونی دنیا سے نئے رابطے ہیں!'

مصنفہ لکھتی ہے: ترقیات، مقامی وسائل، مقامی علم اور مقامی تصورات کی اساس پر ہونی چاہئیں............ لداخیوں کی روائیتی زندگی اور روّیہ میں سب سے زیادہ تغیر وتبدّل بلاشبہ سیاحوں نے لائے ہیں............ کونسی تبدیلیاں قرینِ مصلحت ہیں اور کونسی نہیں، ان پر لداخیوں اور لداخ پر نظر رکھنے والوں میں گرما گرم

بحث چل رہی ہے۔

جینت نے لداخ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے اور لداخ پہاڑی خود مختار ترقیاتی کونسل کے ممبران سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ صدیوں پرانی جمع شدہ دانائی، ماضی کی روایات اور جدید تقاضوں میں ایک توازن برقرار رکھیں گے۔

جینت رضوی رقم طراز ہے: تبت پر چین کے قابض ہونے کے بعد لداخ بہت ساری قدروں سے محروم ہوگیا ہے۔ آج بہت سارے لداخی پہلے سے زیادہ خوشحال ہیں اور دنیاوی طور وہ اپنے آباؤاجداد سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جینت کی لداخ کی تاریخ، تجارت اور کلچر پر گہری نظر ہے۔اس ضمن میں ان کی دو کتابیں بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔

لداخ کی تاریخ اور ثقافت پر جان بیرے کی گہری نظر ہے۔انہوں نے ان موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ وہ تاریخ لداخ اور ہندوستانی قومیت کے عنوان پر ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

اگرچہ لداخ نے اپنی کلچرل روایت کو فروغ دیا ہے جو تبت اور ہمسایہ علاقوں سے مختلف ہے لیکن لداخی قومی پہچان کا مشترکہ احساس نہیں پایا جاتا۔لداخی کسان اپنے گاؤں، اپنی گھاٹی اور شاید اپنے گمپے سے منسلک ہوں، پورے خطہ سے مجموعی طور منسلک نہیں تھے۔اسی طرح بودھ لاما اور مسلم تاجر میں لداخی شناخت کا فقدان تھا۔یہ اس لئے انہیں کہ وہ حد سے زیادہ متعصب تھے..............لاما اپنے تبتی لاموں سے مساوی طور وابستہ تھے۔سرینگر، کاشغر اور لہاسہ میں مسلم تاجروں کے رشتہ دار تھے اور ان میں آپسی تجارت تھی۔

حالیہ برسوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی روشنی میں وہ لکھتا ہے ماضی کے فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد مہندم ہوگئی ہے اور ایک نئی شناخت کی بڑی ضرورت ہے جس میں

دوسرے فرقوں کیلئے تحفظ شامل ہو۔ یہ تب تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک بودھ، مسلمان اور چھوٹی اقلیت عیسائیوں میں مشترکہ طور تاریخی بصیرت نہ ہو۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ دانائی اور لداخ کی تمام مذہبی روایات کا پاس ہو۔

ایک اور مغربی دانشور پروفیسر جان ایچ کروک کے مطابق فوج کی موجودگی اور روپیہ بنانے والی سیاحت سے لداخ کی روایتی قدروں کو خطرہ ہے۔سیاحوں نے لداخیوں میں احساس کمتری پیدا کیا ہے۔کروک نے تعلیم پر زور دیا ہے اور سکولوں میں مادری زبان میں مقامی تاریخ ،فلسفہ وغیرہ پڑھانے کی تجویز کی ہے۔تاہم جان بیرے کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد سماجی انقلاب فوج ،مرکزی حکومت اور ریاستی سرکار کے ترقیاتی منصوبوں، غیر سرکاری تنظیموں کی اضافی کاوشوں اور خطے کو سیاحت کیلئے واگذار کرنے کی رہین منّت ہے۔

ڈنمارک کے ایک ریسرچ سکالر کرسٹوفر نے اپنے تھیسس میں تاریخی اور سیاسی تناظر میں بودھ مُسلم منافرت اور بودھوں کی فرقہ وارانہ نمائندگی کا جائزہ لیا ہے۔وہ لکھتا ہے بودھوں کی پہچان آزادی سے پہلے ہوئی تھی جب تیس کی دہائی میں ینگ مین بدھسٹ ایسوسی ایشن اور کشمیر راج بودھی مہاسبھا نے مہاراجہ کو بودھوں کی پسماندگی اور غریبی سے متعلق یادداشتیں پیش کی تھیں۔

وہ رقم طراز ہے: ۱۹۳۰ء کی دہائی سے بودھوں کو فعال بنانے کیلئے تحرک چلی۔ ۱۹۸۹ء میں ایجی ٹیشن نے تشدد کی راہ اختیار کی اور پہلی دفعہ بودھوں اور مسلمانوں میں خلیج پیدا ہوئی۔

نکولا گریسٹ نے کرگل کی وادی سورو پر اپنا تھیسس قلم بند کیا ہے جو مسلم آبادی والے اس علاقے کی سیاست سماجی زندگی ناچاقی اور نئی صورت حال میں بچوں کی تعلیم کی طرف دلچسپی پر روشنی ڈالتا ہے۔لداخی مسلمانوں سے متعلق بودھوں کے مقابلے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔اسی طرح آسٹریا کے ڈاکٹر گیر ہارڈ ایمر نے لیہہ کے

مسلمانوں پر اپنا تھیسس قلم بند کیا ہے اور پہلی دفعہ قارئین کو موضوع سے متعلق نئی معلومات فراہم کی ہیں۔

۱۹۷۴ء کے بعد لداخ پر بہت کام ہوا ہے۔ جان کروک اور ہنری اور سماسٹن نے زنسکار کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی ہے۔ نیل ہاورڈ نے وادی سندھ اور زنسکار کے قلعوں کے کھنڈرات پر کام کیا ہے۔ پیٹرک کپلا نین ۱۹۹۵ء ایسا بلیسے ریابوف ۱۹۹۷ء صوفی ڈے (۱۹۹۰) اور ایمیلی شینک ۱۹۹۳ء نے لداخ کے لہا، لہامو (کاہن) Oracles پر تحقیقی کام کیا ہے۔ مارٹن اور کرسٹوفر نے آزادی سے پہلے اور بعد کی لداخی سیاسیات پر اپنے تحقیقی تھیسس چھپائے ہیں۔ جان بیرے نے لداخ میں موراوین مشن کی تاریخ پیش کی ہے۔ پیٹک اور رابرٹ وٹالی نے لداخ کی تاریخ میں نئی اور اہم معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ مارک ٹریوین نے لداخی موسیقی اور روجر گوپٹر نے لداخی آرٹ پر روشنی ڈالی ہے۔ پاسکل ڈولفس نے لداخی مسلمانوں اور لداخی دیہات پر تحقیق کی ہے اور مضامین قلمبند کئے ہیں۔

فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، چینی، جاپانی اور کئی زبانوں میں لداخ پر گائیڈ بک لکھی گئی ہیں۔

ایک بین الاقوامی تنظیم انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹڈیز کے اہتمام سے لداخ سے متعلق اب تک دس کانفرنسیں منعقد کی جا چکی ہیں۔ ان میں آٹھ کانفرنسیں یورپی ممالک انگلینڈ، فرانس، جرمنی اور ڈنمارک میں منعقد ہوئیں۔ کانفرنسوں میں سکالروں کے پیش کردہ مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

المختصر، مغرب کے محققوں، عالموں اور سیاحوں کی بدولت آج لداخ دنیا کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔

☆☆☆

کتابیات

☆The Adventures of a Lady	Mrs. Harvery
☆Kashmir in sun light and shade	Tynder Biscoe
☆The Pamirs	Earl of Dunmore
☆Kashmir and Kashghar	H.W.Bellew
☆Bullet and Shot in Indian Forest	C.E.M Russel
☆The Rifle in Cashmere	Arthur Brinakman
☆The Tourists and Sportman's Guide	A.E. Word
☆Shooting in the Himalayas	Col.Fred Marrcham
☆A Tourism to Himalayas and Beyond	Lt.Col. Reginald Ramlein
☆Travels Ladakeh, Tartory & Kashmir	LT.col. Torrens
☆Ladakh	Alexander Cunningham
☆Gazetteer of Kashmir & Ladakh	Compiled by Q.M.G
☆More Then Mountains	John A. Jackson
☆Kashmir Papers-British intervention in Kashmir	Papers by 3 writers
☆The Road to Lama land	M.L.A Compertz
☆Sports in the High lands of Kashmir	H.Z.Darrah
☆The Alode of Snow	Andrew wilson
☆Where three empires Meet	E.F.Knight
☆ Diary of a pedestrian Kashmir & Tibet	Knight
☆The western Himalayas & Kashmir	Andrew leigth Adams
☆Struggle for the Himalayas	S.P.Verma
☆Recent research on Ladakh	Prince peter/Prof J.Crook

☆A summer in High Asia	F.E.S.Adair
☆ Famous western Explorers to Ladakh	Prem singh Jina
☆The Italian Expedition to the Himalaya, Karakoram & Eastern Turkistan;	Fillipe Defillipe
East of the sun and west of the Moon	The-adore. Roosevelt karmit Roorevelt
☆A Summer Ride Through western Tibet	Jane E Durcan
☆Misc. Information	Archives Records Leh
☆Himalayan Frontiers	Dorothy woodman
☆Beyond the High Hemalayas	Wiliam O.Doglus
☆In the world's Attic	Henrietta Sands Merrick
☆The Trekkers Guide to the Himalaya and karakoram	High Swift
☆My Journey to Lhasa	Alexander David Neel
☆The Flora of Ladakh: western Tibet	R.R Stewart
*.Magic Ladakh	M.L.A Compertz (Ganpat)
☆Our visit to Hindustan, Kashmir & Ladakh	J.C .Murray Aynsley
☆Himalayan Letters of Gupsy Devy and Lady Ba	Gupry Devy & Lady ba..
☆A Jurney to Ladakh	Andrew Harvey
☆Western Himalaya and Tibet	Thomas Thomson
☆Recent Research(Ladakh) University of pau	Different writers
☆Thirty Years in Kashmir	Arthus Neve
☆This is Kashmir	Pearce Gervis
☆Among the Tiletans	Isbella L. Bishop
☆Kashmir	Younghusband
☆Golden Doorway to Tibet	Nicol Smith

☆Moved on From Kashaghar to Kashmir	P.S Nazaroff
☆Trans Himalaya.	Sven Hedin
☆Tales of Tibet and lesser Tibet	Lilian A Stars
☆Realm of the Gods-A Tale of Travel	Captain C.M.Enriqu
☆Roads of Ladakh	Saxina
☆Joy of a journy across Tibet	Hamilton Bower
☆Four years in Tibet	Ahmad Shah
☆Trans Himalaya unveiled	David Frases
☆In the ice world of Himalaya	F.B.Workman and W.H.workman
☆The Travels of Filip Yefremov	Yefremov
☆Ladakh Expedition	South Ampton
☆A Ride to Leh	Mrs. Ashlirooke Crump
☆Mountain Magic	Eve orme
☆Imperial Gazetteer of India (J&K)	Sir walter Lawrence
☆Peaks and lamas	Marco pallis
☆The lost year of Jesus	E.C. Prophet
☆Ancient Future	Helena Norberg-Hedge
☆Our communalised future	Kristoffer
☆Travels in the Mughal Empire	F.Bernier
☆ Ladakh Recent Research, No:2	University of Pau
☆A Trip to Kashmir and Ladakh	Cowley lamfart
☆The Tourist Guide to Kashmir Ladakh and Skardu etc	Arthur Neve
☆The History of western Tibet	A. H.Francky
☆Yak Shootin in Tibet	Edgar phelps
☆Travels in ladakh,Skardo	G.T:Vigne
☆Cosma de Kross	Hirendranath Mukerjee
☆A Journ ey to India	Georgian Nohleman

☆Travels in Himalayan Provinces — W.Moor-Craft
☆Ladakh-cross road of high Asia — Jan et Rizvi
☆The folk songs of Ladakh — Rev-Hamlon
☆A Summer in the Himalayas — W. wilson
☆Between Baltistan and Ladakh — G. Diainelly
☆Into Little Tibet — Helen Mary
☆No Purdah in padam — A. Deacock`
☆A.H. Francky (article) — John Bray
☆Development and change in Ladakh (article) — Helena Norberg Hadge.
☆Schools in Leh (article) — A.H. Francky
☆Independence is not enough(Article) — Martijn and Kristoffer
☆Ladakh-vast Land of spectacle (Article) — L. Berney
☆ Ladakhi History and Indian Nation-hood (Article) — John Bray
☆ The Complexity of polyandry (Article) — Kristoffer

عبدالغنی شیخ — لداخ .... ! (مضمون)
عبدالغنی شیخ — نامور مبہم جو آرغون (")
عبدالغنی شیخ — بودھ مسلم اتحاد
عبدالغنی شیخ — لداخ کی تجارتی افادیت
عبدالغنی شیخ — لیہہ کے محل
عبدالغنی شیخ — ڈاکٹر اے ایچ فرانکی
عبدالغنی شیخ — لداخ میں عیسائی مشنری کی سماجی اور علمی خدمات

☆High Altitude Adaptation — Physiology and culture in the Andes and the Tibetan Plateau By Juith Anne Sterms

☆☆☆